

# برہان

جلد ۱	ماہ جمادی الاخر ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۲ء	شمارہ ۱
-------	--	---------

۱۔ نظرات مقالات	سعید احمد اکبر آبادی	۲
۲۔ ادبی مصادر میں آثار عمرین ایک تجویز مع مثال	جناب ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی صاحب عثمانیہ یونیورسٹی - حیدر آباد	۶
۳۔ اسلامی حدود کی حکمت	مولانا حبیب ریحان صاحب ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ البیضاء لیبیا	۳۳
۴۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	سعید احمد اکبر آبادی	۵۴
۵۔ ادبیات و تبصرے: ادبیات : غزل غزل	نضابین فیضی نسیم شاہ جہانپوری	۶۶ ۶۷
تبصرے	س ع	۶۸



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## نظرات

اللہ تعالیٰ غفرتی رحمت کرے بھائی مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کو! بڑے پتہ کی اور کھری بات کہتے تھے، ایک مرتبہ بریلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کی قومیت ایک ہے اور اس لئے حقوق شہریت بھی دونوں کے برابر ہیں، لیکن میں تو اس بات کو اس وقت تسلیم کروں گا جب کہ ایک مسلمان بھرے بازار میں ایک ہندو کو زد و کوب کرے اور اس پر فرقہ وارانہ فساد نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا دستور صحیح معنی میں جمہوری اور سیکولر ہے، وہ مذہب کی بنیاد پر دو شخصوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں برتتا۔ لیکن کاغذی یقین دہانی کوئی چیز نہیں ہے، اصل اعتبار عملی حقائق اور روز پیش آئے واقعات کا ہوتا ہے، جہاں تک ان حقائق اور واقعات کا تعلق ہے وہ دستور کی اس دفعہ کی تکذیب کرتے ہیں، چنانچہ ملک کے آزاد ہوئے ایک چوتھائی صدی بیت چکی ہے، لیکن اکثریت کے ذہن اور اس کے مزاج کا عالم اب تک یہ ہے کہ ملک میں روزانہ لڑکیوں کو چھیڑنے (Eve teasing) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ان کا نوٹس بھی نہیں لیتا، لیکن کسی ایک مسلمان لڑکے نے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ یہ بدتمیزی کی نہیں کہ فساد ہو گیا۔ بڑی سے بڑی قانون شکنی یہاں تک کہ سڑکوں کو قتل کرنے اور ان کو زندہ جلادینے کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں لیکن نہ کسی کے گھر کو آگ لگتی ہے اور نہ کسی کی دکان لوٹی جاتی ہے، اس کے برخلاف گاؤں کشی کی غلط سلط افواہ پر بھی سیکڑوں مسلمان گھر سے بے گھر اور ان کے کاروبار برباد ہو جاتے اور وہ نان شبینہ کے محتاج بنادیتے



جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کے بعض اقدامات کے خلاف سخت سے سخت مظاہرے ہوتے ہیں لیکن کبھی قتل و غارت گری اور آتش زنی کا ہنگامہ بپا نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر مسلمان کبھی کوئی پرامن مظاہرہ بھی کرتے ہیں تو ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ گزشتہ سال فیروز آباد اور بنارس میں ہوا۔ پھر یونیورسٹیوں میں بھوک ہڑتال، احتجاجی مظاہرے، گھیراؤ، بلکہ توڑ پھوڑ، بسوں کو آگ لگا دینا وغیرہ اب روزمرہ کے واقعات بن گئے ہیں، لیکن حکومت نہ ان یونیورسٹیوں کی انکڑ کٹو اور کورٹ کو معطل کرتی ہے، نہ یونیورسٹیوں کے قواعد و ضوابط (Statutes) کو بدلتی ہے، نہ کوئی آرڈیننس نافذ کرتی ہے اور نہ انتظامیہ میں کوئی ہنگامی صورت پیدا کرتی ہے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی میں کوئی اسی قسم کا ناگوار واقعہ رونما ہو جاتا ہے تو حکومت کی پوری مشنری حرکت میں آ جاتی ہے اور یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ کو یکسر تبدیل کر دیا جاتا ہے، غرض کہ مسلمانوں کی نسبت جو ذہن اور مزاج اکثریت کا ہے اس کا عکس ہمال و کارکنان حکومت کے رویہ میں بھی نظر آتا ہے، اور یہ ایک ایسی صاف اور واضح حقیقت ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا !!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تریسی ایکٹ ۱۹۲۷ء جب پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا تو اس سلسلہ میں وزیر تعلیم نے پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر بھی متعدد مرتبہ کہا کہ انھیں خطوط پر دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی تریسی ایکٹ بنے گا لیکن ہوا یہ کہ چونکہ دہلی اور بنارس یونیورسٹیوں کے طلباء اور اساتذہ نے اس ایکٹ کے بنیادی غلط خیال کے خلاف اپنی شدید بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار پہلے سے کر دیا اس لئے وزیر تعلیم کو اب تک اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی اور ہماری پیش گوئی ہے کہ آئندہ بھی یہ بل دوسری یونیورسٹیوں کے لئے اپنی موجودہ شکل و صورت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پیش نہ کیا جاسکے گا۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے ساتھ معاملہ کی نوعیت یہ ہے کہ یہ بل بڑی خاموشی کے ساتھ اچانک پارلیمنٹ کے سامنے آیا اور منظور



بھی ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں یونیورسٹی کا نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ گیا، امن و سکون جاتا، تعلیم کا ستیاناس ہو گیا، یونیورسٹی بند کر دی گئی، پولس کے حفاظتی رستوں نے کمیپس پر قبضہ کر لیا۔ ہوش خالی ہو گئے اور یونیورسٹی میں خاک اڑنے لگی، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حکومت اطمینان سے بیٹھی ہے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں!! نوجوانوں کی تعلیمی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے ایک پورے برس کا برباد ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے، اور یہ عظیم نقصان صرف طالب علموں کا اپنا نہیں، بلکہ پورے ملک اور پوری قوم کا ہے۔

اس گزارش کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ طلباء بے تصور ہیں اور ان سے کوئی خطا سرزد ہی نہیں ہوئی ہے، لیکن طلباء بہر حال اپنی اولاد ہیں، ملک اور قوم کے مستقبل کا دار و مدار ان کے بننے اور بگڑنے پر ہے، پھر چند در چند اندرونی اور بیرونی اسباب و عوامل کے باعث آجکل ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں نوجوانی اور بڑھاپے میں جو شدید کشمکش برپا ہے اور جس کے مظاہرے خود ہمارے ملک میں بھی آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، لڑکوں کا اپنے جذبات کے اظہار میں آئیں و ضوابط کے حدود سے متجاوز ہو جانا ذرا بعید نہیں، لیکن اول تو چند طلباء کی وجہ سے ہزاروں نوجوانوں کا ایک تعلیمی سال برباد کر دینا کونسا انصاف ہے! پھر جو طلباء خطر کار میں بھی ان کے ساتھ معاملہ عام مجرمین کا سا کہیں پر بھی نہیں کیا جاتا۔ ہم ذاتی طور پر ایسے کتنے ہی نوجوانوں سے واقف ہیں جو طالب علمی کے زمانہ میں انتہائی شریر اور یونیورسٹی کے لئے بددعوت تھے، لیکن آج وہ گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے نہایت لائق اور قابل انسر سمجھے جاتے ہیں۔ اس بنا پر یونیورسٹی کا فرض ہے کہ وہ یونیورسٹی کے آئین و ضوابط کی رو سے مجرم طلباء کے معاملات پر بھی ہمدردی اور شفقت کے جذبہ کے ساتھ غور کرے نہ کہ کسی انتقامی جذبہ کے ساتھ، اور جہاں تک ممکن ہو کسی نوجوان کے کیریئر (career) کو تباہ نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ ایک نوجوان کی تعلیمی زندگی کا تباہ ہو جانا بسا اوقات ایک پورے گھرانہ کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔



بہ نسبت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق مسلمانوں کا عام خیال یہ ہے کہ وہاں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا ہے وہ گورنمنٹ کے ایما پر ہوا ہے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو یہ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کے لئے باعث ننگ و عار ہے اور اگر یہ خیال غلط ہے تو گورنمنٹ اور یونیورسٹی دونوں کو اس کی موثر عملی تردید کرنی چاہئے، اور اس کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ ۲ جولائی کو چند ماہ کے تعطل کے بعد جب یونیورسٹی کھلے تو جن طلباء کا اخراج کیا جا چکا ہے ان کے معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے اور یونیورسٹی میں باہم اعتماد و اعتبار کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک جمہوری طرز زندگی میں یہی طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے، جبر و تشدد اور استبداد و آمریت سے پیچیدگیاں بڑھتی ہیں کم نہیں ہوتیں۔

جنوبی افریقہ اور موریشیس کے سفر کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے مختلف اداروں کے علاوہ میں ان دونوں ملکوں کی حکومتوں، یونیورسٹیوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور اخبارات و جرائد کا بھی شکریہ ادا ہوں۔ حکومتوں نے نہ صرف یہ کہ سفر کی سہولتیں بہم پہنچائیں، بلکہ اپنے ہاں کے خاص خاص جلسوں اور پارٹیوں میں شرکت کی دعوت دی، یونیورسٹیوں کے کیمپس کے لئے مدعو کیا، اور وائس چانسلر نے بعض تعلیمی معاملات میں مشورہ کے لئے یاد فرمایا۔ ریڈیو اسٹیشن نے تقریر کی دعوت دی، اور اخبارات نے انٹرویو لے کر شائع کیا اور یوں بھی میری نقل و حرکت اور لکچروں کی نسبت و تفتاؤ اطلاعات چھاپتے رہے۔ ان سب نوازشوں اور الطاف و عنایات کا دل پر بڑا اثر ہے اور میں تیرے دل سے ان کے لئے سپاس گزار ہوں۔



# ادبی مصادر میں آثار عمرینؓ

## ایک تجویز مع مثال

از ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی، صاحب عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۱

تاریخ کا ایک عام علمی مفہوم ہے۔ مجموعی طور پر انسانوں کے ان اعمال و افعال کا مطالعہ جو خود ان کے اختیار کردہ عقیدہ کی اساس پر ان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ زمان و مکان تاریخ کے نہایت مؤثر عامل ہیں لیکن فیصلہ کن عامل خود انسان ہے۔ بالفاظ دیگر انسانی انکار و اعمال انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تاریخ کا جز و لازم ہے۔ تاریخ کی ادبی، تمدنی، تہذیبی، ثقافتی، دینی، فکری، قانونی، معاشری، معاشی یا فنی خانوں میں تقسیم زیادہ سمجھنے سمجھانے کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن فی الواقع یہ ایک ہی گُل کے اجزاء ہیں۔ یہ باہم ایک دوسرے کے مخالف، معاون، ممد و متمم ہیں۔ تاریخ کی ایک ایسی تقسیم انسان کے انتہائی کثیر الاوصاف مرکب ہونے کی وجہ سے بھی ضروری ہے۔

انسان کے اوصاف بیان کرنے کے لئے اجمالی و عمومی پیرایہ بیان اختیار کیا جائے مثلاً اس کو عالم اصغر کہا جائے تو یہ بات یقیناً مطابق واقعہ ہے مگر حد درجہ عمومی ہونے کی وجہ سے مبہم اور محمول سی رہتی ہے۔ تشخص و تعین نہیں ہونے پاتا۔ ایک اوسط درجہ کے شائستہ آدمی کی



اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ وہ تشریح چاہتا اور وضاحت کا طلبگار رہتا ہے۔ اس لئے اگر اس کے ہر رخ کو طوطہ دیکھ کر اس کی تفصیل کی جائے اور پھر حیثیت بھری نظر ڈال کر غور کیا جائے تو نظر کا غبار دور ہو کر بصیرت کا نور کل کا احاطہ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر ایک یا صرف محدودے چند رخ ہی دیکھنے دکھانے پر اکتفا کیا جائے تو اس کی دوسری حیثیتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ایسا یک رخ بیان اندھوں کی فیل شناسی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جیسے مثلاً: انسان کو آگ استعمال کرنے والا پستانہ۔ سوچنے والا جانور یا معاشی حیوان کہنے میں فی الجملہ کوئی غلطی نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کی مذکورہ صفتوں سے کسی ایک کو سب کچھ کہہ دینا غلط اور بلا شرط و قید ایک ہی حیثیت کو سب سے زیادہ اہم بتانا ناموزوں و نامناسب ہوگا۔ اس لئے کس انسان کی انفرادی و اجتماعی حیثیت کو پہنچنے جانچنے اور اس کا ٹھیک ٹھیک موقف متعین کرنے کا صحیح پہنچ یہ ہوگا کہ اس کے افکار و اعمال کا ممکنہ حد تک ہر ایک جزو پیش نظر رکھنے، ان کے باہمی ربط و تعلق و تناسب کے کا حق جاننے اور بے لاگ مطالعہ کرنے کو لازمی شرط مان لیا جائے۔

مدت دراز سے تاریخ کے مفہوم میں اس کے سیاسی پہلو کو اتنا اہم سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے دوسرے پہلو بالکل یا بیشتر نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ ان کا ذکر بھی ہے تو زیادہ تر ذیلاً و ضماً۔ مثلاً اگر ہم ابتدائی مسلمانوں کی ادبی زندگی کا بیان یا ان کی معاشری و معاشی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو مشہور عام تاریخوں میں کوئی قابل لحاظ مواد دستیاب نہیں ہوتا، اور وقت کا بدل نہیں ملتا اور یہی وہ متاع ہے جو کبھی کسی صورت مکر نہیں ملتی۔

تاریخ ساز افراد کی سوانح نگاری میں یہ یک رخ اپن یا عدم توازن یا احساس توازن کا فقدان اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ برگزیدہ اشخاص زمان و مکان سے وابستہ رہنے اور اتار چڑھاؤ قبول کر سکنے والی شخصیتیں نہیں بلکہ محض خیال کی پیداوار معلوم ہوتی اور مادہ انسانیّت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کارنامہ کا نمود بے شک وریب بجا و درست لیکن اس کی نمائش فریب نظر سے زیادہ نہیں۔ سایہ اجالے کے بغیر عکس شخص کی نہیں محض خیال کی پرچھائیں ہیں، یہ عینت کاری



نہیں بلکہ زندے کا گھنا اور کونچی کا پچا رہا ہے۔

جلال و جمال کی انتہا حیرانی کا باعث ہوتی اور حیرانی سے جمود و سکوت طاری ہوتا ہے جس شخص مستقبل کے قول و فعل کے اثرات دوسرے افراد انسانی کی بہ نسبت زیادہ گہرے طور پر اور وسیع تر ہوتے ہیں ان کے بیان میں حق و صداقت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا اور ان کے اظہار میں بقدر امکان و استطاعت اعتدال برقرار رکھنا ہر سوانح نگار و مورخ کا اولین اور بنیادی فرض ہے۔ ایسا علم حاصل کرنا ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو جان بوجھ کر مستقبل کی صورت گری کرنا چاہتا ہے۔ ماضی کا صحیح علم حاصل کئے بغیر مستقبل کی تشکیل ممکن نہیں۔

۲

یہ واقعہ تو غالباً معمولی سمجھ رکھنے والا بھی جانتا و مانتا ہے کہ انسان کی فکر و نظر اور نتیجہ اس کے عمل میں پائیدار و دیرپا تبدیلی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واسطوں سے ہوتی ہے ان کا سلسلہ سیدنا ابوالقاسم محمد بن عبداللہ صلم پر ختم ہو گیا۔ آپ صلم کی زندگی کا دھندلا دم نہ نہیں بلکہ صاف و واضح اور ناقص و ناتمام نہیں بلکہ بقدر ضرورت کامل و مکمل نقشہ تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے البتہ کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ صلم کے ساتھیوں خصوصاً آپ صلم کے دو ابتدائی جانشینوں نے تاریخ عالم پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً ایسا گہرا اور وسیع اثر ڈالا ہے کہ قولاً و فعلاً ان کی اتباع امت اسلامی کے جم غفیر و جمہور کثیر کے ایمان کا لازمہ، ان کے عمل کے لئے نمونہ اور ان کے قانون کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اسی وجہ سے ان بزرگوں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں آثار میں جو تفسیر و حدیث، فقہ و کلام وغیرہ جیسے علوم و فنون کی کتابوں میں نقل ہوتے آئے ہیں اور ایسی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں جو صد ہا سال سے ان علوم و فنون میں مصادر و ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

عمر بن شکر کے سوانح نگاروں نے زیادہ تر ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن میں کسی نہ کسی ترتیب سے صرف نمایاں حوادث قلم بند کئے گئے ہیں۔ جیسے اخبار الرسل و الملوک یا طبقات الصحابة الکبریٰ، فتوح البلدان وغیرہ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری کتابوں میں حسب توقع



ایسی خبریں تھیں جو ان بزرگوں کی عوامی زندگی سے متعلق ہیں۔ اور ان کی فکر و نظر سے۔ دین و تمدن میں  
تعمیر نہیں کہیں۔ ان سوانح نگاروں نے علوم و فنون کی ان کتابوں سے شاور و ناقد ہی فائدہ اٹھایا  
ہے جن کی طرف اچھا اشارہ کیا گیا۔

باقی الحروف کا خیال ہے کہ عمرین کے جلد آثار کسی نہ کسی سہولت بخش ترتیب سے سلسلہ دار  
یک جا مرتب ہونے چاہئیں۔ ان کے غیر عمرین کی زندگی کے متعلق ہمارا علم ادھورا رہے گا۔ اس لئے  
اس ادھورے علم پر مبنی عمل بھی ادھورا و ناقص رہے گا اور بالواسطہ اسلامی قانون بھی کسی نہ  
کسی حد تک قابل ترمیم دکھائی دے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو اور عربی میں عمرین کی ایک سے زائد سوانح موجود ہیں لیکن  
مواد کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان بزرگوں کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکے۔ بعض  
سوانح نگار مثلاً شبلی نعمانی مرحوم ان مصادر سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے جو ان کے  
زمانہ تصنیف تک چھپ کر عام نہیں ہوئے تھے اور خطوط مافذول کا ان تک پہنچنا ممکن نہیں ہوا۔  
اپنے سابقوں کی فضیلت تسلیم کرتے ہوئے اب ان مصادر و مآخذ سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری  
ہے جو گذشتہ نصف صدی میں شائع ہو چکے ہیں تاکہ ہمارے پیشرو جو اچھا مفید و نیک کام کر گئے  
ہیں اس کا سلسلہ جاری رہے اور اس میں مزید ترقی ہو۔

اسلامی دینی و مذہبی کتابوں میں آثار شیوخ کا پایا جانا یقیناً ایک ایسی وحدت سی بات ہے  
اس لئے ان کی اہمیت یاد دلانے کی حاجت نہیں البتہ یہ جتنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خاص  
ادبی و لغوی و محاضراتی حتیٰ کہ نحوی مصادر میں بھی عمرین کے آثار بتعداد کثیر تہ تحریر میں آ گئے  
ہیں۔ ان کی طرف سوانح نگاروں اور عالموں نے بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ دراصل مالکہ شری حیثیت  
سے ان کی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ بعض صورتوں میں ان آثار سے  
شیخ کی زندگی کے ایسے رخ بھی واضح ہوتے ہیں جو آج بھی ٹکرائیگر و قابل عمل معلوم  
ہوتے ہیں۔



اس مقالہ کی اصل غرض تاریخ اسلام کے طالب علموں کو عموماً اور عمرین کے آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کو خصوصاً ان دسیوں اساسی ادبی مصادر کی طرف توجہ دلانا ہے جن میں ان کے اراک و اقوال ہزاروں صفحوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ سوائے ان مصادر کے دوسری کتابوں میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں جب کہ مسلم و غیر مسلم دونوں میں اسلامی اقدار کا از سر نو جانچ پرتال کرنے کی طرف مائل اور موجودہ حالات میں ان کی آریزیش کا تعین کرنا چاہتے ہیں عمرین کی زندگی کا خزانہ معلومات ”ذخیرہ عمرین“ جمع کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

اگلے صفحوں میں کوشش کی گئی ہے کہ بطور مثال شیخین سے قریب تر زمانہ کے ایک نہایت ممتاز بلکہ شائد سب سے بڑے عربی ادیب ابو عثمان عمرو بن بحر جاحظ کی تحریروں میں عمرین کے جو آثار نقل ہوئے ہیں ان کا احاطہ کیا جائے۔ یہ مثال اس طرح کے دوسرے ادبی و علمی مصادر سے مطلوبہ مواد جمع کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ کا کام دے گی۔ یہ نمونہ خواہ کمال نہ سہی ناقابل التفات بھی ان شار الشد نہیں ہوگا۔

اگر اس طرح شیخین سے متعلق ایک ایک ادیب، تذکرہ نگار یا فقیہ و محدث وغیرہم کی دی ہوئی معلومات جمع ہوتی رہیں تو عجب شہیں کہ آئندہ کسی وقت ان سب کو بہ ترتیب زمانی مع اشاریہ موضوعات وغیرہ اس طرح منظم کیا جاسکے کہ ان بزرگوں کے سوانح اور ان کے احوال و ظروف سے متعلق نہایت قابل اعتماد بنیادی مواد یکجا مل جائے۔ نسبتاً عارضی و ہلکا سی منافع (وشہرت) سے خالی ایسے صبر طلب ٹھنڈے لیکن ضرورت مندوں کا وقت اور ان کی توانائی بچانے والے دیر پا کام کی ہمت افزائی بہت کم ہوتی آئی ہے۔ اس واقعہ کے باوصف مجھے یقین ہے کہ مجوزہ مواد کی باآسانی فراہمی کے بغیر بڑے سے بڑا مفکر و مورخ بھی ان شخصیتوں اور ان کے زمانہ کے افکار و حوادث کی جو بھی تشریح و تعبیر یا تجزیہ و تحلیل کرنے کی کوشش کئے



گاؤہ محض یک رخ ہوگی۔ اس میں تناسب کا فقدان ہوگا وہ ناقص رہے گی۔ یہ نقص کم از کم بعض صورتوں میں تو گمراہ کن بھی ہو سکتا ہے۔

ایسا کام سرانجام دینے کے لئے انسانی ذرائع منظم کرنے اور مادی وسائل فراہم کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کا عذر خواہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو اس کا ایک واضح نمونہ پیش کرتے ہیں تو واضح و کسر نفس کا اظہار خالی از تکلف نہیں۔ ایک مختصر نمونہ بھی خوبی و سود مندی کے بے بہرہ نہیں ہو سکتا۔ والکمال للہ۔

راقم السطور نے بعض آثار کی اپنی دانست میں صرف حسب ضرورت تشریح کرنے میں کوئی برائی (شر) مضرت یا قباحت نہیں محسوس کی۔ اس کوشش میں غلطی کا صرف امکان ہی نہیں احتمال بھی ہے اس لئے اختلاف کی گنجائش بہر حال رہے گی۔ اختلاف کو رحمت کا باعث ہونا چاہئے نہ کہ نفس پروردی کا۔ جس اثر کا مفہوم پوری طرح یا جزواً سمجھ میں نہیں آیا اس کا اظہار کرتے ہوئے اہل علم سے دریافت کر دوں گا کہ اگر وہ قابل توجہ خیال فرمائیں تو اصلاح فرمائیں ان شاء اللہ یضیع اجر العالمین۔

پہلے آثار کا اردو ترجمہ سلسلہ وار ترتیب ماخذ دیا گیا ہے ترجمہ کے آخر میں عربی متن اسی ترتیب سے نقل ہوا ہے۔

جاہظ کی پیدائش سنہ ۱۵۰ھ میں اور وفات ۲۵۰ھ میں ہوئی۔ تہذیب زمانہ کی اہمیت کے پیش نظر ان کی کتابوں سے عمرین سے متعلق اخبار بھی بطور ضمیمہ شامل مقالہ ہیں یہ جاہظ کی جن کتابوں سے ماخوذ ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ البیان والتبیین - مصر - ۱۹۳۸ - ۱۹۵۵

۲۔ البخلار " ۱۹۳۸

۳۔ الحیوان " ۱۹۳۸ - ۱۹۴۵

۴۔ رسائل " ۱۹۶۵



۵۔ الترویج والتدیر - مصر - ۱۳۲۲ھ

یہی رسالہ - لندن - ۱۹۰۳ء

ان میں کتاب الثانیہ (مصر - ۱۹۵۵) تصداً ترک کی گئی ہے۔ متوسط تقطیع کی یہ کتاب دو سو شتر صفحوں پر آئی ہے۔ ان میں عربی کا نام قریباً ہر ورق پر ہے۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ رسائل محولہ ۳ کے دو جزو ہیں۔ ان میں جاحظ کے جملہ سترہ (۱۷) رسالے ہیں۔ تفصیل حوالے حسب ضرورت بر محل درج ہیں۔

### آثار ابی بکر صدیق ؓ ۲۲ - ۶ - ۱۳ھ

۱۔ ابی بکر صدیق رحمہ اللہ نے اپنی زبان کا ایک حصہ کپڑا اور فرمایا اس نے مجھے خطرناک مقام پر لاکھڑا کیا۔

البيان والبتین - ج ۱ ص ۱۹۴

تشریح: یہ اثر بر محل و باموقع خاموشی کی تحسین پر دلالت کرتا ہے۔  
۲۔ ایک شخص ابوبکرؓ کے قریب سے گزرا۔ اس کے ساتھ کچھ کپڑے تھے، آپ نے پوچھا: کیا تم کپڑے بیچتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں تمہیں اللہ مال دار بنائے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا: اگر تم تعلیم پاتے تو تم جانتے (کہ حجاب کس طرح دیا جاتا ہے) یوں کہو: نہیں اور اللہ آپ کو مغف کرے۔

البيان والبتین - ج ۱ ص ۲۶۱

تشریح: ”لا“ نہیں کے بعد ”واو“ استیفاء نہ ہونے کی وجہ سے بیان میں ایک بڑا نقص پیدا ہو گیا۔ ”واو“ کے بغیر یہ معنی ہو سکتے ہیں: نہ بنائے تمہیں اللہ مال دار۔ اردو میں اس جیسی ایک مثال ملاحظہ ہو: کسی نے کہا: اس وقت ہمارا گیت ٹھیک نہ



۱۱، ایک نمن تو ہوں گے اس وقت مت بھاگو ٹھیسے رہو۔ (۲) دوسرے معنی ہوں گے اس وقت بھاگ جاؤ ٹھیر مت۔

فالباء دوسری زبانوں میں ”واو“ استیناف کا بدل موجود ہے۔ اردو میں رموز اوقاف کا چین ہو گیا ہے۔

اثر ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کے جیسا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطیب کی تصحیح فرمائی تھی۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ صحیح مسلم۔ کتاب الجمعہ۔ حدیث ۴۸

۲۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب الادب۔ باب ۷۷

۳۔ سنن نسائی۔ کتاب النکاح۔ باب ۴۴

۳ ابراہیم بن محمد انصاری مفلوج ابو زید انصاری کی اولاد سے ہیں۔ یہ کہتے ہیں: خلفاء ائمہ اور مومنوں کے اراکین ملک ہیں مگر ہر ملک خداوند یا راجیشور، خلیفہ یا امام نہیں ہوتا۔ اس لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے خطبہ میں ان کو ایک دوسرے سے الگ کہا ہے۔ چنانچہ جب آپ اللہ کی حمد اور نبی کی صلاۃ سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

”آگاہ ہو جاؤ کہ دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ بد بخت خداوند و راجیشور ہیں!“

یہ سن کر لوگ چوکنے ہوئے اور اپنے سر اپنے کئے (گردن اٹھائی) تو آپ

نے فرمایا:

لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم تو طعنہ زنی کرنے والے جلد باز ہو، کہتے ہی خداوند (وراجیشور) ایسے ہیں کہ حکم ران ہو جائیں تو جو مال ان کے قبضہ میں ہے اس کے خرچ کرنے میں اللہ ان کو نیکل بنا دے اور جو دوسروں کے قبضہ میں ہے اس کے لینے کی طرف راغب کر دے۔ اور ان کے چلنے کے وقت میں کچھ کر دے اور ان کے دلوں میں زندگی دینے کی



ہوس ڈال دے۔ یہ ایسے ہیں کہ کسی کے یہاں تھوڑا ہو تو اس پر بھی حسد کریں اور اگر کسی کے یہاں وافر ہو تو اس سے ناخوش ہو جائیں یہ لوگ آسودگی سے تنگ آجاتے ہیں۔ نکاح میں ان کو کوئی لذت نہیں آتی۔ یہ بھی خواہوں سے کام نہیں لیتے۔ اور بھروسہ کے لوگوں سے خوش نہیں رہتے۔ یہ تو ایسے ہیں جیسے کھوٹے سکے یا نظر فریب سراب۔ دیکھنے میں خوش و خرم مگر اندر اس و غمگیں۔ جب ایسے شخص کا جی بیٹھ گیا اس کے عمر کی شادابی ٹھٹھکی اور اس کا سایہ سٹڑ گیا (وہ مرجھا) تو اللہ نے اس سے حساب لیا۔ حساب میں سختی کی اور مہربانی میں کمی کر دی (الایہ کہ جو اللہ پر ایمان لائے۔ اس کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مطابق حکومت کرے۔

آگاہ رہو! رحم تہی دستوں و ناداروں ہی پر ہوتا ہے۔ خبردار رہو!! آج تم نبوت کی خلافت میں ہو۔ بیچ سڑک پر ہو۔ تم دیکھو گے کہ میرے بعد اقتدار میں درستی ہے اور فرماں روارستے سے ہٹا ہوا۔ امت بکھری ہوا اور خون بہا ہوا۔

دیکھو اگر باطل کی طرف چھلانگ لگائی جا رہی ہے، اہل حق کے خلاف سوار دوڑ رہے ہیں، خلافت کے اثرات مٹائے جا رہے ہیں (حق کے خلاف) انسان اپنی جانیں دے رہے ہیں اس کے لئے نقتے برپا کئے جا رہے ہیں اور سیدھے چلے ہوئے طور طریق مٹائے جا رہے ہیں تو ایسی صورت میں تم مسجدوں سے لگے رہو۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرو۔ اطاعت بہر حال کئے جاؤ۔ جماعت سے غلو کی ہرگز نہ ہوتے پائے اور اس سے وابستگی میں فرق نہ آئے۔ ارادہ کی مضبوطی، مشورہ اور کرگزرنے کا عہد طویل غور و فکر کے بعد ہونا چاہئے۔ تم جانتے ہو خرشنہ کہاں ہے، من قریب اس سے بعید تر علاقہ تمہارے قبضہ میں آجائے گا جیسا کہ تم اس کے قریب تر مقام فتح کر چکے ہو۔

البيان والتبيين ج ۲ ص ۳۳ جاری

خرشنہ: بلاد روم یعنی بازنطینی سلطنت کا ایک سرحدی جنوب مغربی مقام  
ابوبکرؓ کا کلام: یہ آپ نے اپنی وفات کے وقت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر



کرتے وقت کیا تھا۔

میں تم کو اپنا جانشین بنانے والا ہوں۔ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

اللہ کے بعض کام رات کے وقت کئے جاتے ہیں اگر دن میں کئے جائیں تو وہ انہیں قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح اللہ کے بعض کام دن کے وقت کئے جاتے ہیں، اگر رات میں کئے جائیں تو وہ انہیں قبول نہیں کرتا۔ اللہ فرض سے زائد کام اسی وقت قبول کرتا ہے جب فرض کام ادا کر دئے جائیں۔ اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

قیامت میں انہیں لوگوں کے وزن بھاری ہوں گے جن کے وزن دنیا میں حق کی پیروی کے اعتبار سے بھاری رہے ہوں۔ حق کا بھاری پن انہیں کے لئے ہوگا (جو دنیا میں اس کو بھاری سمجھتے تھے) میزان اسی لئے ضروری ہے کہ اس میں سوائے حق اور کچھ نہ رکھا جائے۔ اگر وہ بھاری ہو۔

قیامت میں انہیں لوگوں کے وزن ہلکے ہوں گے جن کے وزن دنیا میں باطل کی پیروی کے اعتبار سے ہلکے رہے ہوں۔ باطل کا ہلکا پن انہیں کے لئے ہوگا جو دنیا میں اس کو ہلکا سمجھتے تھے۔ میزان اسی لئے ضروری ہے کہ اس میں سوائے باطل اور کچھ نہ رکھا جائے اور اگر وہ ہلکا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ نے جنتیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اچھے اعمال بیان کر دئے ہیں۔ ان کی برائیوں سے درگزر کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو کہتا ہوں: مجھے اندیشہ ہے کہ شاید میں ان میں سے نہیں ہوں، اللہ نے آگ میں جلنے والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے بُرے اعمال بیان کر دئے ہیں اور ان کی اچھائیوں کا ذکر نہیں کیا۔ جب میں انہیں یاد کرتا ہوں تو کہتا ہوں: مجھے امید ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گا۔ اللہ نے رحمت کی آیتوں کے ساتھ ساتھ عذاب کی آیتیں بھی بیان کی ہیں تاکہ بندہ رحمت کی رغبت کرے اور عقوبت سے ڈرتا رہے۔ اور اللہ سے سوائے حق اور کوئی بات منسوب



نہ کرے (سوائے حق اور کچھ نہ مانگے) اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔  
 اگر تم نے میری وصیت یاد رکھی تو آن رکھی چیزوں میں تمہیں موت سے زیادہ کوئی اور  
 شے محبوب نہ ہونی چاہئے۔ اور اگر تم نے میری وصیت بھلا دی (ضائع کر دی) تو آن رکھی چیزوں  
 میں تمہیں موت سے زیادہ اور کوئی شے نفرت انگیز نہ ہونی چاہئے۔ حال آں کہ تم اللہ کو عاجز  
 کر ہی نہیں سکتے (اس کا حکم تو بہر حال چلے گا ہی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو)

البيان والتبيين - ج ۲ ص ۴۵

۵ ابو بکرؓ حج میں مقام جمع (مزدلفہ) سے لوٹے۔ وہ اس وقت اپنے اونٹ کو اپنے  
 پیڑھے بٹھ کے سونٹے سے مار کر اسے اپنا طرف کھینچ رہے تھے۔

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۸۵

توضیح: اس اثر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ابو بکرؓ منجمن: عصا استعمال کرتے تھے۔  
 ۶ روایت ہے کہ ابو بکرؓ کو کسی کی موت کی اطلاع ملتی تو آپ کہتے: لا الہ الا اللہ  
 سوائے اللہ کے اور کوئی الہ نہیں ہے

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۱۴۳

۷ ابوبسطام شعبہ بن حجاج دہلی ۱۰۰۰ھ میں ۱۱۶ھ سے روایت کرتے ہیں:  
 اہل یمن کا وفد ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے انہیں قرآن سنایا۔ وہ سب  
 کے سب رونے لگے۔ آپ نے فرمایا: ہم بھی ایسے ہی تھے کہ قرآن سنتے تو دل گچل جاتے  
 مگر اب دل سخت ہو گئے ہیں۔

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۱۵۱

ملاحظہ: ابو بکرؓ کا یہ قول بر بنائے واضح ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے  
 سننے کا جواثر ہوتا تھا وہ بھی اس قول سے ظاہر ہے۔

۸ ابو بکرؓ نے فرمایا: قابل رشک بھلائی ہے ان کے لئے جو ایسے زمانہ میں وفات



پاگئے جب اسلام کم نور ہونا چاہتا تھا۔

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۱۵۱

توضیح: مطلب یہ کہ: اقتدار حاصل ہونے سے ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ان سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہے۔ یا یہ کہ

تسلط و غلبہ کے بعد اسلام قبول کرنا آسان ہو گیا اس لئے ابتدائی مومنوں کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کی وجہ سے ان کا ثواب بہت زیادہ ہو گا۔

۹ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خالد بن ولید کو فوجی کارروائی پر روانہ کرتے وقت ان سے کہا: موت کی حرص کرو تمہیں زندگی بخشی جائے گی۔

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۱۷۰

ماحظ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمودہ اپنے رسالہ کتاب البخار میں ہو بہو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو۔ رسائل الجاحظ ج ۲ ص ۳۷۷

ملحوظہ: ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ارشاد واضح ہے، یہاں سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۹ کی یاد تازہ کر لی جائے تو مناسب ہے "اعني: وَكَذَلِكَ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ لِّأَوَّلِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" باتباع فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — إِنْ مِنْ الشَّعْرِ حَكْمَةٌ (صحیح البخاری کتاب الادب: ۷۸ - باب: ۹۰) شعر میں حکمت بیان ہوتی ہے صحابہ غنصار کی ایک بیت کا استحضار بر محل ہو گا۔

هَيِّتِ النَّفُوسَ وَهَوِّنِ النُّفُوسَ — سِیْ یَوْمِ الْکَرِیْمَةِ أَلْقِیْ لَهَا

مطلب یہ کہ بوقت جنگ جان کو حقیر سمجھنے ہی سے جان عزیز باقی رہتی ہے۔

۱۰ جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کسی شخص کو تسلی دیتے تو کہتے: صبر کے ساتھ مصیبت جمع ہو سکتی ہے اور

نہ ہائے والے کے ساتھ کوئی فائدہ جوڑ کھاتا ہے۔

موت سے پہلے جو کچھ (از قسم نہیں) گزر چکا ہے اس کے مقابلہ میں موت نہایت ناگوار ہے



(کہ بھلائی کرنے کا موقع جاتا رہا) موت کے بعد جو کچھ (از قسم رحمت) ہونے والا ہے اس کے مقابل موت نہایت حقیر ہے۔

البيان والتبيين - ج ۳ ص ۲۸۴

۱۱ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی انصار بنو ساعدہ کے چھت والے چبوترہ — ستیفہ میں جمع ہوئے۔ وہاں)

حباب بن منذر خزرجی نے کہا :

میں وہ سالار ہوں جس کی رائے تشفی بخش ہوتی ہے۔ میدان قتال میں میری حیثیت جھنڈہ کی سی ہے، اسی کی وجہ سے نبرد آزما میدان میں ڈٹے رہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ہم پھر اس میں پہل کرنے کو تیار ہیں (مناسب ہے کہ) ہم میں سے ایک امیر اور تم میں سے ایک امیر ہو ورنہ مہاجر اگر انصاری کے بارے میں کچھ کرے تو انصاری اسے رد کر دے گا اور اگر انصاری مہاجر کے بارے میں کچھ کرے تو وہ اسے رد کر دے گا۔

(خزرجی کی اس تقریر پر) عمرؓ نے کچھ کہنا چاہا تو ابو بکرؓ نے کہا : عمر! نہ اٹھیں و [ہم مہاجر ہیں۔ اسلام قبول کرنے میں لوگوں میں سب سے زیادہ پیش پیش، باعتبار سکونت ان میں سب سے اچھی جگہ رہنے والے، ذاتی و خاندانی حیثیت سے لوگوں میں سب سے زیادہ مکرم، وجاہت کے لحاظ سے ان میں سب سے بہتر، پیدائش کے حساب سے عرب میں ہماری تعداد سب سے زیادہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ میں قریب ترین۔ ہم نے آپ حضرات سے پہلے اسلام قبول کیا۔ قرآن نے ہم کو آپ پر مقدم کیا۔ آپ دین میں ہمارے بھائی ہیں اور مال میں ہمارے شریک۔ دشمن کے خلاف ہمارے مددگار۔ آپ نے ہمیں پناہ دی، مدد کی اور آتش برتا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ ہم امیر ہوں گے آپ وزیر۔ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور گروہ کے آگے نہیں جھکیں گے آپ کا حق پر اتنا یقین کہ اللہ نے جن مہاجرین کو جو



کچھ دیا ہے اس پر آپ رشک نہیں کریں گے۔

(یہ سن کر انصار نے کہا: ہم راضی ہیں۔ آپ کی بات تسلیم کرتے ہیں۔

عیسیٰ بن یزید ارزق کی روایت ہے کہ: ابوبکرؓ نے کہا: ہم اللہ کے خدمت گزار

ہیں۔ ہم باعتبار بود و باش اللہ کے گھر سے اور بلحاظ رشتہ داری اللہ کے رسول سے بہت قریب ہیں اگر یہ امر (حکومت) اُس تک بڑھا اور پھیلا تو خزانہ اس سے تھڑک کر سکڑ نہیں جائیں گے (وہ بھی حکومت کا دعویٰ کریں گے) ان دونوں گروہوں میں اتنے قتل ہوئے ہیں کہ وہ بھولے نہیں جاتے اور اتنے زخمی ہوئے ہیں کہ وہ چنگے نہیں ہو سکتے مگر آپ میں سے کسی نے آواز لگائی تو وہ یقیناً بزرگے جہڑوں کے بیچ میں آگیا۔ مہاجر سے دانتوں سے کاٹے گا اور انصاری چبا جائے گا۔

البيان والتبيين ج ۳ ص ۲۹۶ جاری

۱۲ ابن ابی سفیان بن حویطب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت

کرتے ہیں:

میں عمرہ کر کے اپنے مکان واقع مدینہ پہنچا تو میرے گھر والوں نے کہا: کیا تمہیں معلوم ہوا کہ ابوبکرؓ قریب مرگ ہیں؟ یہ سنتے ہی میں ابوبکرؓ کے پاس پہنچا دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں نے کہا: رسول اللہؐ کے خلیفہ! کیا اسلام لانے والوں میں سب سے اول آپ ہی نہیں تھے؟ کیا رسول اللہؐ کے ساتھ غار میں دوسرے آپ ہی نہیں تھے؟ آپ کی ہجرت پکی اور سچی۔ آپ کی مدد خوب دنیا۔ آپ لوگوں کے والی ہوئے اور ان کے دوست و بہی خواہ! ان پر ایسے کو عامل بنایا جو ان میں بہتر تھا۔

ابوبکرؓ نے کہا: جو کچھ میں نے کیا وہ ٹھیک ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں۔ خدا کی قسم ٹھیک ہے!



آپ نے فرمایا: قسمیہ؟ (فاتیہ؟) میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جو کچھ میں نے کیا ابھی طرح جانتا ہوں (کہ وہ درست ہے) لیکن یہ بات مجھے خدا سے مغفرت طلب کرنے میں ہرگز مانع نہیں ہوگی (میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا رہوں گا وہ فقال لما یرید ہے)

البيان والتبيين ج ۳ ص ۲۹۸

۱۳ جعفر بن محمد اپنے والد سے اور وہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔

عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں (میرے والد کی شہادت کے بعد) میری والدہ اسماء بنت عمیس سے ابوبکرؓ نے نکاح کیا تھا۔ میرے پاس کتے کا ایک پلا تھا۔ وہ آپ کے پلنگ کے نیچے تھا۔ میں نے کہا: بابا جان! کیا میرا کتا بھی؟

ابوبکرؓ نے کہا: میرے بچے کے کتے کو نہ مارو۔

پھر آپ نے اپنی انگلی سے کتے کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی اس کو پلنگ کے نیچے سے نکال دو۔ مجھے معلوم نہیں (وہ کب نکالا گیا) پھر وہ مار دیا گیا۔

الحيوان - ج ۱ ص ۲۷۹

۱۴ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں عمرہ کے ارادہ سے تریانی کے تہرانٹ لے کر مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر قریش مانع ہوئے اور بالآخر عارضی صلح ہو گئی کہ آپ اس سال عمرہ ملتوی کر دیں گے۔

صلح کی بات چیت کے ابتدائی مرحلہ پر قریش کے نمائندہ بدیل بن ورقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: تم اپنے توند نکالے ہوئے پیٹوؤں کا لے کچلوں کو ساتھ لے آئے ہو۔ اگر انہیں ہتھیاروں کی معمولی سی چوٹ بھی آجائے تو وہ تمہیں ہمارے حوالے کر کے اپنی پیٹھ دکھا دیں گے۔

اس جملہ پر ابوبکرؓ کو غصہ آ گیا۔ آپ کی زبان سے ایک ناگوار جملہ نکل گیا۔ یعنی



(جاہلی عربوں کی دبی) ”لات کی اندام نہانی کرتے والے! کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم آپ صلعم کو تنہا چھوڑ دیں گے؟“

الحیوان ج ۳ ص ۴۲ + رسائل الجاحظ ج ۲ ص ۹۳

تنبیہ: یہ روایت من وعن الف: صحیح البخاری: کتاب الشروط: ۵۴ باب ۱۵  
دکتاب المغازی - ۶۴ باب ۳۳ اور

ب: سیرۃ رسول اللہ ﷺ لابن ہشام ج ۳ ص ۳۲۷ - مصر - ۱۳۵۵ھ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۵ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بوقت وفات اپنی لڑکی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول اللہ صلعم سے فرمایا: میں تم کو اپنے مال سے جو مجھے مقام عالیہ سے وصول ہوتا ہے ستر شتر بار دئے دیتا ہوں۔ تم اکیلے اس پورے مال پر قابض و متصرف نہ ہو جاؤ۔ وہ وارثوں کا مال (تمہارے علاوہ دوسرے) وارث تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: میں اپنے دو بھائیوں اور ایک بہن اسماء سے واقف ہوں۔ کسی دوسرے وارث کو نہیں جانتی۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ (تمہاری سوتیلی ماں) بنت خارجہ حاملہ ہے۔ اس کے لڑکی پیدا ہوگی۔

الحیوان ج ۶ ص ۵۰ جاری

تشریح: بنت خارجہ یعنی حبیبہ بنت خارجہ بن زید انصاری  
ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ کی بیوی حبیبہ سے حسب توقع لڑکی تولد ہوئی۔ نام ام کلثوم تھا۔

تفصیل چاہنے والے طبقات الصحابہ لابن سعد — فہرست الاعلام سے رجوع ہو سکتے ہیں۔



۱۶ ابو بکر رضی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ : آپ کے پاس استلذاذ بالمثل کرنے والا (بغرض سزا) لایا گیا۔ آپ نے اس کی پیٹھ پر دیوار گرا دینے کا حکم دیا۔  
ابو بکر رضی کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ : خالد بن ولید نے ابو بکر رضی سے ایسے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جو مذکورہ بالا فعل کے مرتکب تھے تو ابو بکر رضی نے ان سب کو جلادینے کا حکم صادر فرمایا۔

رسائل الجاحظ۔ ج ۲ ص ۱۰۰

تنبیہ : ”زندہ جلادینے“ والی روایت راقم الحروف کی نظر میں نہایت ضعیف ہے۔  
البتہ بطور تہدید ایسا قول بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔  
۱۷ ابو بکر رضی نے فرمایا : مجھے اپنے گھر والوں پر غصہ آتا ہے۔ وہ کئی دنوں کا غلہ ایک ہی دن میں ختم کر دیتے ہیں۔

البخلاء۔ ج ۱ ص ۴۴

تنبیہ : ظاہر ہے کہ اس قول سے آپ کی مراد اسراف سے روکنا ہے نہ کہ فیاضی وہاں نوازی سے۔

### ضمیمہ آثار الی بکر صدیق رضی

عبدالملک بن مروان نے برسر منبر کہا : اے نگہ بالاشدہ گروہ ! کاش تم ہم سے انصاف کرتے (تم ہم سے انصاف کیوں نہیں کرتے) تم ہم سے ابو بکر و عمر کی سی سیرت کے طلبگار ہو دراصل خالیکہ نہ تو تم خود اپنے ہی میں ان کی رعیت کی سی سیرت رکھتے ہو اور نہ ہم سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہو جو ان کی رعیت نے ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ سب کے لئے سب کی مدد کرے۔ (علامی و



رعیت ایک دوسرے کے باہمی مددگار ہوں۔

البيان والبتیین - ج ۱ ص ۲۶۵

۲ محمد بن اسحاق م ۱۵۲ نے یعقوب بن عتبہ م ۱۲۸ سے اور عتبہ نے انصار کے ایک شیخ سے روایت کی ہے : یہ انصاری شیخ بنو خزرج کی شاخ زُرین سے تھے۔ انصاری نے کہا کہ جب نعمان بن منذر کی تلوار عمر رحمہ اللہ کے یہاں لائی گئی تو آپ نے جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل بن عبد مناف م ۵۷ کو بلایا۔ انہیں اس تلوار سے مسلح کیا پھر پوچھا۔ جبیر بتاؤ نعمان کون تھا ؟ جبیر نے کہا قبیلہ تفس بن معد سے جو باقی رہ گئے ان سے۔

جبیر عربوں کے بہت بڑے نسب داں تھے۔ انہوں نے یہ علم ابو بکر صدیق رضی اللہ سے حاصل کیا تھا۔

اور سعید بن مسیب بن خزن مخزومی م ۹۴ ۷۱۲ء تک یہ جبیر سے سیکھا تھا۔

البيان والبتیین - ج ۱ ص ۳۰۳، ۳۱۸

ابو بکر رحمہ اللہ اس امت میں نسب کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ آپ کے بعد عمرؓ کا درجہ تھا۔ پھر جبیر بن مطعم پھر سعید بن مسیب پھر ان کے لڑکے محمد بن سعد۔

الحیوان ج ۳ ص ۲۱۰

اصحاب اخبار (تاریخ) و انساب میں سب سے پہلے ابو بکر صدیق رحمہ اللہ کا درجہ ہے پھر جبیر بن مطعم کا۔ پھر سعید بن مسیب کا پھر قتادہ بن دعامة بصری م ۱۱۷ ۷۱۷ء اور ابو عبد اللہ عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود ہذلی م ۹۸ ۷۰۸ء کا

البيان والبتیین ج ۱ ص ۳۵۶

۳ کہتے ہیں عثمان بن عفان خطبہ دینے منبر پر چڑھے۔ مگر رک گئے تو کہا : ابو بکر و عمر اس مقام پر جو کچھ کہنا چاہتے اس کے لئے وہ تیاری کیا کرتے تھے اب



تمہیں خطیب امام سے زیادہ عادل امام کی ضرورت ہے۔ عنقریب تم ایسے خطبے سنو گے جیسے کہ ہونے چاہئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ معذم ہو جائے گا (کہ میں خطیب ہوں)

البيان والتبيين ج ۱ ص ۳۲۵ اسی کتاب کے دوسرے جز کے صفحہ

۲۵۰ پر یہ اطلاع مکرر آئی ہے۔ یہاں آخر میں عن قریب الخ نہیں ہے۔

۴ ابوالحسن علی مدائنی م ۲۱۵ ھ نے روایت کی ہے: ابوبکر خطیب تھے۔

عمر خطیب تھے۔ عثمان خطیب تھے اور علی ان میں سب سے بڑے خطیب تھے۔

البيان والتبيين - ج ۱ ص ۲۵۳

عثمان بن عفان منبر پر چڑھے اور کہا: لوگو اللہ نے تمہارے لئے افریقہ فتح کر دیا

ابو یحییٰ عبداللہ بن ابی سرح م سنہ ۳۶ ھ (یا ۵۷ ھ) نے عبداللہ بن زبیر کے ذریعہ

فتح کی اطلاع دی ہے ابن زبیر! اٹھو! خبر دو!!

عبداللہ کہتے ہیں میں اٹھا خطبہ دے کر منبر سے اترتا تو میرے والد نے فرمایا: لوگو!

تم نکاح کرو تو عورتوں کے باپ دادوں اور ان کی بہنوں کے (حسب نسب) لحاظ سے

کرو۔ میں نے اس لڑکے کو ابوبکر سے جتنا زیادہ مشابہ پایا اتنا ان کی کسی اولاد کو

نہیں پایا۔

البيان والتبيين - ج ۱ ص ۴۰۶۔ یہ خبر اسی کتاب کے دوسرے جز کے

صفحہ ۹۵ پر اس طرح ہے کہ میں نے اس لڑکے کو ابوبکر الخ کی نسبت عثمان بن عفان سے

کی گئی ہے نہ کہ زبیر سے۔

تنبیہ: عبداللہ کی والدہ اسماء ابوبکر کی لڑکی اور سیدہ عائشہ رض زوجہ البنی صلعم

کی بہن تھیں۔

۶ ابوالحسن علی مدائنی م ۲۱۵ ھ ابوسعید یحییٰ بن سعید انصاری م ۱۴۴ ھ سے

اور وہ معروف بن خربوذ بکری سے اور وہ خالد بن صفوان سے روایت کرتے ہیں کہ:



عبداللہ بن عبداللہ اہم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان کے پاس حاضر ہوا۔ مجمع عام میں کھڑا ہوا، خطبہ دیا۔ اللہ کی ستائش کی اور کہا :

اما بعد۔ ساری اشیاء اللہ ہی نے پیدا کی ہیں حالاں کہ وہ ان کی فرمانبرداری سے بے نیاز اور ان کی نافرمانیوں سے واقف تھا۔

پہلے سارے انسانوں کی منزلیں اور رائیں مختلف تھیں۔ تمدنی و تہذیبی، مادی و معنوی، علمی و فکری حالتیں یکساں نہیں تھیں، اہل عرب تو سب سے زیادہ بُری حالت میں تھے۔ خواہ وہ دیہاتی ہوں یا شہری۔ دنیا کی بھلائیاں اور زندگی میں اس کی راحتیں (زرعی پیداوار و صنعت) دوسرے لوگ جمع کرتے تھے۔ ان میں عربوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ (وہ ان سے محروم تھے) ان کے مردے آگ میں اور ان کے زندے اندھے تھے، اس کے ساتھ ایسی بے شمار چیزیں موجود تھیں جن سے رغبت یا نفرت ہوتی ہے (خیر و شر) مفید و مضر، خوب و زشت سب موجود تھے۔

جب اللہ نے عربوں پر اپنی رحمت پھیلانا اور ان پر اپنی نعمتیں برسانا چاہا تو ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ یہ جس نقصان میں پڑے ہوئے تھے وہ اس پر نہایت گراں گزرتا تھا۔ وہ ان کی بھلائی کا حرص اور ایمان لانے والوں کے لئے رافت و رحمت برتنے والا تھا۔ مگر اس کی ان سب خوبیوں کے باوجود اس کی قوم نے اس کے جسم کو زخمی کیا۔ اس کے اچھے نام کو بگاڑا۔ حالاں کہ اس کے ساتھ اللہ کی کتاب تھی۔ جو حق بیان کرتی تھی۔ اور اس کے ساتھ اللہ ہی کی دلیل تھی جو سچائی دکھاتی تھی۔ وہ اللہ ہی کے حکم سے چلتے اور اسی کی اجازت سے ٹہرتے تھے بائیں ہمہ عربوں نے رسول کو غار میں پھنسنے پر مجبور کیا۔

جب اس کو عزم کا حکم دیا گیا تو اللہ کا حکم بجالانے میں اس کا رنگ خوشی سے چمکنے لگا، اللہ نے اپنے رسول کی دعوت کو کامیاب کیا۔ اس کے بول کو بالا کیا۔ اس کی دعوت کو فائز المرام بنایا۔



رسول اللہؐ نے دنیا اس حال میں چھوڑی کہ وہ پاکباز۔ پرہیزگار اور بابرکت تھے اللہ ان سے راضی تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ابوبکر اللہ ان پر رحم فرمائے رسول اللہؐ کے جانشین ہوئے۔ وہ رسول کی سنت پر چلے اور انہیں کا راستہ اختیار کیا۔ اہل عرب دین سے پھر گئے۔ رسول اللہؐ کے بعد ابوبکر نے ان سے صرف وہی قبول کیا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں ان کی طرف سے آتا تھا (زکات معاف کی نہ اس کے نصاب میں کمی کی)

(فتنۃ ارتداد کو مٹانے کے لئے) ابوبکر نے تلواریں نیاموں سے نکلوائیں۔ آگ کو شعلوں سے بھڑکایا۔ پھر حق کا ساتھ دینے والوں کو لے کر باطل کا ساتھ دینے والوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان کو جو چیزیں جوڑتی تھیں ان کو توڑے اور زمین کو ان کا خون پلائے بغیر نچت نہیں بیٹھے تا آنکہ ابوبکر نے ان کو از سر نو اسی دائرہ میں داخل کیا جس سے وہ نکل گئے تھے۔ اور اسی مرکز پر قائم رکھا جس سے وہ بھاگ گئے تھے۔

ابوبکر نے اللہ کے مال سے ایک اونٹنی لی تھی وہ اس سے اپنا کلاتر رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ایک حبشی عورت تھی۔ یہ ان کے بچے کو دودھ پلاتی تھی۔ مگر وقت وفات یہ بھی ان کے حلق میں پھنس کر گلو گیر ہو گئی۔ اس لئے یہ اونٹنی اور حبشی لونڈی اپنے جانشین کے حوالہ کر دی اور اپنے جانشین کے وسیلہ لوگوں سے خلاصی حاصل کی۔

انہوں نے اپنے دوست رسول اللہؐ کے طریقہ پر دنیا اس حال میں ترک کی کہ وہ پاکباز و پرہیزگار تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔

ابوبکر کے بعد عمر بن الخطاب ان کے جانشین ہوئے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے، عمر نے شہر بسائے۔ شدت کے ساتھ نرمی بھی ملائی۔ آستینیں چڑھائیں پلو اور نچا کیا۔ (کرسی) جو امور پیش آئے ان سے نمٹنے کی مناسب حال تدبیر کی اور جنگ کے لئے موزوں آلات مہیا کئے۔



جب مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے ان کو زخمی کیا تو انھوں نے عبداللہ بن عباس سے کہا: لوگوں سے دریافت کیا جائے آیا وہ قاتل کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر سکتے ہیں؟ جب ان سے کہا گیا کہ وہ مغیرہ کا غلام ہے تو انہوں نے لا الہ الا اللہ کہا۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کو کسی ایسے شخص نے نہیں مارا جس کا فائدہ میں کچھ حق تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کا خون حلال ہو جاتا۔ کیوں کہ انھوں نے حق دار کے حق سے کچھ لیا تھا۔ عمر نے اللہ کے مال سے اسی ہزار سے کچھ زائد رقم اپنے اختیار تمیزی سے استعمال کی تھی۔ عمر نے اپنی جائیداد ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت کر دی اور اس رقم سے لئے ہوئے مال کی پابجائی ہو گئی۔ عمر کو یہ بات ناپسند تھی کہ یہ جائیداد ان کے اہل خانہ اور بچوں کی کفیل ہو۔ اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری اپنے بعد ہونے والے جانشین کے سپرد کر دی۔

انھوں نے دنیا اس حالت میں چھوڑی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح پاکباز و پرہیزگار تھے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔

اللہ کی قسم! عمر کے بعد ہم کسی ایسے شخص پر مجتمع نہیں ہوئے جو ٹھیک ٹھیک سیدی راہ پر ہو۔

عمر! تم دنیا کے بیٹے ہو۔ تمہیں دنیا کے بادشاہوں نے جہاں اس کی چھاتیوں سے دودھ پلایا، توقع ہے کہ تم اس کو وہیں رکھو گے جہاں اللہ نے اس کو رکھا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تمہارے ذریعہ دنیا کی کدورت صاف کر دی اور اس کی مصیبتیں دور کر دیں۔ تم اپنا کام کئے جاؤ، دنیا کی طرف توجہ مت کرو کیوں کہ حق اس کی جگہ یہ کچھ بھی نائد نہیں دے گی۔

میں اپنی یہ بات بیان کر رہا ہوں، اللہ میری مغفرت فرمائے، میں اللہ سے مومن مردوں اور عورتوں کے لئے مغفرت طلب کرتا ہوں۔



ابو حمزہ یحییٰ بن مختار خارجی مکہ میں داخل ہوا۔ وہاں کی مسجد کے منبر پر چڑھا اور خطبہ دیا۔ اللہ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آگے پیچھے ہونا اللہ کی اجازت سے یا اللہ کے حکم سے یا اس کی وحی سے ہوتا تھا۔ اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل کی اس میں ان پر واضح کر دیا کہ کیا کرنا چاہئے اور کس سے بچنا چاہئے۔ ان کو اپنے دین میں کسی قسم کا شک تھا اور نہ اپنی نبوت میں کوئی شبہ۔ اللہ نے ان کو اس وقت اٹھا لیا جب وہ مسلمانوں کو اللہ کی اطاعت کرنے کے طریقہ سکھا چکے تھے۔ انہوں نے ابوبکر کو صلوٰۃ کا والی بنایا۔ مسلمانوں نے ان کو اپنی دنیا کا والی اس لئے بنایا کہ رسول اللہ نے ان کو ان کے دین کا والی بنایا۔ ابوبکر نے دین سے پھر جانے والوں سے جنگ کی کتاب و سنت پر عمل کیا۔ اور وہ اپنی راہ پر چل پڑے۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔

پھر عمر بن خطاب والی ہوئے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ وہ اپنے ساتھی کی سی سیرت پر رہے۔ کتاب و سنت پر عمل کیا۔ نئے جمع کی۔ عطلے مقرر کئے۔ رمضان میں (تراویح کے لئے) لوگوں کو جمع کیا۔ شراب پینے والوں کو کوڑے لگائے۔ دشمنوں کے شہروں پر چڑھائی کی اور وہ اپنی راہ پر چل پڑے۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔ اس خطبہ میں آگے کہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں آیا۔ اس لئے بعد کا حصہ ترک کر دیا گیا۔

البيان والتبيين ج ۲ ص ۱۲۲ جاری

۷۔ ابوسعید عبدالرحمان بن ہدی بصری م ۱۹۸ ھ نے سفیان بن سعید ثوری م ۱۶۱ ھ سے وہ ابوباشم قاسم بن کثیر ہمدانی سے اور یہ قیس بن سعد غازی سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے علیؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے آگے تھے آپ کے بعد ابوبکر رہے اور عمر تیسرے پھر فتنہ نے

ہیں بے راہ رو کر دیا۔ جو اللہ کا منشاء تھا پورا ہوا۔  
جاہظ نے کہا: علیؑ کا قول صرف اتنا ہی ہے کوئی تشریح یا توضیح بالکل نہیں۔

البيان والتبيين ج ۲ ص ۲۷۹ جاری

ملفوظ: عرب میں گھڑ دوڑ کا رواج تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑ دوڑ کرائی ہے۔ دوڑ میں گھوڑوں کی تعداد مقرر نہیں ہوتی تھی۔ دس گھوڑوں تک گنتی ہوتی تھی کہ کونسا گھوڑا کس درجہ میں رہا۔ جو سب سے آگے ہوتا اس کو سابق پھر درجہ بدرجہ مصلیٰ مصلیٰ (تین دندائے دار) تالی، مراتج، عاطف، خلی، موئل، تسلیم اور دسواں سکیت کہلاتا تھا۔

جاہظ نے باعتبار معنی درج بالا روایت سے ملتی جلتی روایت المیوان ج ۲ ص ۲۷۹ پر اس طرح نقل کی ہے۔

عامر بن قیس ایک مشہور تابعی گزرے ہیں۔ خلافت معاویہ کے دوران انتقال کیا۔ یہ شام جایا کرتے تھے۔ وہاں ایک مرتبہ گھڑ دوڑ ہوئی، اس کے فوراً بعد یہ اپنے وطن لوٹے تو کسی نے پوچھا۔ سابق کون آیا؟

عامر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
سائل نے پوچھا: اور مصلیٰ

عامر: ابوبکر!

سائل: میں گھوڑے — خیل — کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔

عامر: اور میں خیر کی خبر دے رہا ہوں۔

۸ ابوبکر صدیق کی وفات کے بعد ایک مرتبہ عائشہؓ آپ کی قبر پر آئیں اور کہا: اللہ آپ کا چہرہ روشن رکھے، آپ کی سعی نیک کی تحسین فرمائے۔ دنیا سے روگردانی کر کے آپ نے اس کو بے وقور کر دیا۔ آخرت کا رخ کر کے اس کو باوقر کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے رنج کے بعد سب سے بڑا رنج آپ کی وفات کا ہے۔ آپ



کام سے پھڑکانا بڑی مصیبت ہے۔ اللہ کی کتاب وعدہ کرتی ہے کہ آپ کی وفات پر مجاہدین آپ کا اچھا بدل ہوگا۔ اس سے بڑی تسلی ہوتی ہے۔

میں آپ کی وفات پر صبر کرتے ہوئے اللہ سے وہ وعدے پورے کرنے کی درخواست کرتی ہوں جو اس نے آپ سے کئے۔ اور آپ کے لئے مغفرت طلب کرتے ہوئے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری اس طلب میں اخلاص عطا فرمائے۔

البيان والتبيين ج ۲ ص ۳۰۲

۹ عبد اللہ بن خارجہ بن حبیب اعشی بن ربیعہ کوئی نے ایک قصیدہ کہا تھا اس میں خلفاء کے نام میں ابتدائی تین مصرعوں کا مطلب ہے :  
رسول اللہ صلعم کے بعد آپ کے جو جانشین یکے بعد دیگر ہوئے وہ سب کے سب اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ پہلے صدیق پھر عمر و عثمان وغیرہم۔

البيان والتبيين ج ۳ ص ۸۶

۱۰ عیسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں میں نے عبد اللہ بن عباس بن عبدالمطلب ۶۸ھ سے پوچھا : ابو بکر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ ابن عباس نے کہا : وہ سزا پایا خیر تھے۔ تیزی (دوگرمی) میں بھی اور غضب کی شدت میں بھی۔

میں نے پوچھا بتائیے عمر کا کیا حال تھا ؟

ابن عباس : ہوشیار پرندہ کی طرح چوکس۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے چاروں طرف ایک پھندا لگا دیا گیا ہے۔ وہ روز کا کام روز کر دیا کرتے تھے۔ جیسے دوڑ میں اپنے گھوڑے کو سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے والا۔ اس پر نرمی نہیں برتتا رکھوڑے لگائے جاتا ہے)

البيان والتبيين ج ۳ ص ۲۶۶

۱۱ یقطین کی اولاد میں ایک ہنسوڑ جوان تھا۔ اکثر پئے رہتا تھا۔ اس کے کنبہ میں ایسے

لوگ بھی تھے جو ابوبکر، عمرو عثمان وغیرہم کے بارے میں جھگڑتے رہتے تھے۔ اس جوان نے ان کی روز روز کی بحثا بحث اور خصومت سن کر چند برجستہ اشعار کہے تھے۔ ان کا خلاصہ مطلب یہ ہے :

اللہ ان کو ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ کیا جزا دے گا؟ ہمیں اس کا علم نہیں (ہم کیوں اس جھگڑے میں پڑیں)

ملحوظہ : یہ مضمون سورۃ البقرہ کی ۱۳۴ ویں اور ۱۳۵ : یں آیت سے مستفاد ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے : وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لئے تھی۔ تمہاری کمائی تمہارے لئے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

حسان بن ثابت انصاری م ۵۰ ھ نے ابوبکر کا مرثیہ کہا ہے۔ جاحظ نے اس قصیدہ کی صرف چار بیتیں نقل کی ہیں۔ ان کا حاصل کلام یہ ہے :

جب تم نے بھروسہ کے قابل بھائی کا غم مفارقت تازہ کیا ہے تو اپنے بھائی ابوبکر کو ضرور یاد کرو۔ ان کا کارنامہ شان دار ہے۔ وہ قابل تحسین و ستائش ہے۔ رسول اللہ کے بعد انہیں کا درجہ ہے۔ ابوبکر ہی نے سب سے پہلے رسول کی صداقت پر گواہی دی۔ مکہ سے ہجرت کے موقع پر دشمن پہاڑی پر چڑھ کر رسول اللہ کی تلاش میں تھے۔ وہاں اونچے غار میں آپ صلعم کے ساتھ صرف ابوبکر تھے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کے نہایت گہرے دوست تھے۔ رسول اللہ سارے انسانوں سے افضل ہیں۔ ان کے برابر کوئی نہیں ہوا۔

البيان والتبيين ج ۳ ص ۳۶۱ جاری

۱۳ یزید بن حکم بن ابی العاص ثقفی نے سقیفہ بنی سعد کے واقعہ کے متعلق جو تین

ابیات کہے ہیں اس کا مطلب ہے :

عبدالصلعم کے بعد لوگوں نے جھگڑا کیا۔ جب جھگڑا بڑھ گیا تو کیا ہوا؟ قریش سے



پوچھو (وہ جواب دیں گے) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پوری خلق خدا میں امت کی باگ ڈور آل تمیم کے ایک فرد کے ہاتھ میں تھی ؟ - جب امت کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اور لوگ بے راہ ہو گئے تو اللہ نے ابن کرامہوں کو حق کی ہدایت ابو بکر صدیق ہی کے ذریعہ کی۔

البيان والتبيين ج ۳ ص ۳۶۲

ملاحظہ : ابو بکر کا تعلق قریش کے قبیلہ تمیم سے تھا۔ سلسلہ نسب یوں ہے :  
ابو بکر عبداللہ بن ابی قحافہ عثمان بن عامر بن کعب بن سعد بن تمیم بن مرہ بن کعب بن لوی۔

۱۴ مسلم بطین سے ابو جحاف نے روایت جن تین بیٹوں میں کی ہے ان کا مطلب

ہے :

ہم اس گروہ کو سرا دیں گے جو بہتان باندھتے اور ابو بکر صدیق سے بے زار ہیں۔ نادانی کی وجہ سے یہ اپنے نبی کے وزیر سے بے زار ہیں۔ براہو ان کا جو فاروق سے بے زار ہیں۔ میں تو دشمنوں کے باوجود ہانکے پکارے یہ کہنے والے لوگوں میں ہوں : ہم نے صادق مصدق کا دین اختیار کیا۔

البيان والتبيين ج ۳ ص ۳۶۲ جاری

۱۵ قریش ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیام گاہ پر دو خصوصیتوں کی وجہ سے جمع ہوئے

تھے۔ علم اور تناول طعام

جب ابو بکر نے اسلام قبول کیا تو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اکثر لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا

البيان والتبيين ج ۴ ص ۷۶

۱۶ معاۃ بن مرارۃ صحابی نے ابو بکر سے کہا :

اگر رائے ایسے شخص کے یہاں ہو جس کی سنی نہ جائے (جس کی رائے پر

عمل نہ کیا جائے)

ہتیار ایسے شخص کے یہاں ہوں جنہیں وہ استعمال نہیں کرتا (یا نہیں کر سکتا)  
اور مال ایسے شخص کے یہاں ہو جو اسے خرچ نہیں کرتا۔  
تو پھر (معاشرہ کے) سارے ہی معاملات یقیناً بگڑ جائیں گے۔

البیان والتبیین ج ۴ ص ۹۰

ابو عمران ابراہیم بن یزید نخعی م ۹۶ ھ کہتے ہیں کتابین و صحابہ قرآن کے اعرابی  
اختلاف کے بارے میں یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ عبداللہ کی قرأت ہے یا یہ سالم یا ابی  
یا زید کی۔

یہ لوگ سنت ابی بکر و عمر کہنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ وہ سنت اللہ و سنت  
رسول اللہؐ ہی کہتے تھے۔

قرأت کے بارے میں یوں کہتے کہ فلاں نے یوں پڑھا اور فلاں نے یوں۔

المجوان ج ۱ ص ۳۳۶

## انتخاب الترغیب والترہیب جلد اول مولفہ: حافظ محدث ذکی الدین المنذریؒ ترجمہ: مولوی عبداللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر جزا و عتاب پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع  
پر المنذریؒ کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے اس کے متعدد تراجم ہوئے مگر نامکمل ہی شائع ہوئے  
کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اصل متن تشریحی ترجمہ اور حواشی کے  
ساتھ ملا کر طبع کرایا جائے۔ ندوۃ المصنفین نے نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا  
پروگرام بنایا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔ صفحات ۴۵۰ قیمت ۱۲/- مجلد ۱۳  
لئے کاپیہ: ندوۃ المصنفین۔ اردو و بازار جامع مسجد دہلی



# اسلامی حدود کی حکمت

(از مولانا حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ، البیضاء، لیجیا)

اسلامی نظام اور قانون شریعت سارے اسلامی ممالک میں اپنی پوری دنیات کے ساتھ عبادات و اجتماعیات و اخلاقیات سے لے کر قصاص و حدود تک سینکڑوں برس تک جاری رہا، اور اس میں جزوی تبدیلی کی ابتدا سامراج کے زلزلے میں سامراجی سازشوں اور مسیحی تبلیغی حکومتوں کے زیر سایہ ہوئی تھی اور بدقسمتی سے سب سے پہلے قانونِ حدود ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں ختم ہوا تھا، انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی یعنی ۱۸۵۹ء تک قانون شریعت لاگو تھا اور مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا، لیکن اس کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً وضعی قوانین نافذ کرنے شروع کئے اور انیسویں صدی کے وسط تک قانون شریعت ختم کر دیا گیا، مصر میں بھی سامراجی سازشوں سے ۱۸۸۴ء میں قانونی نظام، فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا، بیسویں صدی میں البانیا اور ترکی نے پوری جرات دے باکی اور دھاندلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ وہ لادینی حکومتیں ہیں اور سارے قوانین حتیٰ کہ پرنسپل لائٹ اٹلی، سوئزرلینڈ اور فرانس کے قوانین کے ماتحت بنادیے گئے۔

۱۔ مولانا مودودی کی عربی کتاب "نظریۃ الاسلام و ہدیہ" سے ماخوذ ہاقتصار، حاشیہ صفحہ ۱۳۸-۱۳۹،

یہ کتاب قانون اسلامی سے متعلق مولانا کے چھ مقالات و لکچرز پر مشتمل ہے، دار الفکر بیروت و

دمشق سے چھپی ہے۔

سامراجی دور میں غیر ملکی حکام نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کو ہاتھ نہیں  
 مسلم پرسنل لا تبدیلی سے محفوظ رہا۔ لگایا تھا بلکہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق بنائے گئے تھے اور علانیے

اسلام کے مشورے سے بنائے گئے تھے، اور اسی طرح کسی جگہ بھی ان میں تغیر کرنے کی کوئی تحریک نہیں  
 چلائی گئی تھی، البانیا اور ٹرکی کے لئے شرم و عار کا مقام تھا کہ جو کام سامراجی اور غیر مسلم حکومتیں نہ کر سکیں  
 دیدہ و دلیری کے ساتھ وہ کام انہوں نے انجام دیا، ان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں پرسنل لا  
 کے احکام اسلامی شریعت کے مطابق آج تک نافذ ہیں، گو بعض اوقات ان میں جزوی تبدیلی کی  
 ناکام کوششیں بعض نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ہوتی رہتی تھیں، بہر حال یہ ناکام کوششیں، یا  
 کسی مقام پر کوئی جزوی تبدیلی بھی مسلم ممالک کے لئے شرم و عار کا سامان ہے کہ یہ وہ کام ہے جس کی  
 جرأت سامراج بھی نہ کر سکا تھا، اور اس قسم کی ساری کوششیں غیر فطری، غیر عقلی، غیر آئینی اور  
 غیر شرعی ہیں جو نہ خود صحیح ہو سکتی ہیں اور نہ کسی دوسرے کے لئے حجت ہو سکتی ہیں اور ان کا  
 انجام یہ ہے کہ وہ عنقریب ناکامی ہی کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔

جیسا کہ بیان کر چکا، اسلامی قانون (پرسنل لا کو چھوڑ کر) کا خاتمہ  
 عظیم سامراجی سازش اور اس کا مقصد اسلامی ممالک میں تبشیری اداروں اور حکومتوں کے زیر سایہ ہوا

تھا، جب سامراجی ریشہ دوانیاں عروج پر تھیں، لیکن سیاسی طور پر، اور بین الاقوامی طاقتوں کے  
 بڑھتے ہوئے سیلاب، اور فطرت کے قانون اقتدار و عروج و زوال کے پیش نظر جب مغربی حکمرانوں  
 کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کو اسلامی ملکوں سے واپس نہ جانا پڑے تو انہوں نے اپنے  
 فکری سامراج کو تادیر باقی رکھنے کے قدیم منصوبہ میں زمر و جان ڈال دی وہ اسلام میں دوبارہ زندہ ہو کر

۱۔ یہ کیوں غیر قانونی ہیں اور کسی کے لئے حجت نہیں بن سکتے، اس کی تفصیل راقم نے ایک مضمون میں کی  
 ہے جس کا عنوان ہے ”مسلم پرسنل لا سے متعلق دو سوالوں کے جوابات“ جو برہان ماہ جون ۱۳۷۷  
 میں شائع ہو چکا ہے۔



پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ساری دنیا پر پھر سے چھا جانے کی فطری صلاحیت کے خلاف زبردست بند باندھنا چاہتے تھے اور ”ایوان کسری“ سے زیادہ پر شکوہ پایہ تخت اور ”نصیل قسطنطنیہ“ سے زیادہ مضبوط ڈیفنس پوزیشن بنانا چاہتے تھے۔

اس کے پیش نظر سامراجی حکمرانوں نے بڑی طویل اسکیم اور کاوش کے ذریعہ، انتہائی چابک دستی اور کونین میں شکر لپیٹنے والی پالیسی کے ساتھ اسلامی اقدار کو بدلنے کا پلان بنایا، اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم، عدالتوں اور تمام زندگی کے شعبوں میں لادینی نظام کی سرپرستی کی، لیکن ساتھ ہی تبشیری انداز کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور تھوڑی ہی مدت میں ایسے ہونہار اور فاضل سپوت پیدا ہو گئے جن کے نام اسلامی ضرور تھے لیکن انھوں نے اسلامی قانون اور نظام کے خلاف وہ کام سرانجام دیے جو غیر مسلم بھی نہیں دے سکتے تھے، اس سلسلے میں اسلامی عقائد میں تشکیک، مسلم الثبوت نظریات میں اشتباہ اسلام کے قانون فوجداری پر ظلم کا اعتراض، قانون حدود پر وحشیت و بربریت کا الزام اور عائلی قوانین پر رجحیت کا فتویٰ وغیرہ جیسی تمام غیر علمی کوششیں علم و ریسرچ کے نام پر شامل ہیں، اور ان ساری سامراجی کوششوں کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ لادینیت کا جذبہ نہ تھا بلکہ وہ صلیبیت تھی جس نے دوسرا رنگ اختیار کرنا چاہا تھا اور علمی روپ میں نمودار ہوئی تھی، اور یہودی و مسیحی اختلافات کے باوجود یہودیت و صہیونیت نے بھی مسیحیت کے دوش بدوش اسلامی ریسرچ کے نام پر اسلامی تعلیمات کو غبار آلود بنانے کی ہر ممکن سعی کی، ان تمام مساعی کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان اپنے دین اور اقدار و افکار و عقائد و نظریات کے بارے میں مشکوک ہو جائیں اور اس طرح شاید وہ مسیحیت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائیں، اور یہ خواہش کوئی نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے، حضور نامدارؐ سے خطاب انہی یوں ہے: ”لَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ“ ترجمہ: ”ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے یہود و نصاریٰ یہاں تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی کرو“ اس کے جواب میں ذات باری تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہدایت

تو صرف اسلام کے زیر سایہ ہے، اور رحمت الہی اور خدا کی بخشش ہوئی نبوت و عصمت کی وجہ سے یہ ناممکن ہے لیکن فرض کرو کہ رسول بھی اگر ہدایت الہی اور اسلام کی دولت سے محروم ہونے کے بعد یہود و نصاریٰ کی تحریفات و اموار کا قبیح ہو جائے تو دنیا میں بے یار و مددگار اور آخر میں نامراد ہو جائے گا، اس صورت میں اے اہل اسلام خوب کان کھول کر سن لو کہ سامراجی، صلیبی، تبشیری، صہیونی، اور اسی طرح سے وہ جو دین کا علم نہیں رکھتے کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (بقرہ - ۱۱۳) یعنی سورج پرست، ستارہ پرست، پتھر پرست، نیچر پرست، عقل پرست، اور وہ جو کسی چیز کی پرستش کو بھی صحیح نہیں مانتے، یعنی تمام طاغوتی اور باطل تنظیموں کی متحدہ خواہش اور متحدہ کوششیں یہی ہیں کہ اسلام کے چراغ کو گل کر دیا جائے، وہ اپنے تمام آپس کے شدید اختلافات کو بھلا کر اسلامی عداوت کے اصول پر متحد ہو گئے ہیں، لیکن مسلمان کے لئے کسی بھی صورت میں ان خواہشات باطلہ اور اموائے طاغوتیہ کی پیروی کرنے کی اجازت نہیں، اس کو اس کی ممانعت اور ساتھ ہی حکم.... اور حقیقت اسلام کا بیان اس آیت پاک میں دیا گیا ہے تِلْكَ اِنَّ هَدٰی اللّٰهُ هُوَ الْهُدٰی وَلَیِّنِ الْاٰتِیَاتِ اِهْوَاۤئُھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَاۤءَتْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَاۤئِكٌ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلٰیۤیٍّ ذٰلَا نَصِیۡرٍ (بقرہ - ۱۲۰) ترجمہ: کہہ دو بیشک اللہ کی ہدایت وہ ہدایت کی راہ (اسلام) ہے، اور فرض کرو کہ تم اگر ان کی خواہشات کی اتباع کرو اس کے بعد جو تمہارے پاس علم (وحی اور اسلام) آچکا ہے، تو نہ ہوگا تمہارے

(۲۵۱) یہاں اس آیت کی مختصر تشریح ضروری ہے، رسول خدا ساری انسانیت کو ہدایت خداوندی سے سرشار کرنا چاہتے تھے، آپ کا منصب تبلیغ و ختم نبوت و رسالت بھی اس کا مقتضی تھا، کفار قریش اور یہود و نصاریٰ سب کے لئے آپ کی عالمی دعوت و ہدایت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، یہود و نصاریٰ کا پندار یہ تھا کہ ہرگز وہ اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا اور محبوب کہتا تھا اور جنت کا اکیلا مستحق، اس کا جواب اللہ نے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھُہٗ لِلّٰہِ (بقرہ - ۱۱۲) میں یہ دیا کہ جو اللہ کی کلمہ رضا کا تابع و طالب (بقیہ اگلے صفحہ پر)



لئے اشد کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار۔  
 اہوائے باطلانہ سننے اور حکیم کتاب کے مطالبے کو منوانے  
 علماء و مفسرین اسلام کا جہاد اور اس کے اثرات کے لئے سامراجی دور ہی سے اہل علم و فکر نے کوششیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوا وہ جنت کا مستحق ہوگا، پھر حضور انور اور آپ کی امت کو ایک خاص بات یہ بتانی مقصود ہے کہ ہدایت الہی اور حق کی تلاش کرنے والا یہود و نصاریٰ کا وہ گروہ جو اخلاص و صداقت کے ساتھ کتب الہیہ کا مطالعہ کرتا ہے وہ حضور سے متعلق پیشین گوئیوں اور اسلام کی صداقت و حقانیت پر ایمان لے آتا ہے (بقرہ - ۱۲۱) لیکن عامۃً یہود و نصاریٰ کا شمار یہ ہے کہ وہ آپ کے دین میں داخل ہونے کے بجائے اپنے آپ کو اپنی اہوار یعنی یہودیت و نصرانیت کی محرفانہ اور بگڑی ہوئی شکل میں داخل کرنے کے درپے رہتے ہیں، اور بن اشبار کو منسوخ کرنے آپ آئے تھے انہیں کی طرف آپ کو بلانے لگتے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت کیونکہ دو متضاد، مختلف اور محرف دین ہیں اس لیے دونوں گروہ اپنی خواہشات کی طرف بلاتے ہیں لیکن آپ فرد واحد ہونے کی وجہ سے عقلاً بیک وقت یہودی اور نصرانی ہو ہی نہیں سکتے اور اس لیے یہ دونوں گروہ آپ سے کسی طرح راضی ہو ہی نہیں سکتے، اور شرعاً کیونکہ آپ کو رحمت الہی رسالت و نبوت کی شکل میں، اور فضل الہی وحی اور قرآن کی شکل میں، اور نعمت الہی عصمت و طہارت کی شکل میں ملی ہوئی ہے، اس لئے آپ ان کی اہوار و خواہشات کی پیروی بھی نہیں کر سکتے۔ اس تمہید کے بعد دونوں حاشیوں پر مختصر گفتگو کروں گا، تفصیل کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائے گی۔

ہدیٰ سے مراد اسلام تمام مفسرین کی رائے کے مطابق ہے، اور آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے یہود و نصاریٰ کی اہوار اور ملت کے مقابلے میں جس ہدایت الہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس طرح حصر کے ساتھ اور دوسرے ہدیٰ میں تعریف، الف لام کے ساتھ، اس سے واضح طور پر اسلام کا مراد ہے کہ وہی کلی ہدایت کی راہ ہے اور جس کی طرف یہ لوگ آپ کو بلاتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شروع کر دی تھیں، ساجراج کے خاتمہ کے بعد بھی مشکلات کے زیر سایہ بلکہ یوں کہیے کہ زندان و سلاسل کے اندر اور تلواروں اور پھانسیوں کی چھانوائیں شریعت اسلامیہ، قانون اسلامی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) وہ ہدی نہیں بلکہ ہونی کی راہ ہے۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بغير هُدًى مِّنَ اللَّهِ (قصص - ۵۰)، صرف مفسر طبری نے ہدی کا مفہوم اس طرح لکھا ہے: "ان بیان اللہ ہو البیان المقنع والقضاء الفیصل بیننا فہلوا الی کتاب اللہ و بیانہ، الذی بین فیہ لعباد ما اختلفوا فیہ، و هو التوراء الی تقرون جمیعاً بانہا من اللہ یتفجع لکم فیہا الحق منا من المبطل و اینا اهل الجنة و اینا اهل النار و اینا علی الصواب و اینا علی الخطاء؛ و انما امر اللہ بنیہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یدعوہم الی ہدی اللہ و بیانہ، لان فیہ تکذیب الیہود و النصاری فیما قالوا من ان الجنة لا یدخلہا الا من کان ہودا و نصاری، و بیان امر محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وان المکذوب بہ من اهل النار دون المصدق بہ" ترجمہ: "بیشک اللہ کا بیان ہی قانع کرنے والا ہے، اور فیصلہ کن ہے ہمارے درمیان، پس آؤ اللہ کی کتاب اور اس کے بیان کی طرف، جس میں اس نے بندوں کے لئے مختلف فیہ چیزیں بیان کر دی ہیں، اور وہ توراء ہے جس کے تم سب مقرر ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس میں تمہارے لئے واضح ہو جائے گا کہ ہم میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون، اور کون جنت والا ہے اور کون دوزخ والا، اور کون صحیح راہ پر ہے اور کون غلطی پر؟ اور بیشک اللہ نے اپنے نبی مکرم کو یہ حکم دیا کہ ان کو ہدایت و بیان الہی کی طرف بلائیں، کیونکہ اس میں یہود و نصاری کی تکذیب تھی اس قول میں جو انہوں نے کہا تھا کہ یہود و نصاری کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا، اور محمد کے معاملے کا بیان تھا اور یہ کہ اس کو جہنم لے والا آگ کا مستحق ہے نہ کہ اس کی تصدیق کرنے والا" طبری کا قول اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ غیر محرف اور منزل من اللہ توراء ہدایت کی کتاب تھی، لیکن مذکورہ بالا آیت کی تفسیر و تشریح کے اعتبار سے یہ قول مرجوح ہے، طبری کا یہ استدلال کہ یہود و نصاری کے قول (بقیہ اگلے صفحہ پر)



خدا کی کتاب اور رسول کی سنت پر حکومت کی بنیاد قائم کرنے کا پورا سیراب ہوتا رہا اور الحمد للہ اب بہت جلد وہ وقت آگیا ہے جب ساری دنیا کے مسلمان اسلامی قانون اور اسلامی نظام

(بقیہ ماشیہ صفحہ گذشتہ) لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوَ ذَا اِذْنٍ کا یہاں جواب ہے قرین تیس نہیں، کیونکہ اس کا جواب خدا نے پاک نے فرمایا ہی اس آیت کے بعد اس طرح دیدیا تھا، بَلَى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ اُجْرَةٌ عِنْدَ رَبِّهِ (بقرہ ۱۱۲-۱۱۳) دوسری بات یہ کہ جس ہدایت الہی کا تذکرہ اس آیت میں ہے اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو حضور کو دی گئی تھی اور آپ کے پاس موجود تھی اور وہ قرآن و اسلام ہے، کیوں کہ غیر معروف تورہ کا کوئی نسخہ حضور کے پاس موجود نہ تھا بلکہ آپ کی شریعت ساری شریعتوں کی ناسخ بن کر آئی تھی، تیسری بات یہ کہ آیت کے آخر میں جس علم الہی کے حضور کے پاس آجائے گا تذکرہ ہے اس سے مراد قرآن پاک، وحی اور اسلام ہی ہے، لیکن طبری کے قول سے بھی اہل اہوا کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ان پر مزید حجت قائم ہوتی ہے اور یہ حجت قرآن نے بار بار دوسری آیات میں قائم کی ہے اور اہل کتاب کو تورہ کی تحکیم کی دعوت دی ہے۔ لیکن آیت کے صاف اور راجح معنی وہی ہیں جو تمام مفسرین نے اختیار کئے ہیں، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: وَهُدًى اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی الَّذِیْ هُوَ الْاِسْلَامُ وَهُوَ الْهُدٰی ترجمہ: خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی اصل ہدایت ہے۔ صاحب بحر المحیط ابن حیان اندلسی لکھتے ہیں: هُدًى اللّٰہ، اِی الَّذِیْ هُوَ مَضٰنٌ اِلَی اللّٰہِ وَهُوَ الْاِسْلَامُ الَّذِیْ اَنْتَ عَلَیْہِ هُوَ الْهُدٰی النَّافِعُ التَّامُ الَّذِیْ لَا هُدٰی وِیْ اِثْنِیْ تَرْجَمَہُ: اللّٰہ کی ہدایت، یعنی وہ ہدایت جس کی اصناف (نسبت) اللّٰہ کی طرف ہے وہ اسلام ہے جس پر آپ ہیں، وہی اصل اور مکمل نفع پہنچانے والی ہدایت ہے جس کے علاوہ کوئی ہدایت نہیں۔ مفسر رازی کا بیان ہے: اِنَّ هُدًى اللّٰہِ هُوَ الَّذِیْ یُہْدِیْ اِلَی الْاِسْلَامِ وَهُوَ الْهُدٰی الْحَقُّ الَّذِیْ یُصْلِحُ اِنْ یَّتٰی هُدًى بِشَکِّ اللّٰہِ کِیْ ہدایت وہی ہے جو اسلام کی طرف ہدایت کرتی ہے اور وہی حقیقتاً وہ ہدایت ہے جس کو ہدایت کہا جاسکتا ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حیات کو دوبارہ نافذ اور جاری کرنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں، جنوب شرق ایشیا سے لیکر شمال افریقہ تک زندگی کی ایک نئی لہر نمودار ہے اور جذب و شوق میں ڈوبی ہوئی اسلامی اقدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان ہدی اللہ الذی ہوا الاسلام ہوا الحق ترجمہ: بیشک خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی حق ہے۔ ابن کثیر کا قول ہے: قل یا محمد ان ہدی اللہ الذی بعثنی بہ ہو الہدی یعنی الدین المستقیم الصبیح الکامل الشامل ترجمہ: کہہ دیں اے محمد بیشک وہ اللہ کی ہدایت جو لیکر اس نے مجھے بھیجا ہے وہی حقیقی ہدایت ہے، یعنی مستقیم، کامل صحیح اور ہر خیر پر شامل ہے۔ علامہ ابو عبد اللہ القرطبی کا ارشاد ہے ما انت علیہ یا محمد من ہدی اللہ الحق الذی یضعہ فی قلب من یشاء ہو الہدی الحقیقی، لاماید عیہ ہوا لہ جس ہدایت حقہ پر اللہ کی طرف سے تم ہو اے محمد، جس کو اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈالتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کی طرف یہ لوگ بلاتے ہیں۔

دوسرا حاشیہ یہ ہے کہ بغرض تم ان کی اموار کی پیروی کرو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کا خطاب کبھی حضورؐ سے ہوتا ہے لیکن مراد میں کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی ہے اور تین توجہیں ممکن ہیں، ایک تو یہ کہ خطاب آپؐ سے ہے لیکن امت کو تنبیہ کرنی مقصود ہے، دوسری یہ کہ خطاب ہی امت سے ہے، تیسری یہ کہ اسلام اور ہدایت الہی کی عظمت بیان کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں بلکہ مستحیل ہے، لیکن بغرض محال ایسا ہو جائے تو ولایت و نفرت سے محرومی ہو جائے، لیکن کیونکہ رسولؐ کے لئے یہ عقلاً و شرعاً مستبعد و مستحیل ہے، اس لیے امت کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں وہ اس مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ ان تینوں معانی کی مختصر سند صرف تین مفسرین کرام کے اقوال سے پیش کرتا ہوں ابن حبان لکھتے ہیں، والظاهر ان قولہ تعالیٰ ولن ترضی خطاب للنبی خلق من ضاہم عنہ بالمر مستحیل الوقوع منہ و هو اتباع ملتہم والمعلق بالمستحیل (بقیہ اگلے صفحہ)



کی محافظ فوج طفر موج، غنم عمل، زبان و قلم اور قانون کے ذریعے اتر آئی ہے اور محض اللہ کے فضل و کرم اور مخلصین و مومنین و مفکرین کے مسلسل اور منظم اور تعمیری جہاد بالقلم و انفس

(بقیہ ماضیہ صفحہ گذشتہ) مستحیل، وقیل ہو خطاب لہ و ہوتا دیب لامتہ، وقیل ہو خطاب لہ المراد امتہ ترجمہ: ظاہر یہی ہے کہ لن ترضی میں خطاب حضورؐ سے ہے۔ آپ سے ان کی رضامندی ایک ایسے معاملے پر معلق کی گئی ہے جس کا واقع ہونا آپ سے مستحیل ہے، یعنی ان کی ملت کی اتباع، اور مستحیل چیز پر جو چیز معلق کی جائے وہ بھی مستحیل ہوتی ہے۔ محمود آلوسی بغدادی قول الہی "مَالِكٌ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں والخطاب ایضاً الرسول اللہ و تقیید الشرط بما قید للدلالة علی ان متابعتہ احوالہم محال لانہ خلاف ما علم صحیحہ فلو فرض وقوعہ کما یفرض المحال لم یکن لہ ولی ولا نصیر ترجمہ: خطاب رسول خداؐ کی طرف ہے اور شرط کو مقید یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا کہ ان کی خواہشات کی پیروی آپ کے لئے محال تھی، کیونکہ یہ اس کے خلاف ہے جس کی صحت کا علم (تعلق) ہے، پس اگر بفرض یہ واقع ہو جائے جیسے کہ مستحیل مفروضہ واقع ہو جائے تو کوئی ولی اور نصیر نہ ہوگا۔ ابن کثیر کا قول ہے نہ یہ تمہید و وعید شدید للامۃ عن اتباع طوائف الیہود والنصارى بعد ما علموا من القرآن و السنۃ عیاداً باللہ من ذلک فان الخطاب مع الرسول والامم لامتہ ترجمہ: اس میں سخت تمہید اور شدید وعید ہے امت کے لئے کہ یہود و نصاری کے طریقوں کی پیروی کریں قرآن و سنت کا علم جاننے کے بعد، اللہ اس بات پناہ میں رکھے، یہ خطاب اس طرح رسولؐ کو ہے لیکن حکم امت کو ہے۔ علم سے مراد وحی، اسلام اور قرآن مفسرین نے بیان کیے ہیں، اور سب دراصل ایک ہی معنی میں ہیں، امام احمد بن حنبلؒ نے قرآن کو مخلوق کہنے والے کے حق میں کفر کا فتویٰ اسی آیت سے دیا تھا، فرمایا تھا قرآن علم الہی ہے مخلوق نہیں" (تفسیر قرطبی)

اس آیت کی مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام ہی راہ ہدایت (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی وجہ سے، اور عامۃ المسلمین میں بھڑکے تعالیٰ دینی بیداری کے سبب سے آج یہ انکار اہل حکومت و قانون تک پہنچ گئی ہیں اور ایک نئی سحر بیدار ہونے کے لئے بطن گیتی میں کروٹیں لے رہی ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے اور قیامت تک ساری انسانیت اس کے دامن میں سکون پاسکتی ہے، اور جو اہل کتاب حق و انصاف کے طریقوں پر سوچتے ہیں، ہدایت دل کے بند دروازوں کو ان کے لئے دستک دیتی ہے اور وہ اسلام کے نور سے منور ہو جاتے ہیں، اور اہل کتاب میں سے جو بھی اس دائمی نور و ہدایت کو قبول کرتا ہے اس کی بھولی رحمت و مرحمت کے دو خزانوں سے بھر لوہ طور پر معمور ہو جاتی ہے انقواللہ و آمنوا برسولہ یوتکم کفلین من رحمۃ ویجعل لکم نوراً التمشون بہ و یغفر لکم واللہ غفور رحیم مثلاً یعلم اهل الکتاب الا یقدسون علی شی من فضل اللہ (حدید - ۲۸-۲۹) ”اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تو دے گا تم کو رحمت کے دو حصے اور تمہارے لئے روشنی بنا دے گا کہ اس پر تم چلو، اور تمہیں بخش دے گا، اللہ غفور و رحیم ہے، تاکہ اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کا فضل حاصل کرنے پر قادر ہی نہیں ہیں، اور جو بھی کتاب کو حق تلاوت ادا کر کے پڑھے گا اور تعصب سے دور ہو کر سوچے گا اس پر حق واضح ہو جائے گا“ یتلونه حق تلاوتہ اولئک یومنون بہ (بقرہ - ۱۲۱) اور وہ زندگی کی اندھیروں والی راہوں کو چھوڑ کر شش جہت روشنی والی مستقیم شاہراہ پر چل کھڑا ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ خالق در عالم نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو جس عظیم خطرے سے پہلے دن سے واقف بنایا تھا وہ اپنی نادانی اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کو بھول گئے، اور یہود و نصاریٰ کی بین الاقوامی سازشوں اور مکر و فریب نے سامراجی دور میں اور اس کے بعد بھی اسلامی شریعت، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام حیات پر نئے نئے ناموں سے اعتراض کیے، انہوں نے نئے نئے لغو ایجاد کئے، زمین، زبان، ترقی و تمدن، ریسرچ وغیرہ لیکن ان سب کے پیچھے جو جہد کام کر رہا تھا اور کام کر رہا ہے وہ اسلام دشمنی ہے، اور دو ہزار سالہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)



اس سلسلے کی ایک عظیم کوشش یسوعیہ کی ایک عظیم قوم بھی اپنی نوجوان مسلم قیادت کے زیر اثر کر رہی ہے، اس کی کچھ تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اختلافات اور عظیم اختلافات جن کی رو سے حضرت مریم و عیسیٰؑ پر فحش بہتان تک یہود لگاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پوپ کی طرف سے مکرم کے مستحق ہیں اور بڑی حکومتوں کی طرف سے نوازشات کے قابل، اور ان کے تمام اختلافات اسلام دشمنی کے متحد محاذ پر ختم ہو گئے ہیں اور نام بدل بدل کر ان کی جو اسکیمیں اور پلان ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ وہ اس عالمی دعوت الہی کو چھوڑ دے اور اسلام سے دستبردار ہو کر یہودیت یا نصرانیت کو قبول کر لے۔ یہ حاشیہ اس بیان الہی پر ختم کرتا ہوں جس میں امت اسلامیہ کو دعوت الہی کا حکم بھی دیا ہے اور یہود و نصاریٰ کے دعوائے ایمان کا بطلان بھی کیا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعوے کی بھی قلعی کھولی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے اور انسانیت کے سامنے اسلام کے حقیقی معنی اس طرح سمجھائے ہیں کہ اسلام خدا کی اطاعت و عبادت، توحید اور تمام انبیاء و کتب پر ایمان کا نام ہے اور اس کل اسلام پر ایمان لائے بغیر اسلام و ہدایت کا دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ فیصلہ کن آیت ملاحظہ ہو: وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا تَهْتَدُوا، قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُتَشَكِّكِينَ، قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ إِسْمَاعِيلَ وَنُوحٍ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ تَسْكَفُفُكُمْ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (بقرہ - ۱۳۶ - ۱۳۹) ترجمہ: اور انہوں نے کہا (یہود نے کہا) کہ تم یہودی ہو جاؤ (اور نصاریٰ نے کہا) تم نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پا جاؤ گے، کہیں (نہیں) بلکہ (اتباع کرتے ہیں ہم) ملت ابراہیمی کی، جو صرف خدا کی طرف متوجہ بندہ تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسلامی اقدار کے اجبار میں دینی مدارس کا کردار | اسلامی اقدار کی بیداری اور اس نئے عزم کے سلسلے میں یہ حقیقت بیان کرنی ضروری ہے کہ بس طرح اسلامی تفکرات نے جوش اور اسلام کے لئے اخلاص پیدا کیا اسی طرح دینی اداروں اور تعلیم گاہوں نے اور خصوصیت کے ساتھ جامعہ ازہر نے اس سلسلے میں ایک تاریخی کام کیا ہے، وہ یہ کہ سامراج کے دور میں بار بار دینی تعلیم کو ختم کرنے یا بے اثر کرنے کی تحریکیں تجدید وغیرہ کے نام پر اٹھیں اور یہ اعتراض بھی اکثر مسلمانوں کے ذہن میں آنے لگے کہ فقہ اسلامی کے وہ ابواب جن پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے جیسے کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود وغیرہ وہ کیوں پڑھائے جاتے ہیں؟ اگر بات یہاں تک ہوتی اور اخلاص کے ساتھ ہوتی کہ دینی تعلیم کے اسلحہ کو بدلا جائے اور زمانہ سے جتنا ممکن ہو ہم آہنگ کیا جائے، ریسرچ و ابھارت کا دروازہ کھولا جائے، مقارنہ ادیان اور زندہ زبانوں کی تعلیم دی جائے، اجتہاد کی کوشش کی جائے، عوام کے لئے تو تقلید ضروری ہے لیکن مجتہد کے شرائط اہل علم میں پیدا کئے جائیں تاکہ وہ مسائل حاضرہ کے اسلامی حلول کتاب و سنت، اجماع و قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ کریں، جامعہ ازہر نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور مشرکین میں سے نہیں تھا، (اے مسلمانو) تم کہو، ایمان لائے ہم اللہ پر اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا، جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا، اور جو نبیا گیا موسیٰ و عیسیٰ کو، جو بھی دیا گیا سارے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ہم ان سے کسی میں (ایمان میں) فرق نہیں کرتے، اور ہم اس کے حکم بردار ہیں، پس اگر ایمان لائیں وہ ایسا ایمان جیسا کہ تم لائے تو وہ ہدایت یافتہ ہوئے اور اگر روگردانی کریں تو وہ اختلاف (اور ضد) پر ہیں، پس اللہ (ان کے مقابلے میں) تمہارے لئے کافی ہو جائے گا اور وہ مسیح و عیسیٰ ہے، (ہم اللہ کے) رنگ (دین) میں رنگ گئے ہیں، اور اللہ کے دین سے بڑھ کر اور کو نسا دین ہے، اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔



ان میں سے اکثر مطالبوں کو پورا بھی کیا ہے، یہ مطالبے نہ صرف یہ کہ جب ضروری تھے بلکہ اب بھی برصغیر کے دینی مدارس کے فرسودہ نظام تعلیم و تربیت و نصاب اور طور طریقوں میں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے اور اگر اخلاص کے ساتھ، انسانیت اور خود پسندی کے جذبہ ہائے غیر اسلامی کو پس پشت ڈال کر یہ کام علماء و مفکرین اسلام، اسلامی خطوط پر کریں تو بہت آسانی سے دینی تعلیم کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی دینی و فکری ضروریات کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے اور جگہ جگہ دینی مدرسوں اور مختلف نصابوں کے بجائے ایک ہی متحد نصاب کے ماتحت دینی تعلیم پروان چڑھ سکتی ہے اور اس کا انتظام و انصرام کسی بھی فرد واحد کے ہاتھ میں نہ ہو کہ فرد واحد اگرچہ عالم و فاضل اور صوفی و بزرگ ہو اس میں مطلق العنانی اور ڈکٹیٹر شپی کی خواہش نفس ابھرنے کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں، بلکہ بین الملکی علماء کی ایک مجلس ہو جو ملک کے سارے دینی مدارس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرے، یہ مجلس مخلص ہو، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرتی ہو، حق کی گواہ ہو اور اس بات نگہداشت کرے کہ کوئی مدرسہ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہو، اور افراد کی دوستی، شہرت اور پروگنڈہ اس مجلس کے لئے معیار نہ ہو بلکہ میزان حق ہو، اس طرح دینی مدارس ایک عظیم کردار ادا کر سکتے ہیں (بہر حال دینی تعلیم اور دینی مدارس کی اصلاح کا موضوع بہت طویل ہے کسی دوسرے موقع پر اسے چھیڑا جاسکتا ہے) بات یہ چل رہی تھی کہ اصلاح کا مطالبہ تو صحیح ہو سکتا تھا، لیکن یہ بات بالکل غلط تھی کہ اسلامی تعلیمات کے اصولی اور کل اجزاء اس لئے چھوڑ دیے جائیں کہ ملک میں رائج نہیں ہیں اور کتاب الہی کے وہ فقہی احکام جن کا رواج و نفاذ سامراج نے ختم کیا تھا اسلامی مدرسے اس کی تعلیم بھی ختم کر دیتے، یہ مطالبے نہیں مانے گئے اور نہ ان اعتراضات کی پرواہ کی گئی، دنیا جہان کے دینی مدارس کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے فقہ اسلامی و شریعت اسلامیہ کے وہ ابواب اور مسائل بھی ہمیشہ پڑھائے جو وقتی طور پر نافذ نہ تھے لیکن جن کے نافذ ہونے کی مستقبل میں امید تھی اور جن کے پڑھائے بغیر شریعت کاملہ کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، خصوصیت کے ساتھ جامعہ ازہر نے ہمیشہ مذاہب اربعہ کی

فقہ تحقیق و تفصیل کے ساتھ پڑھائی، تعصب اور دلائل کو زبردستی ٹھونسنے کی ضرورت اس لئے پیش نہ آئی کہ ایک ہی جگہ پر الگ الگ ہر مذہب فقہ کے طالب علم کے لئے اس کی فقہ پڑھنی ممکن ہے، دوسرے مذاہب کے مراجع اور علماء اسے دستیاب ہو سکتے ہیں اور متقارنہ و موازنہ کے ساتھ استنتاج و استنباط کی صلاحیت اس میں پیدا ہو سکتی ہے تو پھر اسے تعصب کی کیا ضرورت ہے؟ بہر حال ان مذاہب اربعہ کی تعلیم اور موازنہ کے باب میں دوسرے مذاہب فقہیہ کی بھی تعلیم جامعہ ازہر کا کارنامہ تھا اور ہے، ان فقہ اسلامی کے مذاہب اور غیر ملک میں غیر موجود وغیر معمول البواب فقہ کی تعلیم اور مشق سے یہ ہوا کہ جوں ہی اسلامی نظام زندگی اور اسلامی قانون کی گفتگو ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ مصر میں (جسے بعض علم سے نا آشنا اور خود فریبی میں مبتلا حضرات علم و تحقیق سے عاری ثابت کرنا چاہتے ہیں، علمی و تحقیقی کارنامے بجائے خود ان حضرات کا جواب پیش کرتے ہیں) ہزاروں اسلامی قانون کے ماہر پیدا ہو گئے، ازہری علیہ السلام نے قدیم علم کتاب و سنت و مذاہب فقہ کو پیش کیا، اور فقہ اربعہ سے مکمل واقفیت سے قبل کوئی شخص قانون اسلامی کے ماہر ہونے کا دعویٰ اگر کرے تو یہ دعویٰ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا، اور اسلامی تفکر کے زیر سایہ جموں، وکیلوں اور قانون دان حضرات نے اسلامی قوانین کا موازنہ عالمی قوانین سے کیا اور پلک جھپکنے میں اسلامی قانون عالم وجود میں آ سکتا ہے۔ اگر فقہ اسلامی کی تعلیمات گزشتہ دو سو برس میں کسی ایک مذہب فقہی کی باقی رہ جاتیں یا صرف عبادات وغیرہ تک محدود کر دی جاتیں تو فقہ اسلامی میں جمود آ جاتا اور ان موضوعات سے متعلق جو اسلامی ملکوں میں رائج نہیں تھے، نہ کتابیں چھپتیں نہ رسرچ ہوتی اور نہ وقت پڑنے پر پورے عالم اسلامی میں علماء و مفکرین فوج در فوج اس کام کے لئے نکل آتے، کہ گو اسلامی ملکوں اور قانونوں میں یہ چیزیں موجود نہیں تھیں لیکن اہل علم و ایمان کے سینوں اور سفینوں میں یہ دولت پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھی۔

اسلام ایک کمالی نظام حیات اور مکمل لائحہ عمل ہے | دراصل اسلام ایک مکمل اور ابدی دین ہے اور انسانی



حیات سے متعلق سارے شعبوں میں اس کی تعلیمات ایک فعال اور قوی اثر رکھتی ہیں، جس طرح اسلام انسان کو زندگی اور موت کی تمام حقیقتوں سے باخبر بناتا ہے بالکل اسی طرح وہ انسان کو عبادات و اخلاق سے لے کر معاملات و اجتماعیات تک میں احکام بھی عطا کرتا ہے۔ اسلام ایک کل ہے اس کی اتباع جزوی طور پر مجبوری کے حالات میں تو کی جاسکتی ہے، لیکن اس کو بروئے کار لانے کی کوشش اس کے لیے جو کر سکتا ہو اور نہ کرے ایک گناہ بھی ہے اور محرومی بھی ہے۔ اسلام صرف عبادات کا مذہب نہیں ہے اور نہ اسلام انسان کی ذاتی اور پرمایویٹ زندگی کا مسئلہ ہے، بلکہ اسلام کے احکام ایک مسلمان کے پورے کاروانِ حیات کو ساحلِ مراد سے ہم کنار کرتے ہیں۔

اسلام دنیا و آخرت، عبادات و اجتماع اور حکومت و قانون سب کا دین ہے اور ہر مسئلہ کا حل قیامت تک اس کی تعلیمات میں مل سکتا ہے، اسلام نے جس طرح نماز روزہ اور حج کے مسائل بیان کیے ہیں جو انسان کی ذاتی اصلاح اور تقویٰ میں مفید ہیں اور بندے کو اپنے آقا اور خالق و مالک کے دربار تک پہنچاتے ہیں، بالکل اسی طرح زکوٰۃ کے احکام کی تفصیلات، صدقہ، تبر اور خیرات کے سارے طریقوں کو واضح کیا ہے تاکہ اسلامی سوسائٹی ایک جسم بن کر رہے اور امیر و غریب کے درمیان وہ تفاوت اور نفرت پیدا نہ ہو جو غیر اسلامی سوسائٹیوں کا شعار ہے، اسلام نے اسی طرح سود، جوا، سٹے بازی، رشوت، اشیاءِ خور و دن میں بلیکس یا ذخیرہ اندوزی اور اس قبیل کی وہ ساری چیزیں منع کر دیں جن سے اقتصادی عالمی مشکلات پیش آتی ہیں، اسلام کا نظامِ اخلاق تاریخِ عالم کا مجرب اور بہترین نظامِ اخلاق ہے، اسلام نے چوری، ڈاکہ، زنا، بھوٹ، تہمت، قتل، تمام نشہ آور اشیاء اور ہر مخرّب اخلاق چیز پر پابندی لگا دی اور اصلاحِ قلب و نظر کے وہ تربیتی طریقے اختیار کئے جن سے قلب و نظر اور عقل و ضمیر کو آسودگی حاصل ہو اور سوسائٹی میں جرم کم سے کمتر ہوں۔

ان تمام اسلامی تدابیر اور اخلاقی وعظ و نصیحت، اور قلب و نظر کو اپیل کرنے والی

تعلیمات کے باوجود بھی جہاں انسان موجود ہیں وہاں گناہ ممکن ہے، وہاں جرم ہو سکتے ہیں۔ غیر اسلامی قانون تاریخ شاہد ہے کہ جوں جوں نئے سے نئے اور سخت سے سخت قوانین نکالتے ہیں اسی رفتار سے جرم کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے اور مجرموں کی پشت پناہی کرنے کا مرض بھی عام ہوتا جاتا ہے اور تمام قانونی و اخلاقی ادارے اپنی پامان کر بیٹھ جاتے ہیں اور جرم کی رفتار برق کی رفتار کی طرح بڑھتی جاتی ہے، جرموں کی سالانہ عالمی رپورٹوں کی ایک جھلک دیکھ کر ہر پڑھا لکھا شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ جرم کی رفتار، تعداد، نوعیت اور نئی اقسام میں کس طرح دن دہنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی جاتی ہے، اور جو ملک جتنا زیادہ ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ، اور متمول و غنی ہے، سعادت قلب اور سکون حیات سے اسی کے بقدر دور ہے اور اخلاقی مسائل اور جرموں کی کثرت و جدت کے سامنے بے دست و پا ہے۔

اسلامی نظام اخلاق اور قانون حیات سب سے پہلے انسان اور اصلاح انسانی کا اسلامی طریقہ | سوسائٹی کی اصلاح ان خطوط پر کرتا ہے جہاں اس کے قلب و نظر میں مادہ کے شیطان کے بجائے روح کے خالق خدا نے وحدہ لا شریک لہ کا تصور بٹھاتا ہے اور اس تصور کے لئے وہ شرک کی آمیزش کو پسند نہیں کرتا کہ تصور خالق کے بجائے تصور مخلوق کی تعلیم سے ابتدا کرے، رسول پاک نے براہ راست خدا کا تصور پیدا کیا تھا حتیٰ کہ رسولؐ تک تربیتی طریقے کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا تھا کیونکہ ربانی طریقہ تربیت یہی تھا، اور رسول خداؐ کو حکم بھی اسی کا ملا تھا، **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ** (قرآن ۱۸۶) کا مطلب بھی

۱۔ پوری آیت اور ترجمہ یہ ہے: **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا فَلْيَسْجُدْ بِلِيٍّ وَلْيُؤْمِنُوا بِلِيٍّ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ** (اور اگر تم سے میرے بارے میں متعلق ہو تو میں نزدیک ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دے تاہم میں قریب وہ پکارے، پس انہیں پابند ہے کہ میری حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ ہدایت پاویں)



یہی ہے، مُخْلِصِينَ لِّلْ دِينِكَ (۱۱)۔ ۵) مفہوم بھی یہی ہے، وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ مِنَ الظَّالِمِينَ، وَإِنْ تَتَسَوَّكَ اللَّهُ بِخَيْرٍ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَافِعَ لِفَضْلِهِ (پرس ۱۰۵-۱۰۷) کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ اسلام خدا کے اس تصور کے ذریعے دنیاوی زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے

۱۔ پوری آیت اور ترجمہ پیش ہے: وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ خُنْفَاءً يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (اور ان کو صرف یہی حکم ملا تھا کہ عبادت کریں اللہ کا فالص کر کے اس کے لئے بندگی کو، عنیف بن کر (صرف خدا کی راہ مستقیم پر چل کر)، اور قائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ اور سیدھا دین ہے۔

۲۔ آیت نمبر ۱۰۵ اور پر لکھنی رہ گئی تھی وہ اور تینوں آیتوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو، اور یہ خیال رہے کہ خطاب افضل البشر سے ہے، وَأَنْ أَقْبَلَ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (اور اپنے چہرے کو متوجہ کرو (زندگی کے رخ کو قائم کرو) دین پر عنیف بن کر، اور مشرکین میں سے نہ ہو اور اللہ کے سوا کسی ایسے کو نہ پکارو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتا اور نہ نقصان، اور (بغرض محال) تم ایسا کرو تو اس وقت تم ظالم ہو گے، اور اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچا دے تو اس کو دور کرنے والا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں، اور اگر وہ تمہارے لئے بھلائی چاہے تو اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں) اور یہ بات واضح رہے کہ رسول پاکؐ نہ شرک کر سکتے اور نہ ظلم، اس لئے اس آیت میں بہت بلیغ طریقے پر امت کو شرک کی ہر آمیزش سے باز رہنے کا صریح حکم دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت بھی واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ اگر عفو کا حق، خیر پہنچانے اور شر دور کرنے کا حق کسی بھی بشر کو مل سکتا تھا تو وہ افضل البشر محمدؐ ہی ہو سکتے تھے جب آپ کو بھی یہ حق عطا نہیں کیا گیا بلکہ یہ صرف خدا کی قدرت میں ہے، تو پھر کبھی دوسرے شخص کے لیے اس کا دعویٰ کرنا یا عقیدہ رکھنا سخت نادانی اور محرومی کی بات ہے، اس لئے اے مسلمانو صرف اللہ سے مانگو اور اسی سے توبہ کرو اور اسی کا کامل تصور اپنے دل میں بٹھاؤ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور جانوروں کی طرح کھانا پینا اور مرجانا نہیں بتانا، اور تصور حیات میں پیٹ اور روٹی کا مقام وہی متعین کرتا ہے جو اس کا اصل مقام ہے، قلب و نظر اور عقل و دماغ کے بعد، اور خدا کی رضا ہی

(بقیہ ماضیہ صفحہ گزشتہ) اور اس کی بتائی ہوئی مستقیم راہ پر چلو اور انسانیت کو توحید کی دعوت دو اور شریعت الہیہ کو اخلاص کے ساتھ قائم کرو اور کچھ کوتاہی اگر رہ جائے تو معافی کے لئے اس کے رحیم و شفیع دربار کے سوا کسی دربار، مسند اور آستانے پر نہ جاؤ۔

کتب حدیث میں ایک دعا وارد ہے جسے حضور رسالتؐ ہر نماز میں تشہد کے بعد اور سلام سے پہلے پڑھا کرتے تھے، اس میں خدائے پاک کی قدرت و عظمت کا بیان ہے اور نفع یا نقصان پہنچانے کے سلسلے میں کسی بھی بشر یا غیر اللہ کی نفی اس طرح کی گئی ہے: لا اله الا الله وحده لا شریک له، له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير، اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطل لما منعت ولا ينفع ذا الجند منك الجند ترجمہ: خدا کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے، کوئی اس کا مطلق شریک نہیں ہے، صرف اسی کی بادشاہت اور ملکیت ہے، اور صرف اسی کے لئے حمد و ستائش ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ، جس چیز کو آپ عطا کرنا چاہیں اسے روکنے والا کوئی بھی نہیں اور جسے آپ روکنا چاہیں اسے دینے والا کوئی نہیں ہے، اور کسی غنی کو اس کی غنا آپ کے مقابلہ میں فائدہ نہیں پہنچا سکتی (یعنی صالح اعمال کام آئیں گے یا تیری رضا و رحمت)

نیز حدیث جبریل علیہ السلام میں صاف الفاظ مقام احسان سے متعلق یہ وارد ہوئے ہیں، ان تعبدوا ربکم کانکم تراء فان لم تکن تراء فانہ یراء مقام احسان کی ابتدا یہ بتائی کہ اس بات پر یقین ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور انتہایہ بتائی کہ خدام کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کی عبادت اس دنیا میں ان آنکھوں سے اہل سنت کے نزدیک ممکن نہیں۔ اس لئے دیکھنے کے بازی معنی تصور کرنے ہی کے لئے جائیں گے، احسان کی ابتدا، وسط اور انتہا (بقیہ اگلے صفحہ)



حاصل کرنا اس زندگی کی سعادت بتاتا ہے، اپنی جان اور مال سب کا مالک وہ خدائے ذوالجلال کو ثابت کرتا ہے اور پھر مسلمان خدا کے رسول کی بتائی ہوئی مکمل خدائی تعلیمات پر

(بقیہ ماضیہ صفحہ گزشتہ) کسی بھی ایٹم پر یہ نہیں بتایا گیا کہ افضل الملائکہ جبریل امین یا افضل البشر خاتم الرسل والانبیاءؑ کا تصور اپنے دماغ اور دل میں بٹھاؤ، پھر پتہ نہیں کیسے اور کیوں مخلوق کا تصور مقام احسان کے ساکین کے لئے جائز قرار دیا گیا ہے؟ اور یہ حجت کہ بے شمار تصوروں سے مالک کو ہٹا کر پہلے ایک شیخ کا تصور بٹھا دیا جائے پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا، یہ حجت اگر شرعاً مستحسن ہوتی تو انبیاء کرام کے سلسلہ ذہب میں سے کسی بھی نبی یا رسول کی تعلیمات میں یہ دعوت ضرور ہوتی کہ اصنام و انکار سے تصور کو ہٹا کر کسی فرشتہ یا نبی کا تصور بٹھاؤ کیونکہ پھر اس کو ہٹا کر خدا کا تصور بٹھانا آسان ہوگا، اس کے برعکس تعلیمات انبیاء میں و د و سواع یعوث یعوق و نسر جیسے صالحین کے تصور کو بٹھانے سے جو نقصانات ہوئے ان کی طرف اشارہ ہے اور قرآنی و نبوی تعلیمات میں کثرت کے ساتھ براہ راست خدا کی عبادت، تصور اور ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ اور عقلی طور پر بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اور مخلوق کا ناقص تصور جب پختہ ہو جائے تو اس کو ہٹا کر خالق کا لا محدود اور کامل تصور بٹھا دیا جائے کیونکہ دونوں تصوروں میں کوئی مناسبت ہی نہیں یہ انسان کا تصور ہے جو مخلوق، محدود، غیب سے ناواقف، نیند، ضعف، مرض اور موت سے متاثر ہونے والا ہے، وہ خدا کا تصور ہے جو خالق لا محدود، عالم الغیب ہے، نیند، ضعف، مرض اور موت سے متاثر ہونا تو درکنار ان کو پیدا کرنے والا ہے، اور مخقر عبارت میں یہ کہ ”لیس کمثلہ شیء“۔ تاریخی و عقلی حیثیت سے یہ بات قابل دید و لائق عبرت و بصیرت ہے کہ مسیحی قوموں نے جب ایک بار انسانی تصور پر عقیدہ و اصلاح نفس کی بنیاد رکھی تو اب کامل تصور تک پہنچنے کی راہ میں سینکڑوں برس سے عقلی، علمی اور عقائدی ان گنت مشکلات کا سامنا کر رہے تصور الوہیت اور دین کو کرنا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایمان و یقین کے ساتھ عمل شروع کر دیتا ہے، اور زندگی کی شاہراہ میں وہ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے کہ کہیں غار زار راہ سے دامن نہ الچھ جائے۔

اسلامی قانونِ شریعت ہر انسان کے لئے اس کے فطری تقاضوں کو دبانے کے بجائے ان کو جائز طریقوں پر پورا کرنے کے وسیلے بہم پہنچاتا ہے بلکہ اکثر جگہ ان پر ابھارتا ہے اور غیر فطری زندگی کو رہبانیت، جوگیت اور غیر اسلامی زندگی ثابت کرتا ہے، اسلام ایک مقتول شخص کے ولی کو قصاص عادل کا حق عطا کرتا ہے، ایک نوجوان شخص کو حلال طریقے پر شادی کی رغبت دلاتا ہے، ایک غریب شخص کو محنت اور عمل پر ابھارتا ہے، حکومت پر یہ واجب بناتا ہے کہ وہ ہر غریب، فقیر، مریض، مقروض اور پریشان حال کی دیکھ بھال کرے، اجتماعی تعاون، ہمدردی اور مدد کی اپیل کرتا ہے، اور پوری زندگی کو حسن و جمال سے مربوط بناتا ہے، انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے اور رضوری و جمہوریت کے تقاضوں سے آشنا بناتا ہے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ ماضیہ صفحہ گزشتہ) پڑ رہا ہے، اور مخلوق و عبد سے مجرد ہو کر خالق و معبود کا تصور ان کے ذہنوں میں بیٹھ ہی نہیں پار رہا ہے، اور تاویلات کے چکر اور اسرار کے کبھی نہ حل ہونے والے پھندوں میں وہ گرفتار ہو کر خدا اور دین دونوں ہی کو عملاً خیر باد کہہ چکے ہیں۔

علم و تحقیق سے مالا مال۔ ہر صاحب ایمان کے لئے خاصہ کی جیسر۔ دلچسپ اور بصیرت افروز۔

ماہنامہ تجلی دیوبند کی ایک نئی اہم پیشکش

جولائی ۱۹۷۷ء کے آخری ہفتے میں آئے گی

تین روپے

سالانہ چندہ:۔۔۔ پندرہ روپے۔ سالانہ خریداروں کو یہ نمبر ان کے چندے ہی میں ملے گا

ہمارا پتہ:۔۔۔ تجلی آفس: دیوبند دیوبند



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱۰)

از سعید احمد اکبر آبادی

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت مارچ ۱۹۴۳ء

ہندوؤں کے لئے ایک یونیورسٹی "بنارس ہندو یونیورسٹی" کے نام سے چار برس پیشتر یعنی ۱۹۱۶ء میں بن چکی تھی، اور اس کے لئے ایکٹ کا جو ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا، ہندو مسلم کے فرق کی رعایت سے وہی ڈھانچہ تھا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے لئے بنایا گیا۔ چنانچہ اسی ایکٹ اور اس کے ملحقہ قوانین و ضوابط (Statutes and ordinances) میں اس امر کی صراحت تھی کہ علی گڑھ میڈن کالج ہی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تعلیم اور انتظام کے اعتبار سے جو اغراض و مقاصد کالج کے تھے وہی اغراض و مقاصد اب یونیورسٹی کے ہوں گے۔ چنانچہ یہاں جدید اور مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ مسلمان طلباء کے لئے دینیات ایک لازمی مضمون ہوگا۔ انتظامی اعتبار سے یہ بات بہت اہم ہے کہ اسی میں اس بات کی بھی صراحت تھی کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے بڑی اور موثر مجلس حاکمہ ہوگی، اور اس کا ممبر کوئی غیر مسلم نہ ہو سکے گا۔ وائس چانسلر براہ راست کورٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا، اور یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے علاوہ کورٹ میں جن جماعتوں کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی وہ حسب ذیل تھے :

(۱) بانی ممبران یعنی یونیورسٹی ناؤنڈیشن کمیٹی کے ممبر جن کی تعداد ایکٹ کے نفاذ کے وقت ۱۲۳ تھی۔

(۲) لائف ممبر یعنی وہ لوگ جنہوں نے کالج کو ایک لاکھ روپیہ نقد یا اتنے ہی کی جائیداد دی ہو۔

(۳) وہ افراد جو یونیورسٹی کی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی امداد کرنے والی ریاستوں کے نمائندہ ہوں

(۴) علی گڑھ کے اولڈ بوائز۔

(۵) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(۶) دس افراد جو وائس چانسلر کے نامزد کردہ ہوں۔

(۷) ۳۳ افراد کا انتخاب خود کورٹ کرے گی اور یہ افراد (۱) اسلامیہ کالجوں یا مسلم تعلیمی اداروں کے نمائندہ ہوں گے، ان کی تعداد ۹ ہوگی (۲) پندرہ افراد مختلف علوم و فنون کے ماہر ہوں گے (۳) ۹ افراد دینیات اور اسلامی علوم و فنون کے ماہر ہوں گے۔ کورٹ کے بعد اکڑ کٹو کونسل کا نمبر آتا ہے، اس کے لئے ممبروں کی تعداد تیس رکھی گئی تھی اور اس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی۔

(۱) وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، ٹریژرر اور یونیورسٹی کے کسی کالج کا پرنسپل۔

(۲) چھ ممبر اکڈمک کونسل کے نامزد کردہ۔

(۳) باقی بیس ممبر کورٹ کے انتخاب کردہ ہوں گے۔

کورٹ اور اکڑ کٹو کونسل ان دونوں کی ہیئت ترکیبی پر غور کیجئے! صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی اصلاً و اساساً مسلمان طلباء کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی اور یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ تھی اور سرمایہ بھی مسلمانوں کا فراہم کیا ہوا تھا اس بنا پر حکومت وقت نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کا دروبست اور انتظام و انصرام بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا



چاہئے۔

ایک سوال اور اس کا جواب | اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریز اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ دو خود مختار (Autonomous) یونیورسٹیاں قائم کر کے ملک کے دو بہت بڑے فرقوں میں باہم کشیدگی اور فرقہ پرستی پیدا کرنا چاہتے تھے؟ آج کل کے بہت سے مدعیان قوم پرستی تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیں گے اور استدلال میں کہیں گے کہ ”چنانچہ دیکھ لیجئے! ہندو بنارس یونیورسٹی ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سبھک سنگھ کا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کا مرکز بن گئیں اور اس طرح انگریز کی ہندی سیاست جو ”ٹھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے اصول پر قائم تھی کامیاب رہی۔

لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا ہی غلط اور لغو ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ مذہب سے انسانوں میں ایک دوسرے سے نفرت پھیلتی، کشیدگی بڑھتی اور لڑائیاں برپا ہوتی ہیں، انگریز سیاست میں کتنے ہی مستبد اور سخت مزاج ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جیسا کہ جون گنٹر (John Gunther) نے اپنی معرکہ الآرا کتاب ”ان سائڈ افریقہ“ (Inside Africa) میں مراکش پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: فرانسیسی استعمار بڑا ظالم اور بے رحم ہوتا ہے وہ اپنی زیر دست قوموں کو اپنی تہذیب میں جذب کر کے ان کی اپنی زبان، کلچر اور تہذیب سے تہی مایہ کر دیتا ہے، لیکن برطانوی استعمار سیاست میں عیاری اور بازیگری کے با وصف مذہب اور تہذیب کے معاملہ میں تنگ حوصلہ اور تنگ نظر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر انگریز ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنے ملکی اور قومی معاملات میں اس وقت تک خواہ مخواہ کے ساتھ دلچسپی نہیں لے سکتی جب تک کہ اس کو اپنے تہذیبی، اخلاقی اور آزادی اور استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملے، اس کے برخلاف جس قوم کو جبر و تشدد یا حکومت کی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ اس کے تہذیبی ورثہ و اثاثہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ سیاسی مجبوری اور بے بسی کے باعث اس وقت تک رہت کہ کوئی نقصان نہ پہنچا سیکے لیکن

یہ صورت حال دیر پا نہیں ہو سکتی۔ جبر و تشدد کی چٹان کے نیچے عمومی و ناگاہی کے احساس کی چگاریاں اندر ہی اندر ملگتی رہتی ہیں اور آخر ایک وقت آتا ہے جب یہ لاوا پھٹتا ہے تو جبر و تشدد کی چٹان پھک سے اڑ جاتی ہے، یہ ایک فلسفہ نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے، ابھی اپنے سامنے کی بات ہے، الجزائر کی سرزمین لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگین ہوئی تب وہ آزاد ہوا۔ لیکن افریقہ اور ایشیا میں برطانیہ اپنے مستعمرات سے دست بردار ہوا تو اس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ کہ دنیا حیران اور انگریزوں کی فراست و تدبیر کی قائل ہوئی علاوہ ازیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ علی گڑھ اور بنارس کی طرح شانتی کمیٹیاں بھی تو آخر ایک تہذیبی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی نے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی باہم محبت و رفاقت اور خیر سگالی و خیر اندیشی کے جذبات پیدا کئے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح امریکہ اور یورپ میں بیسیوں یونیورسٹیاں ہیں جو عیسائی تہذیب کی نمائندہ سمجھی جاتی ہیں، لیکن کیا کبھی کسی نے کہا کہ ان سے فرقہ پرستی کو فروغ دیتا ہے، پھر مسلمانوں کے عہد عروج و ترقی میں غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اور الحمرا وغیرہ میں خالص اسلامی یونیورسٹیاں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھیں، یہود اور نصاریٰ اور دوسرے مذاہب کے طلباء بھی دور دور سے آتے اور ان یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے، لیکن کیا کبھی کسی نے شکایت کی کہ غیر مسلم ہونے کے باعث اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا۔

ہیں اس سے انکار نہیں کہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان دونوں اداروں میں تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ سیاست کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے کا موقع ملا ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان اداروں نے فرقہ وارانہ سیاست کو جنم دیا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ملک میں سیاست کا رنگ جو کچھ بھی رہا ہے یہ دونوں ادارے اس سے متاثر رہے ہیں اور یہ ایک امر ناگزیر و لا بدی تھا، چنانچہ ملک میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو علی گڑھ اور ان کی شکل میں اس کو لیڈر شپ علی گڑھ سے ملی، پھر تحریک آزادی کے آغاز کا زمانہ



آیا تو جس مرد مہار نے ملک میں سب سے پہلے مکمل آزادی کا رزلوشن پیش کیا اور مستعمراتی آزادی کا تصور کی سخت مخالفت کی وہ (یعنی مولانا حسرت موہانی) اسی علی گڑھ کی آغوش تربیت کا پروردہ تھا، اس کے بعد یہ امر بھی تھا کہ تحریک پاکستان کا ظہور ہوا تو نواب زادہ لیاقت علی خاں اور نواب محمد اسماعیل دھیرو جیسے لیڈر بھی علی گڑھ نے ہی مہیا کئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ملک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، علی گڑھ ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں ہر قسم کے اوزار اور کل پہننے ڈھلتے ہیں اور بتقاضائے وقت مسلمانوں کو جس قسم کی لیڈر شپ درکار ہوتی ہے اس کا ساز و سامان یہیں سے ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اس درس گاہ کے نہایت لائق اور قابل فخر فرزند تھے۔ ۱۹۲۶ء میں جب وہ وفد خلافت کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے تو اس موقع پر بھی میں ایک نہایت عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ میری عمر ۱۸-۱۹ برس کی تھی۔ دیوبند میں دورہ حدیث سے فارغ ہو چکا تھا اور اس وقت میں بھی والدہ مرحومہ کے ساتھ حج کے لئے جا رہا تھا، چنانچہ جہاز اکبری جس سے وفد جمعیتہ العلماء اور وفد خلافت کی روانگی ہوئی اسی سے میں بھی گیا تھا اور یہی ہے اس جلسہ میں موجود تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شدھی اور سنگٹھن کی تحریک نے ملک میں فرقہ وارانہ فضا کو نہایت مسموم کر رکھا تھا اور متعدد شدید قسم کے فسادات ہو چکے تھے، اس بنا پر مسلمانوں میں بہت جوش و خروش تھا۔ آج اس واقعہ کو ۴۷ برس ہونے کو ہو گئے، لیکن جلسہ کا کیا سماں تھا! اب بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے بالکل کل کی سب بات معلوم ہوتی ہے، عشاء کے بعد کا سہانا وقت، چاندنی رات، ایک طرف سمندر کی موجیں ہیں کہ اچھل کود اور آپس میں چھلیں کر رہی ہیں اور دوسری طرف انسانوں کا بحر بے کراں ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، مولانا محمد علی اپنی نورانی شکل و صورت، دیوبند کی جم و جتہ اور عبا و جتہ کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے شیر عین کی طرح گرج رہے ہیں، ہندوستان کی اس وقت کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور شدھی سنگٹھن کی تحریک اور اس کے ثمرات کا ذکر آیا تو خود اعتمادی کی دنگ آواز میں بولے:



ہندو بھائیو! میں نے تو تمہاری طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھو جو ایک دوست دوسرے کی طرف بڑھاتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ ہم سے بڑھکر تمہارا کوئی مخلص اور سچا دوست نہیں ہے، اور اگر تم چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھو جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو معلوم ہوگا کہ ہم پہلوانی میں بھی پیٹے نہیں ہیں اور ہمیں کشتی لڑنی آتی ہے۔ مولانا کی زبان سے ایک خاص جذباتی انداز میں ان فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ پورا میدان اللہ اکبر کے فلک شکاف مغروں سے گونج اٹھا۔

میں نے ان جملوں کو سن کر اس وقت بھی محسوس کیا تھا اور آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ دم خم علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے کے ہی ہو سکتے ہیں، آپ اگر چاہیں تو اسے ”فرقہ پرستی“ کہہ لیجئے۔ لیکن عنعان کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں۔ مولانا محمد علی نے جو کچھ فرمایا وہ اسلام کی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے خدوخال کے عین مطابق ہے، حبش کے بادشاہ نجاشی نے مکہ کے مسلمان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا تو مسلمانوں نے اس کا بدلہ اس طرح دیا کہ جب اس کے ملک پر حملہ ہوا تو مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں شامل ہو کر شجاعت و سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ اہل ملک بھی عیش عیش کرنے لگے، اور صرف یہی نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے لئے احسان شناسی کا مظاہرہ اس طرح فرمایا کہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔

مے مجھے یاد ہے، اسی تقریر میں مولانا نے مصر کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: لوگو! تمہارا پاس فرعون بھی ہے اور موسیٰ بھی! اب اگر تم کو فرعون پر غرور ناز ہے تو پہلا تم سے کوئی قتل اور کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن اگر تم کو فرعون ناز موسیٰ پر ہے کہ وہ تمہارے ملک میں پیدا ہوئے تھے تو بے شک تم ہمارے بھائی ہو۔



یہ تصویر ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد بھی مکہ کے کفار نے مسلمانوں کو نقصان اور اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مدینہ کے ہجرت سے ساری زندگی، عرب قبائل کو ان کے خلاف اکسایا اور ابھارا تو آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تلوار اٹھالی اور پھر یہ تلوار اس وقت تک نیام میں نہیں گئی جب تک کہ فرقہ کی صورت میں ان لوگوں کا قطع قلع نہیں ہو گیا۔ جو لوگ علی گڑھ یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں ان کو اسلامی تہذیب اور اسلام کے نظام زندگی کا مطالعہ اس کی اصل اس پر میں کرنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ سرسید پر یا علی گڑھ یونیورسٹی پر اگر کبھی کوئی ایسا دور آیا ہے جب کہ وہ آٹھ کل کی اصطلاح میں ”فرقہ پرستی“ کا شکار ہو گئے ہیں تو اس کے اصل اسباب و دواعی کیا تھے؟ اور اس کی ذمہ داری ”البادی اظلم“ کے مطابق اولاً و اصلاً کس کے سرمائد ہوتی ہے؟ آپ کہیں گے: ایک چھوٹا سا سوال اور اس کا جواب اس قدر طویل! اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد کے علی گڑھ کو آپ اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تقسیم سے پہلے کے علی گڑھ کو آپ اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور اس سے متعلق اپنے ذہن کو صاف نہ کر لیں۔

۱۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ تحریک میں) نے بالکل صحیح لکھا ہے: ”سرسید نے شرع سے آخر تک قرینہ و تقریر سے، برتاؤ سے، کالج کے ذریعہ، ہرجا اور ہمہ وقت ابنائے وطن کو اپنانے کی کوشش کی اور اخلاص و یگانگت کے اظہار میں وہ سب کہتے اور کرتے رہے جس کا مشرعی بھی غیر مسلم لیڈروں میں کسی نے مسلمانوں کے حق میں ضرر سے لے کر گاندھی جی کے وقت تک نہ کیا نہ کہا، ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو چھوڑے وطن پر غالبانہ رکھنے کا عقیدہ سرسید کے دل میں کس قدر راسخ تھا اس کا اندازہ ان کی مشہور تقریر سے ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں اس طرح کی تقریر سرسید کے پایہ کے غیر مسلم لیڈروں نے بھی کی ہوتی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور تقدیر دونوں آج کچھ اور ہوتیں۔“



یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقسیم سے پہلے یہاں جو کچھ ہوا اچھا اور برا  
 اس میں کوئی برائی یا خرابی نہیں تھی، نہیں! بلکہ اس میں بہت نامناسب اور ناقص بات نائنڈی  
 کی باتیں بھی ہوئیں، لیکن آج ہم اپنے برادران وطن سے کہتے ہیں کہ امنی میں جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا  
 اس میں نہ تمہارا دامن پاک ہے اور نہ ہمارا۔ اب آؤ! ہم تم دونوں ملکر جھڑکتے ہیں کہ  
 آئندہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حق اور انصاف کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور  
 کبھی فرقہ پرستی کا بھرنے نہیں دیں گے، اگر ملک کے ان دونوں بڑے فرقوں میں یہ عہد  
 و پیمان ہو جائے تو دنیا دیکھے گی کہ مسلمان کا قدم اس راہ میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی  
 ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی سطور بالا میں عرض کیا گیا، علی گڑھ جس اسلامی تہذیب کی نمائندگی  
 کرتا ہے اس کا یہی تقاضا اور یہی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جو غیر مسلم طلباء اور جو غیر مسلم اساتذہ  
 آج یونیورسٹی میں رہتے ہیں ان سے دریافت کر لیجئے کہ کیا وہ یہاں اس طرح نہیں رہتے جس  
 طرح وہ اپنے گھروں اور خاندانوں میں رہتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی  
 امتیازی سلوک برتا گیا ہے؟ کیا وہاں مسلمان طلباء اور اساتذہ ان کی شادی اور غمی میں  
 برابر کے شریک نہیں ہیں، کیا ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور دوستانہ نہیں ہیں؟  
 مسلمانوں میں یہ وسعتِ قلب، اپنے ساتھی اور پیڑوسی کا خیال، اس کا احترام اور اس  
 کی دلجوئی اور مدارات! یہ سب دین ہے اس تہذیب کی جس کا علمبردار علی گڑھ ہمیشہ  
 سے رہا ہے اور آج بھی ہے۔

بہر حال ۱۹۴۷ء میں یہ یونیورسٹی عالم وجود میں آئی اور اس طرح ملک کی  
 یونیورسٹی کے ۲۲ برس تقسیم اور آزادی کے حصول تک اس نے اپنی زندگی کے ستائیس برس  
 گزارے تھے، اس زمانہ میں وائس چانسلر کا ابتدائی تقرر تین برس کے لئے ہوتا تھا اور اس  
 کا انتخاب دوبارہ ہو سکتا تھا، لیکن علی گڑھ چونکہ صرف ایک تعلیم گاہ نہیں بلکہ ایک تحریک تھا  
 اور یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنی جاتی تھی اس بنا پر



اس کی ایک کڑی حالتیں چائسلر ہوتا تھا ملک میں اس کا بڑا اقدار اور بھرم ہوتا تھا اس لئے اس  
 عہد کے لئے جس شخص کا بھی انتخاب ہوتا تھا اس کی شخصیت، علم و عمل اور کیرکٹر کے لحاظ سے  
 نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ گورنمنٹ کے ہاں بھی بہت نمایاں ہوتی تھی۔ چنانچہ راجہ محمود آباد  
 صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر اس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، سر شاہ محمد سلیمان، نواب  
 سر مزل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں، جو اس دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آگے  
 پیچھے (یہ نام غیر مرتب ہیں) وائس چائسلر ہوئے۔ یہ سب نہایت عظیم شخصیت کے اور  
 ملت اسلامیہ ہند کے مایہ ناز شاہ فرزند تھے، ایک طرف ان کی قابلیت اور علم و فضل کا یہ  
 عالم تھا کہ جس مجلس میں ہوتے میر مجلس ہو کر رہتے، سر اس مسعود کو جن لوگوں نے دیکھا  
 ہے ان کا بیان ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اہل زبان کی طرح بولتے، ہر موضوع پر بے تکلف  
 اور برجستہ فصیح و بلیغ تقریر کرتے۔ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار  
 بر لوک زبان تھے۔ جستہ جستہ ان کو پڑھتے، ان کی تشریح کر کے ان کا حسن و قبح بیان کرتے  
 تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضیات میں اور سر شاہ  
 محمد سلیمان سائنس میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے اور دوسری جانب بڑے پکے اور سچے  
 مسلمان تھے، نماز روزہ کے پابند اور اسلامی شعائر و روایات کے دلدادہ تھے۔ صاحبزادہ  
 آفتاب احمد خاں پنجوقتہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کرتے اور معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ شہد کی  
 نماز تک کے پابند تھے۔ ان حضرات کا کردار، کیرکٹر اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ سر شاہ سلیمان  
 دہلی سے جہاں وہ ہائیکورٹ کے جج تھے، ہر سہفتہ علی گڑھ آتے تھے تو آمد و رفت کا کرایہ اور  
 علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں کھانے پینے کا خرچ بھی خود برداشت کرتے تھے اور اپنی ذات  
 کے لئے یونیورسٹی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہیں تھے، سر شاہ سلیمان کو ہم نے بھی  
 دیکھا ہے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے، الشداکبر کیا عجیب و غریب شخصیت  
 تھی، ہر شخص بھی ان کے پاس بیٹھتا ان کی طرف غیر معمولی کشش محسوس کرتا تھا۔ مجھے ذاتی طور



پر ان کے اور ان کے گھر کے بعض ایسے واقعات معلوم ہیں جن کے باعث میرا خیال ہے کہ اخلاقی اور روحانی و باطنی اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ان کے خدایہ سیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، راجہ محمود آباد، نواب سر منزل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں اسلامی شان و اخلاق اور اسلامی تہذیب کے اقدار عالیہ کے حامل اور صحیح معنی میں اس کے نمائندہ تھے۔ ان حضرات کے شب و روز مسلمانوں کی صلاح و بہبود اور ان کی مخلصانہ خدمت کے لئے وقف تھے اور اس لئے یہ حضرات قوم پر فدا تھے اور قوم ان پر فدا تھی۔

اب اس عہد کے چانسلروں کو دیکھئے تو آپ کو اس فہرست میں سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال، نواب محمد حمید اللہ خاں، (بھوپال) میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن، کے نام نظر آئیں گے اور اس سے اندازہ ہوگا کہ اس یونیورسٹی کو کس طرح ہندوستان کی نامور اور بلند پایہ ریاستوں کی سرپرستی حاصل تھی، یہ ریاستیں گراں قدر مالی امداد بھی دیتی تھیں اور اس کے تمام تعلیمی، انتظامی اور تہذیبی امور میں دلچسپی لیتی تھیں، نواب حمید اللہ خاں نے تو تعلیم بھی یہیں پائی تھی۔

تقسیم سے پہلے کے اس مختصر دور میں یونیورسٹی کو متعدد مرتبہ سخت اور صبر آزما حالات سے سابقہ پڑا، اس قسم کا پہلا حادثہ تو اس وقت پیش آیا جب کہ یونیورسٹی ابھی عالم وجود میں آئی ہی تھی، ترک موالات کی تحریک شباب پر تھی اس کا حملہ یونیورسٹی پر بھی ہوا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کے درودیوار ہل گئے، لیکن ”خدا شہرے برا نگیزدہ خیر کا وراں باشد“ کے مطابق اس حملہ کے بطن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ پیدا ہوئی اور اس طرح اب ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعلیم جدید کی دو درس گاہیں ہو گئیں، اس کے بعد یونیورسٹی کو دوسرا حادثہ سر رحمت اللہ کمیشن کی صورت میں پیش آیا، یہ حادثہ بھی اس درجہ شدید تھا کہ یونیورسٹی کا نظام درستہم برجم ہو گیا، بہت سے پرانے لوگوں کو یہاں سے جانا پڑا اور نئے لوگوں نے ان کی عالی جگہوں کو پر کیا، اس کے بعد تیسرا حادثہ اس وقت پیش آیا جب کہ تحریک پاکستان کے



نیو یارک یونیورسٹی عملاً تحریک کے سپاہیوں کا ایک کیمپ بنکر رہ گئی، یہ حوادث یونیورسٹی کے لئے خواہ کتنے ہی صبر آزما اور شدید ہوں، لیکن نئے نہیں تھے، اس قسم کے حالات و واقعات ہر یونیورسٹی میں ہی پیش آتے رہتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اندولی اور داخلی کم، زیادہ تر بیرونی اور خارجی ہوتے ہیں، ان کی تدبیریں عارضی اور ہنگامی وقتی ہوتی ہیں، مستقل اور پائدار نہیں ہوتیں۔ اور عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ ان کو اسی روشنی میں دیکھا اور جانچا جائے۔

بہر حال یونیورسٹی اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس درس گاہ کے ذریعہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اعلیٰ گزمرہ صرف ایک کا لکھ نہیں، بلکہ ایک تحریک تھا۔ اور تحریک بھی بڑی موثر اور فعال۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے حقوق مردہ میں زندہ رہنے کے ارمان کا نیا اور تازہ خول پیدا کیا۔ جو لوگ مالیہ اور ناکامی کے شدید احساس کے باعث ہمت کا ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے وہ عزم و ہمت اور خود اعتمادی کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گئے، اس تحریک نے ان کو حوصلہ دیا، ولولہ کار دیا، جوش عمل بخشا اور تنازع للبقا کے میدان میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کر لینے کا سلیقہ سکھایا، اس تحریک کا یہ اثر تھا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون، ادب اور لٹریچر، طب اور قانون، انڈسٹریشن، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحیت، جبرلزم اور تعلیم، غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی، حکومت کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے حسن کارگزاری کا نقش نہ بٹھایا ہو، اسی طرح پبلک لائف کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر ان کی شہرت اور عظمت کا طوطی نہ بولا ہو، اس تحریک کی افادیت اس ملک تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ دور دور تک پہنچی اور یہ یونیورسٹی صرف ہندوستان کی نہیں، بلکہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی۔

آپ کو یاد ہوگا، سر آفا فاں نے یونیورسٹی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں میں روحانی اتحاد کا ذریعہ ہوگی، موصوف کا یہ خیال اس طرح صحیح ثابت ہوا کہ اس یونیورسٹی کے سرچشمہ فیض سے جو ہزاروں مسلمان سیراب ہو چکے ہیں ان میں کتنے ہی سنی ہوں گے اور کتنے شیعہ، ان میں دیوبندی بھی ہوں گے اور بریلوی بھی، مقلد بھی ہوں گے اور غیر مقلد بھی، لیکن یہ سب علی گڑھ آئے۔ برسوں کلاس رومز اور ہوسٹل میں، کھیل کے میدانوں اور یونین کے جلسوں میں ایک ساتھ مل جل کر اور ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار بن کر زندگی بسر کی اس بنا پر ان میں باہم محبت اور ربط و ضبط ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد میں باوجود افکار و خیالات میں اختلاف کے ہوتا ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی گوشہ میں چلے جائے۔ علی گڑھ کا پرانا تعلیم یافتہ اگر وہاں کوئی آپ کو ملے گا اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ آپ کا تعلق بھی علی گڑھ سے ہے تو وہ آپ سے اس طرح ملے گا کہ گویا اپنے بھائی سے مل رہا ہے، اس بنا پر یہ یونیورسٹی آج اسلامی اخوت و برادری کی ایک رمزی علامت (Symbol) بھی ہے۔

چنانچہ ابھی میں جنوبی افریقہ اور موریشس کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ ان دونوں ملکوں میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ کثرت سے ہیں، جگہ جگہ یہ حضرات ملتے تھے تو علی گڑھ کی خیریت اس ذوق و شوق سے دریافت کرتے تھے جیسے بڑھاپے میں بچپن کے کسی عزیز ترین دوست کا شناسا آپ کو مل جائے تو آپ کرید کرید کر اس کا حال دریافت کرتے ہیں۔

## گزارش

خریداری برہان یا ندوۃ الصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت  
یامنی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ کے نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد  
میں تاخیر نہ ہو۔۔۔ (منیجر)



## ادبیات

# غزل

جنابِ نقضا ابنِ فیضی

یوں آتشِ ہوس کو دلوں میں ہوانہ دے  
ڈرتا ہوں سانس لیتے ہوئے اس خیال سے  
کچھ اور ہونہ جائیں جنوں والے بے لباس  
ایک ایک حرفِ مصلحتوں کی زبان ہے  
ہجومِ نخل دار ہے ہر سانس دستِ سنگ  
کیا نیچے مڑ کے دیکھوں کہ وہ رُت گزر گئی  
صدیاں گزاردی ہیں اسی شہرِ سنگ میں  
بس دو قدم ہے حرفِ وقلم سے صلیب تک  
کانٹوں کی داستان ہوں مجھے کوئی خوش مزاج  
خاکِ سرِ حیات ہوں، دامن میں باندھ لے

اک دن یہ آگ تیرے ہی گھر کو جلانہ دے  
یہ سیلِ تندِ جسم کی دیوار ڈھانہ دے  
عربانی جنوں کو خرد کی تباہ نہ دے  
یہ چیز آبرو دے سخن کو گھٹانہ دے  
جینا یہی ہے اب تو مجھے یہ سزا نہ دے  
اب اتنی دور جا کے مجھے تو صدانہ دے  
دل کی جراحاتوں کا مجھے واسطانہ دے  
یہ فاصلہ بھی تیری سیاست ٹٹانہ دے  
تیرے لبوں پہ بوسے کی صورتِ سجانہ دے  
پیارے تو مجھ کو شعلہ سمجھ کر ہوانہ دے

آزاد ہے بصیرتِ شاعر مگر نقضا  
کیا بوئے گل کرے جو صبارا ستانہ دے

# غزل

جناب نسیم شاہماہی پوری

اُن کی ہر ایک بات مجھے معتبر لگے  
ہر سمت خشک سبزہ دیوار و در لگے  
تارا لگے، چراغ لگے ہے، گہر لگے  
ہر سانس ایک رشتہ نامعتبر لگے  
آگاہی فریب مسلسل کے باوجود  
روزِ حساب! تیرے تصور کے میں نشان  
اے زندگی بتا کہ ترا کیا خیال ہے  
آئے غمِ حلیب! مرا تو ہی ساتھ دے  
شاید پھر اُن کے گیسو و رخ کی چھڑی ہے بات  
یہ کس مقام پر مجھے لائی ہے زندگی  
سب سے پہچتا ہوں کہ منزل ہے کتنی دور  
اس دورِ کشمکش میں کسے فرصتِ حیات

یارب نہ اس یقین پر کسی کی نظر لگے  
اب مجھ کو ایک دشتِ خود اپنا ہی گھر لگے  
آنسو مژہ پہ آ کے بہ شکلِ دگر لگے  
مجھ کو چراغِ زلیبت، چراغِ سحر لگے  
کوئی بھی رہ گذر ہو تری رہ گذر لگے  
صدیوں کا فاصلہ بھی بہت مختصر لگے  
تو بھی مجھے اجل کی طرح معتبر لگے  
تنہا رہِ حیات بڑی پر خطر لگے  
ٹھہری ہوئی سی گردشِ شام و سحر لگے  
جینے سے ڈر لگے ہے نہ مرنے سے ڈر لگے  
مجھ کو ہر اک شریکِ سفر راہبر لگے  
انسان کا وجود فریبِ نظر لگے

اُن کا ہر ایک وعدہ شام و سحر نسیم  
نامعتبر بھی ہو کے مجھے معتبر لگے



## تبصرے

یادوں کی بارات از جناب جوش ملیح آبادی، ضخامت ۵۵۶ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت بیس روپے، پتہ: آئینہ ادب۔ لکھنؤ

جناب جوش ملیح آبادی اردو کے نامور اور عظیم شاعر ہیں، اگرچہ ان کی شاعری میں وہ سوز و گداز نہیں ہے جن سے شعر تیر و نشتر بن جاتا ہے اور نہ اس میں وہ مقصدیت ہے جس سے شعر میں توانائی اور ابدیت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ تاہم ان کو زبان و بیان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور ان کے کلام میں ندرت و جودیت تشبیہات و استعارات، تخیل کی وسعت اور مشاہدہ کی دقت و باریک بینی کے جو اوصاف و کمالات فراوانی کے ساتھ پائے جاتے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اردو زبان کا قافیہ آئی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب جوش صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ ایک بڑے فن کار کی خود نوشت سوانح عمری سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس میں صاحب سوانح نے فن سے متعلق اپنے نظریہ پر بحث اور اپنے فن کے ارتقا پر گفتگو کر کے کچھ فنی رموز و نکات سمجھائے ہوں گے۔ لیکن اس کتاب میں، کہیں کہیں دو چار جملوں کے علاوہ اس قسم کی کوئی مستقل بحث نہیں ہے، اس کتاب کے خاص موضوع گفتگو یہ ہیں: (۱) خاندانی حالات، ابتدائی نشو و نما، تعلیم و تربیت و ملازمت وغیرہ (۲) احباب (۳) جن سے عشق و محبت کی پٹکیں بڑھائی گئیں، زبان و بیان پر جوش صاحب کی قدرت مسلم ہے۔ چنانچہ یہ کتاب نشر میں بھی ان کی اس قدرت کا زندہ ثبوت ہے۔ چنانچہ صفحات کے صفحات ایسے ہیں کہ پڑھتے جاتیے اور لطف لیتے

جائیے۔ علی الخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں جو عبارت لکھی ہے وہ اردو انشاء و بلاغت کا شاہکار ہے، لیکن افسوس ہے کہ جوش صاحب نے کتاب میں بحیثیت مجموعی جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہ شرفار کا ہرگز نہیں بلکہ اوباشوں اور بازاری لوگوں کا ہے، شرفار اس لب و لہجہ کے معاملہ میں کس درجہ محتاط تھے؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوگا کہ کم و بیش چالیس برس پہلے کی بات ہے، ناصر ندیر فراق دہلوی دلی کی ٹکسالی اور لال قلعہ کی بیگماتی زبان کے بڑے ماہر اور محقق تھے، ان کا تو انتقال ہو چکا تھا اور میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں، البتہ مرحوم کے صاحبزادہ ناصر خلیق فگار جو زباندانی میں باپ کے صحیح جانشین تھے میرے بڑے مخلص دوست تھے، ایک مرتبہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے کسی بات پر میری زبان سے نکلا ”رنگ میں بھنگ“ موصوف پر یہ سنتے ہی سخت حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو گئی، اور بولے: سعید صاحب! دلی کے شرفار اس طرح نہیں بولتے ”میں نے کہا: تو وہ اس قسم کے موقع پر کیا کہتے ہیں“ انھوں نے جواب دیا: رنگ اور بھنگ کی بات بازاری لوگ کرتے ہیں، دلی کے شرفار ایسے موقع پر کہتے ہیں: ”کلیل میں غلیل“۔ جوش صاحب نے کتاب میں جگہ جگہ شرافت کا ادعا کیا ہے! لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ شریف درحقیقت وہ شخص ہے جس کی بول چال اور جس کا عمل شریفانہ ہو۔

چنانچہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد مصنف کی جو تصویر ذہن کے پردہ پر ابھرتی ہے وہ ایک ایسے شخص کی تصویر ہے جو ایک خوش حال اور پرانے قسم کے جاگیردارانہ گھرانے میں پیدا ہوا، اور صحیح تعلیم و تربیت کے فقدان اور صحبت بد کے باعث شروع سے ہی اس کی عادتیں خراب اور اس کے طور طریق آوارہ اور بد ہیں لوگوں کے سے ہو گئے۔ اس میں شرم و حیاء نہ اپنوں کی



اور نہ پرائیوٹ کی نام کو نہیں ہے، مذہب کا کیا ذکر! انسانیت و شرافت اور تہذیب و شائستگی کے جو مسلمہ اقدار حیات ہیں ان سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور عام سماجی قدیں اس کے ذہن میں اس طرح الٹ پلٹ گئی ہیں کہ اس کے نزدیک فسق و ہوا پرستی کا نام عشق و محبت ہے، وقاحت اس کے نزدیک لائق فخر ہے، دوسروں کو ایذا پہنچانے میں اسے لطف آتا ہے، کذب بیانی شیخی اور تعلی اس کی فطرت اور آوارگی اس کی طبیعت ہے، خود کشی صرف جہانی ہی نہیں بلکہ معنوی بھی ہوتی ہے۔ جوش صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اسی قسم کی خود کشی کی ہے، ان میں اگر انسانیت و شرافت کی کوئی ایک ادنی سی رمت بھی موجود ہے تو ہم کو یقین ہے کہ اگر آج نہیں تو کل ان کو یہ محسوس ہوگا کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر عظیم اور ناقابل تلافی ظلم کیا ہے خود اپنی ذات پر، اپنے خاندان پر، اپنی بیوی اور اپنی اولاد پر، اپنے دوستوں اور احباب پر یہاں تک کہ خود اپنے فن پر۔

یادوں کی دنیا از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، تقطیع کلاں، ضخامت پانچ سو صفحات سے زیادہ، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت درج نہیں، پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڑھ جتنا تکد جوش صاحب کی آپ بیتی ”کو پڑھ کر ہوا تھا، اتنی ہی مسرت اس کتاب

---

یہ کتاب کم و بیش چار برس پہلے وصول ہوئی تھی، لیکن تبصرہ کی نوبت اب آرہی ہے ہوا یہ کہ جب میں علی گڑھ میں تھا دفتر برہان کی طرف سے ایک بڑا بندل کتب برائے تبصرہ کا وصول ہوا جس کی ضخامت کو دیکھ کر ہی میں سہم گیا۔ میں نے خیال کیا کہ میز پر رکھی ہوئی کتابیں بندل جائیں گی تو بندل کو کھولوں گا لیکن ہوا یہ کہ میز پر رکھی ہوئی کتابیں کبھی ختم نہیں ہوئیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور یہ بندل بند کا بند پڑا رہا۔ آخر ابھی پچھلے دنوں یہ بندل کھلا تو اس میں یہ کتاب بھی ملی۔

کو بڑھ کر ہوئی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بڑے فاضل اور لائق بزرگ ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی اور اردو دونوں زبانوں کے مصنف ہیں۔ اگرچہ ان کا خاص مضمون جس کے وہ عرصہ تک استاد رہے تاریخ اور سیاسیات ہے۔ لیکن اردو زبان کے شعر و ادب کے بھی بلند پایہ مبصر، نقاد اور شگفتہ قلم ادیب ہیں۔ یہ کتاب موصوف کی خود نوشت سوانح حیات ہے، اور اپنے موضوع پر اتنی کامیاب ہے کہ اس کو موڈل بنایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب قائم گنج کے پٹھانوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد ہیں، ابتدائی تعلیم اٹاوا اور علی گڑھ میں پائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویٹ ہوئے، پھر تقریباً چار برس فرانس میں قیام کر کے وہاں سے ڈاکٹر ٹیٹ کی ڈگری لی۔ وطن واپس آکر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تاریخ و سیاسیات کے استاد رہے، اسی درمیان میں چند ماہ کے لئے نظام حیدرآباد دکن مرحوم کے پوتے کے اتالیق بھی رہے، عثمانیہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ آئے اور یہاں سات برس تک پرووائس چانسلر کے عہدہ کی خدمات انجام دیں، زندگی کے اس طویل سفر میں مصنف بچپن سے بڑھاپے تک جہاں جہاں رہے، جو کچھ دیکھا اور سنا، جن جن لوگوں سے ملے اور جو کچھ خود پڑھا اور سیکھا ان سب کی روئاد شرح و بسط کے ساتھ نہایت شگفتہ اور کیف آفرین انداز بیان میں قلمبند کی ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر دنیا ایک نیارنگ وروپ اختیار کر رہی تھی۔ اور ایک نئی تہذیب و تمدن کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں پہلے تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں ہندو اور مسلمانوں میں بڑے بڑے نامور لیڈر منظر عام پر آئے، ادھر یورپ میں علم و تحقیق اور استشرق کا سورج نصف النہار پر تھا۔ پھر ہندوستان نے آزادی حاصل کی اور اسی سلسلہ میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن کا واقعہ پیش آیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی پر بھی اس عہد میں انقلاب کے کئی دور گزر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سب



چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے ایک خاص اثر لیا ہے، اور اس کتاب میں یحییٰ اور ہندوستان کے ان تمام حالات و واقعات کو ناقدانہ بصیرت اور مورخانہ دیا کے ساتھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے، اس بنا پر یہ کتاب صرف ایک شخصی سوانح حیات نہیں۔ بلکہ یہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور علمی و ادبی حالات و واقعات اور ان کے وابستہ اشخاص و افراد کے کارناموں اور ان کے اوصاف و کمالات کا بھی ایک مستند مرقع ہے جس سے تاریخِ عہدِ حاضر کا کوئی مصنف بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس لئے ادبی حیثیت کے علاوہ تاریخی حیثیت سے بھی یہ کتاب بڑی قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔

## اہلِ علم کے لیے چار نادر تحفے

- ۱۔ تفسیر روح المعانی: جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قطدار شائع ہو رہی ہے۔ قیمت مصریہ کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے  
آج ہی مبلغ دس سو روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک ۴۴ جلدیں طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۶ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔
  - ۲۔ تفسیر جلالین شریف: مکمل مصری طرز پر طبع شدہ۔ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطی (۲) معرفت الناسخ والمنسوخ لابن الحرم قیمت مجلد بیس سو روپے
  - ۳۔ شرح ابن عقیل: اصفیہ ابن مالک کی مشہور شرح جو درسِ نظامی میں داخل ہے قیمت مجلد ۲ روپے
  - ۴۔ شیخ زادہ: حاشیہ بیضاوی سورۃ بقرہ تین جلدوں میں شائع ہو رہا ہے۔ پہلی جلد آچل ہے۔ نمونہ مفت طلب فرمائیے۔
- پتہ: ادارہ مصطفائیہ دیوبند ضلع سہارنپور

17 SEP 1973

# برہان

جلد ۱ | ماہ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۳ء | شمارہ ۲

- |     |   |  |
|-----|---|--|
| ۷۴  | سعید احمد اکبر آبادی  | ۱۔ نظرات<br>مقالات:                        |
| ۷۸  | جناب ڈاکٹر خورشید احمد نازق صاحب<br>پروفیسر عربی دلی یونیورسٹی دہلی | ۲۔ رسول اللہ کے اجداد                      |
| ۹۶  | سعید احمد اکبر آبادی  | ۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی<br>تقسیم کے بعد  |
| ۱۱۸ | مولانا حبیب ریحان ندوی<br>لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ البیضاء لیبیا    | ۴۔ اسلامی حدود کی حکمت                     |
| ۱۲۷ | جناب مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی                                   | ۵۔ مکتوبات مجدد الف ثانی                   |
| ۱۳۶ | فتنا ابن فیضی   | ۶۔ ادبیات و تبصرے:<br>ادبیات: غزل<br>تبصرے |
| ۱۳۷ | س ع   |  |



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## نظرات

افسوس ہے گزشتہ مہینہ ہماری پرانی بزمِ علم و ادب کی ایک اور شمع بجھ گئی۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی، بدایوں کے ایک نامور خالوادہ شعر و ادب کے فرزند ارجمند تھے، قدیم دستور کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم ایک مدرسہ میں پائی، پھر انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو ایم۔ اے تک پہنچے فارسی میں جس کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۲۶ء میں بسلسلہ ملازمت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے، اور شعبہ فارسی کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے ۵۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ موصوف کی استعداد بڑی پختہ اور نظر بہت وسیع تھی۔ عربی، فارسی اور اردو شعر و ادب پر تحقیقی اور مہرمانہ نگاہ رکھتے تھے، لغت ان کا خاص فن تھا، چنانچہ ریٹائرمنٹ کے بعد چند برس علی گڑھ میں اور پھر چند برس دہلی میں لغت پر جو کام اردو شعبوں کے ماتحت ہو رہا ہے اس سے وابستہ رہے، تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا۔ چنانچہ تاریخ و ادب پر متعدد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں جن میں دیوان مومن مع ایک طویل مقدمہ کے اور شرح قصائد مومن خاصہ کی چیزیں ہیں۔ مذہبیات سے بڑی دلچسپی تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کی دو تین کتابیں ہیں، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، نہایت خوددار، منسار اور متواضع تھے، طلباء پر بے حد شفقت کرتے اور ان کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے، کم سخن تھے، مگر جب بولتے تھے تو تقریر مربوط اور پر مغز

کرتے تھے، عمر ۷۷ برس کے لگ بھگ ہوگی، ادھر کچھ عرصہ سے علی گڑھ میں جس کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا مقیم تھے۔ وہیں ۸ جولائی کو شب میں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے، اب اس وضع کے لوگ کہاں ملیں گے۔

خبر گرم ہے کہ اپنے گوشہٴ عافیت کیرالا اور مدراس سے باہر نکل کر مسلم لیگ بڑے جاہ و شہم اور طمطراق کے ساتھ گجرات اور اتر پردیش کی طرف بھی پیش قدمی کر رہی ہے اور یہاں کے مسلمان اس کے ایک جلوہٴ بے حجاب کو ترس گئے تھے وہ جذبہٴ بے قرار و بے اختیار کے ساتھ اس کو خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ اس مسلم لیگ کا روپ اب وہ نہ ہوگا جو ۱۹۷۷ء سے پہلے تھا، اب یہ کبھی اس پارٹی کا ساتھ دے گی اور کبھی اس پارٹی کا۔ کبھی کانگریس سے ساز باز کرے گی اور کبھی کونسلوں سے یا اور کسی مخالف پارٹی سے ناٹھ جوڑے گی۔ لیکن بہر حال رہے گی ایک فرقہ وارانہ جماعت! اگرچہ محترم صدر مسلم لیگ نے ابھی حال میں شیخ عبداللہ کی ایک تقریر کے جواب میں جو بیان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ جماعت ہونے سے قطعی انکار کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم اس جماعت کا ممبر ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے، تو پھر اس کو مسلم لیگ کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتا تو پھر وہ فرقہ وارانہ نہ ہوئی تو اور کیا ہوئی! اسی ایک سوال کو اس طرح بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کیا کسی غیر مسلم کو کسی مسلم علاقہ میں اپنے امیدوار کی حیثیت سے الکشن میں کھڑا کر سکتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اسے مسلم لیگ کہنا صحیح نہ ہوگا، اور اگر کھڑا نہیں کر سکتی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ صرف ایک فرقہ کی اور اس کے ہی مفاد کے لئے ایک جماعت ہوئی اور ظاہر ہے ایک پارٹی یا جماعت کے فرقہ وارانہ ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے، اس بنا پر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روپ خواہ



کچھ ہی ہو اور عزائم اور مقاصد خواہ کیسے ہی ہوں یہ جماعت فرقہ دارانہ ہے اور اس سے مسلمانوں میں طردگی پسندی اور فرقہ دارانہ طریق فکر اور جذبات کی نشوونما ہوگی اور اس کو کوئی شخص بھی ان کے حق میں اچھا نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب اقلیت میں یہ جذبات ہوں گے تو ان کا اثر لازمی طور پر اکثریت پر ہوگا، اور چونکہ ہر شعبہ، ہر محکمہ اور زندگی کے ہر میدان میں اقتدار اعلیٰ اکثریت کے ہاتھ میں ہے اس بنا پر اس کشمکش کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو جو دقتیں اور پریشانیاں اب پیش آرہی ہیں ان میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم شروع سے آج تک فرقہ دارانہ سیاست کے کبھی حامی نہیں رہے۔ ہم نے ملک و وطن اور خود مسلمانوں کے لئے اس کو ہمیشہ سخت مضر اور نقصان رسا سمجھا ہے اور آج بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں اور برابر سمجھتے رہیں گے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ جس طرح ہمارے کہنے سننے کا پہلے کوئی اثر نہیں ہوا اب بھی نہ ہوگا۔ اور مسلم لیگ کو جس طرح پہلے فروغ ہوا تھا اب بھی ہوگا۔ عام مسلمانوں کو اس کی طرف بہ نسبت کسی اور جماعت کے میلان اور کشش زیادہ ہے، ابھی حال میں اتر پردیش کے بعض مقامات میں مسلم لیگ کے جو عظیم اجتماعات ہوئے ہیں وہ اس کی غمازی کر رہے ہیں، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ایک ربع صدی تک جن مسلمانوں نے کبھی مسلم لیگ کا نام بھی نہیں لیا اب کیا بات ہوئی کہ وہ اس کا احیا کر رہے اور اس کو فعال بنانے کی فکر کر رہے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پچیس برس تک کانگریس پر بھروسہ کیا۔ اس کے جمہوریت اور سکولرزم کے دعووں اور حکومت کی بار بار کی یقین دہانیوں اور وعدوں پر اعتبار کیا، ان کو بار بار چرکے لگتے اور پلے بہ پلے مایوس کن حوادث پیش آتے رہے، لیکن وہ ہمیشہ اپنے دل کو یہ سمجھاتے رہے کہ حکومت اور کانگریس اپنے قول و قرار میں مخلص اور راست باز

ہے، البتہ چونکہ ملک میں جمہوریت کی جڑیں ابھی مضبوط نہیں ہیں اس لئے حکومت جو چاہتی ہے وہ کر نہیں پا رہی ہے، ایک مضبوط اور غالب اکثریت رکھنے والی پارٹی اور اس کی حکومت کے لئے اصلاح حال کے واسطے پچیس برس کی مدت کم نہیں ہوتی لیکن مسلمان محسوس کرتے ہیں اور بجا کرتے ہیں کہ اس طویل مدت میں بھی ان کے کسی درد کا درمان اور ان کی کسی بیماری کا علاج نہیں ہو سکا ہے، بلکہ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ فسادات ہوتے ہیں تو مسلمانوں کے نقصانات کی کوئی تلافی نہیں ہوتی۔ فساد زدہ علاقہ پر اجتماعی جرمانہ نہیں ہوتا اور مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔ ملازمت کا دروازہ ان پر اب بھی کشادہ نہیں، اردو اپنے طبعی اور واجبی حق سے اب تک محروم ہے، مسلم یونیورسٹی کا معاملہ بد سے بدتر ہو گیا۔ اکثریت کے اداروں اور پبلک مفادات کے مرکزوں میں اب بھی ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، کتنی مسجدیں ہیں کہ اب تک قبضہ اغیار میں ہیں، غرض کہ مسلمانوں میں یہی بیچارگی اور کسں پیری کا احساس ہے جس کا مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا اور اب وہ مسلم لیگ کی شکل میں ایک پھوڑا بن کر ابھر آنے کے لئے بے قرار ہے، اس لئے اس کی بڑی ذمہ داری کانگریس اور اس کی حکومت کے سرعائد ہوتی ہے۔

علی گڑھ کے تاریخی مقام سے پندرہ روزہ "احتساب" اس لئے جاری

**احتساب** کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وقت کے چیلنج کا مقابلہ کیا جائے۔ ہمارے سامنے مقاصد یہ ہیں: (۱) طلباء اور نوجوانوں کی ذہنی و فکری اصلاح (۲) جدید زمانہ کے لحاظ سے مذہب کی علمی نائنڈگی (۳) دین حق کی اشاعت (۴) موجودہ دور کے مسائل کا اسلامی نقطہ نظر سے حل (۵) ملی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی وغیرہ۔ ایڈیٹر: محمد تقی امینی

چند سالانہ: چھ روپے۔ ملنے کا پتہ: ادارہ احتساب۔ اپنی منزل دودھ پور روڈ علی گڑھ



# رسول اللہ کے اجداد

①

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

عربی اخبار و آثار کے مطابق پیغمبر مسیحؑ سے تقریباً تین ہزار برس پہلے پیغمبر ابراہیمؑ اپنے لڑکے اسماعیلؑ اور فرشتے جبریلؑ کے ساتھ براق پر سوار ہو کر شام سے مکہ آئے اور وہاں مرکز توحید کعبہ کی بنیاد رکھی، اس کے بعد وہ اسماعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ کر شام واپس چلے گئے۔ اُس وقت مکہ میں یمن کا ایک مہاجر خاندان جریم حکمران تھا، اس خاندان کے لوگ مُوحد ہو گئے، اسماعیلؑ نے ایک جریمی عورت سے شادی کر لی اور جریم اکابر کے تعاون سے حج اور کعبہ کی نگرانی، توحید کی اشاعت اور مکہ پر حکومت کرنے لگے۔ اسماعیلؑ کی اولاد میں آٹھ نو سو برس بعد مکہ کے ایک معزز گھرانے میں تُصّی نامی ایک شخص پیدا ہوا۔ اس وقت مکہ کی حکومت اور کعبہ کی نگرانی یمن کے ایک دوسرے مہاجر خاندان خزاعہ کے ہاتھ میں تھی جس نے جریم کو ان کی مہینہ بدعنوانیوں کے باعث مکہ سے نکال دیا تھا۔ تُصّی بلند حوصلہ اور باتدبیر آدمی تھا، وہ کعبہ کا متولی اور مکہ کا حاکم بننا چاہتا تھا، اس کی دلیل تھی کہ چونکہ وہ براہ راست اسماعیل بن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہے اس لئے اسے اور اس کے خاندان کو خزاعہ کی نسبت تولیت کعبہ اور حکومت مکہ کا زیادہ حق حاصل ہے۔ اُس نے خزاعہ کے خلاف تحریک چلا دی جو پھلنے پھولنے لگی اور اپنے خاندان و قبیلہ کے علاوہ اس پاس کے عرب قبائل کی مدد سے خزاعہ کو مکہ سے نکال دیا اور خود کعبہ کا متولی اور کعبہ کا حاکم ہو گیا۔ تُصّی

پہلا عرب تھا جس نے قریش کی عظمت و سر بلندی کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اس کا خاندان بنو نضر کہلاتا تھا جس کی کچھ شاخیں مکہ میں اور بیشتر مکہ سے باہر مختلف وادیوں میں بکھری ہوئی تھی۔ بنو نضر کا پیشہ تجارت تھا لیکن اس وقت تک بیرونی ملکوں سے ان کے تجارتی روابط نہیں تھے، نہ دولت و ثروت ان کے پاس زیادہ تھی۔ ثقی نے بنو نضر کے سارے پراگندہ خاندانوں کو مکہ میں زمینیں دیکر الگ الگ محلوں میں بسا دیا، اس عمل کے بعد بنو نضر کا نام قریش (مُتَّحِدٌ وَ مُجْتَمِعٌ) پڑ گیا اور ثقی کو مُجْتَمِع (متحد کنندہ) کے پُر افتخار لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ ثقی نے دار الندوہ قائم کیا اور اس کا دروازہ خانہ کعبہ کی طرف رکھا، قریشی اکابر سارے اہم معاملات اسی جگہ طے کرتے تھے، جنگ و صلح کے مسائل پر اسی جگہ غور و خوض کیا جاتا تھا، قریش کے تجارتی تافلے یہیں سے روانہ ہوتے تھے، بچوں کی ختنہ یہیں ہوتی تھی، شادی بیاہ کی تقریبات یہیں منعقد ہوتی تھیں، قریشی لڑکیاں جب بالغ ہوتیں تو ان کے بلوغ کا لباس ایک پبلک تقریب کے ساتھ دار الندوہ میں انھیں پہنایا جاتا تھا اور شادی کرنے والے اس موقع پر بیویوں کا انتخاب کر لیتے تھے۔ ثقی اپنے کارناموں کے باعث قریش کا ہیرو و آدم بن گیا، قریشی اکابر اس کی رائے کا ویسا ہی احترام کرتے، جیسا مذہبی احکامات کا کیا جاتا ہے۔ ثقی ہر تاجر سے جو مکہ میں داخل ہوتا دس فیصد ٹیکس لیتا تھا، اس نے خانہ کعبہ اور حج سے متعلقہ عہدوں کی از سر نو تنظیم کی، زائرین کعبہ اور حاجیوں کے آرام، اپنی اور اپنے قبیلہ کی ناموری اور عربوں کی نظریں سرخروئی کے لئے اس نے دو نئے ادارے قائم کئے۔ رفاہ و سبقایہ، رفاہ کے ماتحت حاجیوں کو حج کے اہم اجتماعات کے موقع پر مفت کھانا کھلایا جاتا تھا اور سبقایہ کے ماتحت مناسک حج کے دوران مفت پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ ان دونوں اداروں کے عظیم مصارف کے لئے ثقی خود چندہ دیتا اور قریش کے مالدار لوگوں سے بھی چندہ لیتا تھا۔ چندہ مہم کا آغاز ثقی نے اس تقریر سے کیا: معشر قریش، آپ لوگ خدا کے

۱۔ ابن سعد (کتاب طبقات الکبیر، بیروت) ۱/۲۸، ۵۰، ۵۳، ۵۴  
 ۲۔ ایضاً ۱/۶۱-۷۱، ابن ہشام (سیرۃ رسول اللہ لندن) ۱/۳۳۵، النساب الاشراف (ملاذری مصر) ۱/۵۹-۶۰



پڑوسی ہیں، اس کے گھر والے اور حرم کے مجاور، حاجی خدا کے مہمان ہیں اور اس کے گھر کے زائر، ہر دوسرے مہمان سے خاطر مدارات کے زیادہ مستحق، اس لئے حج کے دوران ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیجئے۔ یا معشر قریش، انکم جیران اللہ و اہل بیتہ و اہل الحرم و  
 ان الحاج ضیفان اللہ و بنا و اربیتہ و ہم اُحق الضیف بالکرامۃ فاجعلوا لہم  
 طعاما و شرابا ایام الحج حتی یصلوا روعکم۔

تفصی کے چار لڑکے تھے۔ عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزیٰ، اور عبد قحس، آخری تینوں نے اپنی وسیع تجارت، دولت، داد و دہش اور صلہ رحمی سے معاشرہ میں خوب وجاہت حاصل کر لی تھی، لیکن سب سے بڑا لڑکا عبدالدار جو قدرتی طور پر کم صلاحیت تھا، سماجی افتخار پر نہ چمک سکا، اس کی تلافی قحس نے اس طرح کی کہ عبدالدار کو حج، کعبہ اور مشاورتی و فوجی امور سے متعلقہ وہ سارے عہدے دیدئے جن کی بحالی اعلیٰ خود اس کے ہاتھ میں تھی۔ برقادہ، سقاہ، حجابہ، لواء اور ندوہ۔

تفصی کی وفات پر اس کا دوسرا لڑکا عبد مناف جو اپنے حسن و جمال کے باعث قمر کہلاتا تھا مکہ کا حاکم اور قریش کا زعمیم اعلیٰ ہوا، اس کے چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں، لڑکیاں دولت مند، معزز اور با اثر قریشی اکابر کو بیاہی تھیں، لڑکے سب ہونہار نکلے، چار نے تجارت کو غیر معمولی فروغ دیا اور معاشرہ میں نمایاں وقار حاصل کیا۔ مطلب، ہاشم، عبد شمس، اور نفیل۔ اب تک قریش کی تجارت مکہ اور آس پاس کے ہاتوں تک محدود تھی، بیرونی ملکوں سے ان کے تجارتی تعلقات نہیں تھے۔ دوسری اقوام کے لوگ۔ فارسی، بنطی اور شامی سامان تجارت لے کر مکہ آ جاتے تھے اور قریش ان سے خرید کر مکہ اور قریب کے بازاروں میں جو وقتہ فوقتہ منعقد ہوتے

رہتے تھے جیسے عکاظ، نجد اور ذوالحجاز بیچ دیا کرتے تھے۔  
 تجارت کی ترقی اور رفاہی جذبہ میں ہاشم اپنے سارے بھائیوں سے بازی لے گیا تھا۔  
 وہ شام گیا، وہاں ہر دن ایک بکری ذبح کرتا اور اس کا سالن (شرید) پکوا کر آس پاس جو لوگ  
 ہوتے انھیں کھلا دیتا، اس کی فیاضی کے چرچے ہونے لگے، کسی انسر نے بادشاہ شام قیصر کو  
 ہاشم کی انوکھی ضیافتوں سے مطلع کیا، ہاشم بڑا خوشرو اور متناسب اعضاء جوان تھا، قیصر نے  
 اسے بلا بھیجا، اس کی جسمانی ملاحظت اور عمدہ گفتگو سے وہ کافی متاثر ہوا، ایک دن ہاشم نے  
 قیصر سے کہا: میری قوم تجارت پیشہ ہے، اگر آپ انھیں ملک میں تجارت کرنے کی اجازت  
 دیدیں تو وہ حجاز سے اعلیٰ قسم کے چمڑے کا سامان اور عمدہ مینی کپڑا لاکر آپ کے ملک میں بیچ دیا  
 کریں گے جس سے آپ کے ملک کی معیشت کو فائدہ ہوگا۔ قیصر نے اجازت پر مشتمل دستاویز  
 لکھ دی۔ ہاشم یہ دستاویز لے کر واپس ہوا اور مکہ۔ شام کی تجارتی شاہراہ پر آباد عرب قبیلوں  
 کے زعمیوں سے ملا اور انھیں قیصر کی تحریر دکھا کر کہا کہ اگر تم اپنے اپنے علاقوں میں قریش کے  
 قافلوں کو سلامتی سے گزرنے کی تحریریں لکھ دو تو اس کے بدلہ میں تمہارا سامان بلا اجرت شام  
 کے بازاروں میں لے جا کر بکوا دوں گا اور نفع مع اس المال تمہیں دیدوں گا۔ وہ تیار ہو گئے  
 اور تحریریں لکھ دیں۔ ہاشم کے بڑے بھائی مطلب نے یمن کے رئیسوں سے تجارت کے لئے اجازت  
 اور راستے کے قبائلی سرداروں سے قافلوں کی سلامتی کی ضمانت لے لی۔ عبد شمس حبشہ کے بادشاہ  
 نجاشی سے تجارتی پر مٹ لے لیا اور سب سے پھوٹے بھائی نوفل نے شہنشاہ کسریٰ سے عراق  
 میں تجارت کے لئے لائسنس حاصل کر لیا اور عراق۔ مکہ کی راہ پر جو قبیلے آباد تھے ان کے سرداروں  
 سے قافلوں کی سلامتی سے گزرنے کے ضمانت نامے لے لئے۔ اس طرح قریش کے لئے پڑوسی



ملکوں میں تجارت کا ایک نیا اور بڑا وسیع میدان کھل گیا۔ وہ گرمی کے چھ ماہ میں شام کو قافلے لے جاتے تھے اور سردی کے چھ ماہ میں بہمن، جیشہ اور عراق کو اور ہر ملک کا سامان ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل کرتے اور بیچ کر خوب نفع کماتے تھے۔

مکہ میں ایک بار بارش کا سخت قحط پڑا، ہاشم شام گیا اور بڑی مقدار میں روٹی پکوائی اور بودیوں میں بھردا کر مکہ لایا، اونٹ جو روٹی لا کر لائے تھے ذبح کر دئے اور ان کے گوشت نیز روٹی کا سالن (شرید) پکوا کر شہر کے لوگوں کو خوب سیر شکم ہو کر کھلایا، اس کارِ خیر سے پیدا ہونے والی نیکنامی پر ہاشم کے بھتیجے امیہ بن عبد شمس کو رشک ہوا، امیہ خود بھی بڑا مالدار تاجر تھا، ہاشم کی نیکنامی اور بڑھتی ہوئی وجاہت کی عمارت ڈھانے کے لئے اس نے بھی اہل مکہ کی ضیافت کی لیکن اس کا کھانا کثرت اور کیفیت دونوں میں ہاشم کے کھانے سے گھٹیا تھا۔ ہاشم کے احباب اور مداحوں نے امیہ کے کھانے کا مذاق اڑایا اور اسے بنانا کرنے کی کوشش کی، امیہ مشتعل ہو گیا، اس کا دل ہاشم اور اس کے ہوا خواہوں کی طرف سے مکرر ہو گیا، اس نے ہاشم سے کہا: چلو کسی بڑے آدمی کی رائے لیں کہ ہم دونوں میں سے کسے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ اس طرح کا مقابلہ عرف عام میں منافرت کہلاتا تھا اور عرب معاشرہ میں ایسے لوگ جو صلہ رحمی، حاجت مندوں کی دستگیری اور عوام کی ضیافت کر کے ایک دوسرے کے حریف ہو جاتے تھے کسی کاہن، رئیس کبیر یا کسی اور بڑی ہستی سے اپنی تمثیل و تقدیر کراتے تھے اور اس کے فیصلہ کا احترام کرتے تھے۔ ہاشم نے اپنی بڑھی ہوئی نیکنامی اور سنجیدہ مزاجی کے باعث منافرت کے لئے امیہ جیسے نوعمر کا مد مقابل بننا مناسب نہ سمجھا لیکن اس کے حامیوں نے جب اسے مجبور کیا تو وہ اس شرط پر تیار ہو گیا کہ ہارنے والا جیتنے والے کو پچاس تہمتی اونٹ دے گا اور اسے دس سال کے لئے جلا وطن بھی ہونا پڑے گا۔ امیہ نے دونوں شرطیں مان لیں۔ دونوں ایک کاہن کے پاس گئے۔ اس نے ہاشم کو امیہ سے افضل قرار دیا۔ امیہ کو پچاس اونٹ دینا پڑے جنہیں ذبح کر کے ہاشم نے اہل مکہ کی ضیافت کی، امیہ کو شرط کے

مطابق دس سال تک شام میں جلاوطنی بھی اختیار کرنا پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت سے ہاشم اور اُمیہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور دونوں کے خاندانوں میں رقابت، حسد اور نفسیاتی انحراف کا بیج پڑ گیا۔

جیسے جیسے قریش کی دولت مندی بڑھتی گئی اور اسی تناسب سے ان کی داد و رمزش، رفاہی سرگرمیاں اور قبائلی مواخذات میں مالی اعانت بھی، ویسے ویسے ان کے اکابر میں رعونت پیدا ہوتی گئی اور رقابت کا جذبہ شدید تر ہوتا گیا۔ اس رعونت و رقابت کا ایک بڑا منظرہ جھگڑا تھا جس نے قصتی کے پوتوں بنو عبد مناف اور بنو عبد الدار کے درمیان سراٹھایا۔ بنو عبد مناف (مطلب، ہاشم، عبد شمس اور نوفل) نے محسوس کیا کہ تمول اور سماجی سرخروئی میں ہم بنو عبد الدار سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اس لئے ان کی نسبت ہمیں کعبہ، حج، مشاورت اور فوجی امور سے متعلقہ اعلیٰ عہدوں۔ رفاہ، ستقایہ، حجابہ، لوار اور ندوہ پر فائز ہونے کا زیادہ حق ہے، بنو عبد الدار ان کا یہ حق تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دو قرشی گھرانوں کے علاوہ جو غیر جانبدار رہے باقی سارے قریش کی دو پارٹیاں ہو گئیں، ایک بنو عبد مناف کے حمایتیوں کی، دوسری بنو عبد الدار کے ہوا خواہوں کی۔ بنو عبد مناف کی پارٹی میں یہ خاندان تھے۔ بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تمیم اور بنو حارث، بنو عبد الدار کی پارٹی میں بنو مخزوم، بنو سہم، بنو جمح اور بنو عدی تھے یہ دسوں خاندان قریب یا دور کے خونی و ازدواجی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے، اس کے باوجود خاندانی اعزاز اور شخصی پندار کے تقاضوں نے ان میں پھوٹ ڈال دی۔ بنو عبد مناف کی پارٹی نے عہد کیا کہ اگر صلح و آشتی سے ان کے مطالبے نہ مانے گئے اور جنگ تک نوبت پہنچی تو وہ پورے عزم اور یکجہتی کے ساتھ دوسری پارٹی سے لڑیں گے، پارٹی کے سارے اراکین نے یہ عہد کیا اور اسے زیادہ پختہ کرنے کے لئے ایک خوشبودار مرکب گھولا، اس سے ہاتھ رنگے اور کعبہ کی دیواروں پر چھاپ لگادی، اس عمل کے



کے باعث ان کا لقب مُطِیْبُون پڑ گیا، دوسری پارٹی کے ارکان نے ذبح کئے ہوئے جانور کے خون میں ہاتھ رنگ کر ان کا نقش کعبہ کی دیوار پر لگا دیا، بعض ارکان نے کچھ خون چاٹ لیا، یہ پارٹی اُطاف اور کُفۃ الدہم کے نام سے مشہور ہوئی۔ دونوں فریقوں نے پہلے مصالحت کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو ان کی فوجیں ایک دوسرے کے بالقابل صف آرا ہو گئیں۔ اس نازک وقت میں طرفین کے انجام پر نظر رکھنے والے عناصر کو اپنے اپنے موقف سے ہٹ کر اس سمجھوتہ کے لئے تیار ہونا پڑا کہ رِفَادہ اور سِقَیہ کے عہدے بنو عبد مناف کو دیدئے جائیں اور لوآر حجابہ اور ندوہ کے مناصب پر بنو عبد الدار فائز رہیں۔ اگرچہ پانچ عہدوں میں سے بنو عبد مناف کو دو عہدے ہی ملے تاہم یہ عہدے تھے سب سے زیادہ اعزاز کے حامل، ان پر فائز ہونے والا قریش کا سب سے مالدار و مخیر شخص سمجھا جاتا تھا اور اس کی طرف سے مفت کھانا اور پانی پاکر ہزاروں عرب زائرین کعبہ کے دلوں میں اس کی عزت کا نقش بیٹھ جاتا تھا، اس عزت کے بنو عبد مناف بھوکے تھے اور یہ انہیں حاصل ہو گئی۔ عبد مناف کے لڑکوں (مطلب، ہاشم، عبد شمس اور نوفل) نے دونوں عہدوں کے لئے قرعہ ڈالا، قرعہ ہشام کے حق میں نکلا، اس وقت ہاشمی مطلبی خاندانوں میں ہاشم ہی سب سے زیادہ مستعد، مالدار اور خیر خیرات کرنے والا شخص تھا، ہاشم ایک بڑی رقم رِفَادہ اور سِقَیہ کے لئے اپنے پاس سے دیا کرتا تھا اور قریش سے بھی چندہ لیتا تھا۔ رِفَادہ و سِقَیہ کا اعزاز پاکر اس نے ایک تقریر کی جس میں کہا: معشر قریش، آپ خدا کے پڑوسی ہیں اور اس کے گھر والے، موسم حج میں زائرین اگر خدا کے گھر کی تعظیم کرتے ہیں اس لئے وہ خدا کے مہمان ہوئے، خدا کا مہمان ہر مہمان سے عزت و احترام کا زیادہ حقدار ہے، خدا نے اپنی مہمانی کے فرائض کے لئے صرف آپ کو منتخب کر کے آپ کی عزت افزائی کی ہے، لہذا مہمانوں کی خاطر تو امانت کیجئے جو ہر علاقہ سے لاغزتھکے اونٹوں پر پریشان حال

آتے ہیں، گرمی اور عرصہ تک غسل نہ کرنے سے جن کے جسم بوجھ جاتے ہیں، جن کے کپڑوں میں کھٹل پڑ جاتے ہیں، جن کا زور ختم ہو جاتا ہے، ان کی ضیافت کیجئے اور پانی پلائیے۔ یا معشرۃ، انکم جیران اللہ و اهل بیتہ و انہ یأتیکم فی هذا الموسم زوار اللہ یعظون حرمۃ بیتہ فہم ضیف اللہ و احق الضیف بالکرامۃ ضیفہ و قد خصکم اللہ بذلک و اکرمکم بہ و حفظ منکم افضل ما حفظ جار من جارج، فاکرموا ضیفہ و نروہ، یا تون شعثا غبرا من کل بلد علی ضوامر کا نحن القداح قد ازحفوا و قفلوا و قتلوا و اسملوا فاقروہم و اسقوہم ہاشم چاہہ زرم کے پاس چڑے کے حوض بنواتا تھا، کنوؤں سے پانی منگو کر حوضوں کو بھرتا تھا اور حاجیوں کو پانی پلاتا تھا۔ مکہ، مہنی اور عرفات میں ان کی ضیافت کرتا تھا، ضیافت میں روٹی، گوشت کا سالن (شرید)، کبھی روٹی اور مکھن کا سالن ہوتا تھا، ستوا اور کھجور بھی تقسیم کرتا تھا۔ مکہ سے آٹھ نو میل مہنی میں بھی ہاشم نے پانی پلانے کا انتظام کیا تھا۔

ہاشم رسول اللہ کا پرداد تھا اور اپنے پرداد اٹھنی کی طرح موحّد لیکن مورتیوں کی تعظیم بھی کرتا تھا، ہاشم کے چھ بیویوں سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں جو قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں بیاہی تھیں۔ ہاشم کی ایک بیوی سلمیٰ مدینہ کے قبیلہ خزرج کے ایک رئیس کی بیوہ لڑکی تھی اور ہاشم کی طرح تجارت کرتی تھی، ہاشم نے ایک تجارتی سفر کے دوران مدینہ میں اس سے شادی کر لی اور شادی کے بعد اپنے تجارتی تافلہ کے ساتھ شام چلا گیا، وہاں بمقام غزہ بیمار پڑا اور ایسا کہ جان بر نہ ہو سکا۔ آٹھ نوماء ہاشم کی بیوہ کے بطن سے شبیبہ نامی ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے عبدالمطلب کے نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ ہاشم کا سب سے زیادہ لائق، ہوشمند اور نامور لڑکا تھا، بڑا قد اور حسین و جمیل اور اپنے عہد میں مکہ کے مذہبی، قبائلی اور سیاسی افتخار کا سب سے روشن ستارہ تھا، ہاشم نے وفات کے وقت اپنے بڑے بھائی مطلب کو رفاہ اور بقایہ کے عہدے



سونپ دئے تھے۔ ایک تجارتی سفر کے دوران مطلب کا یمن کے شہر ردمان میں انتقال ہو گیا، مکہ کی ریاست اہلی اور رفادہ و سبایہ کے عہدوں پر عبدالمطلب جو اس وقت خوب جوان تھے فائز ہوئے۔ عبدالمطلب کے بارے میں عربی آثار و اخبار کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں :

عبدالمطلب خدا پرست آدمی تھے، ان کی نظر میں ظلم اور بدکرداری گناہ عظیم تھے (کان عبدالمطلب یتأله و یعظم الظلم و الفجور)۔ عبدالمطلب ہر قرشی سے زیادہ وجیہ، قداور، بردبار، فیاض اور ہر طرح کے عیوب سے پاک تھے، جو بادشاہ انھیں دیکھتا ان کی عزت کرتا اور ان کی سفارش کو شرف قبول عطا کرتا، وہ آخری دم تک قریش کے زعمیم اعلیٰ رہے۔ عبدالمطلب اور ان کا حریف (ابوسفیان کا والد) حرب بن امیہ بن عبد شمس منافرت کے لئے حبشہ کے شاہ نجاشی کے پاس گئے، اس نے دونوں کی تمثیل و تقدیر کرنے سے انکار کر دیا، پھر انھوں نے ایک غیر جانبدار قرشی بزرگ نفیل بن عبد العزیٰ عدوی کو ثالث بنایا اور اس سے پوچھا کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ بافضلیت ہے۔ نفیل نے حرب بن امیہ کو مخاطب کر کے کہا : ابو عمرو تم ایسے شخص سے مناقب میں مقابلہ کرنے چلے ہو جو تم سے قد میں لمبا ہے، جس کا سر تمھارے سر سے بڑا ہے، جو تم سے زیادہ ٹھیکیل و جمیل ہے، جس میں کمزوریاں تم سے کم ہیں، جس کی اولاد تم سے زیادہ ہے، جو تم سے زیادہ گرانقدر عطیے دیتا ہے اور جسے بات کرنے کا تم سے بہتر سلیقہ ہے۔

یا ابا عمرو ابنا فرجلا هو أطول منك قامۃ و أعظم منك هامۃ و أوسم و سامۃ و أقل منك لامۃ و أكثر منك ولدا و أجزل منك صفدا و أطول منك مذودا۔

عبدالمطلب توحید کے قائل تھے، عہد و پیمان کا پاس کرتے تھے، انھوں نے ایسے ضابطے وضع کئے جن میں سے بیشتر کا قرآن نے حکم دیا ہے اور جن پر رسول اللہ عمل کرتے تھے۔ مثلاً

۱۔ ابن سعد ۱/۸۸، ۸۹

۲۔ ایضاً ۱/۸۵، ۸۶، انساب الاشراف ۱/۴۲

عہد و پیمان کی پابندی، دیت میں دس کی جگہ سو اونٹ ادا کرنا، ذو محرم سے نکاح کی ممانعت، گھروں میں پچھلے دروازوں سے داخل ہونے کی ممانعت، چور کا ہاتھ کاٹنا، بچیوں کو افلاس یا شادی کے عار سے قتل کرنے کی ممانعت، مباح کرنا، تحریم شراب و زنا، حد زنا، قرعہ اندازی، ننگے بدن خانہ کعبہ کے طواف کی ممانعت۔

عبد المطلب نے چھ شادیاں کیں، اُن کے ڈیڑھ درجن بچے تھے، بارہ لڑکے چھ لڑکیاں۔ عبد المطلب کی طرح ان کے سارے لڑکے تداور، خوبصورت، گورے اور ستوان ناک تھے اور سب کو معاشرہ میں عزت و رسوخ حاصل تھا۔

مکہ اور اس کے آس پاس کئی برس تک بارش نہیں ہوئی، پانی اور چارہ کی قلت کے باعث بہت سے مویشی ہلاک ہو گئے۔ ہاشم کی پوتی اور عبد المطلب کی بھتیجی رقیقہ نے خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے کہ ایک ایسا شخص منتخب کرو جس کا حسب نسب اچھا ہو، قد لمبا، رنگ گورا، بھویں جڑی ہوئی، ہلکیاں لمبی، بال گھنگرالے، کھلے چکینے، ناک تیلی، یہ شخص اپنے لڑکوں اور شہر کے ہر خاندان کے ایک مرد کے ساتھ پاک و صاف ہو کر ابو قبیس پہاڑی پر کھڑا ہو کر استسقاء کی دعا مانگے۔ عبد المطلب میں مذکورہ صفات موجود تھیں، وہ مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت کے ساتھ ابو قبیس پر چڑھ گئے اور یہ دعا مانگی: مالک، یہ تیرے غلام اور غلاموں کے غلام ہیں، تیری کینزیاں اور کینزوں کی بچیاں، ہم جس مصیبت میں مبتلا ہیں تو اس سے واقف ہے، بارش کے مسلسل قحط سے چوپائے اور مویشی ہلاک ہو گئے اور انسانوں کی جان پر بن آئی ہے، مالک قحط دور کر دے اور مینہ برسا دے۔ لاھم ہولاء عبیدک و بنو عبیدک و اِماؤک و بنات اِماؤک و قد نزل بنا ماتری و تلتایت علینا ہذہ السنون فذہبت بالظلف

۱۔ یعقوبی (تاریخ، بیروت) ۲/۱۰-۱۱

۲۔ ابن سعد ۱/۹۲-۹۳



وَالْحُفَّ وَأُشْفَتْ عَلَى الْإِنْفُسِ نَازِهُبٌ عَنِ الْجُدُبِ وَأُتْنَا بِالْحَيَا وَالْخَصْبِ - ذرادیہ بعد  
اتنی بارش ہوئی کہ وادیاں بہنے لگیں۔

مُحَمَّدُ بْنُ نُوفَلٍ: عَبْدِ الْمَطْلَبِ کے انتقال کے وقت میں بیس سال کا تھا، میری ماں  
رُتَبِیْقَةُ بِنْتُ الْبُوصَیْنِ بن ہاشم نے مجھ سے کہا: بیٹے، نانا کے غم میں قمیص پھاڑ ڈالو، اب  
کس کے لئے اسے محفوظ رکھنا ہے۔ میں نے دیکھا کہ عبد مناف کی عورتوں نے (عبد المطلب  
کے سوگ میں) اپنے بال کاٹ ڈالے ہیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر اسی نوے کے درمیان  
بتائی جاتی تھی، ان کا تدبیر بالکل سیدھا تھا، وہ پہلے شخص تھے جو غار حرا میں عبادت کے لئے  
جاتے تھے (کانِ اَوَّلِ مَنْ تَحَنَّنَتْ سَحَاءُ)، جب رمضان کا چاند نکلتا تو وہ غار حرا میں  
داخل ہو جاتے اور مہینہ ختم کر کے نکلتے، (غار حرا میں) غریبوں کو کھانا کھلاتے، کعبہ کا بکثرت  
طواف کرتے، مکہ میں ظلم و ستم انہیں سخت ناپسند تھا۔

## رسول اللہ کی ولادت کے وقت قریش

چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں حجاز کے عرب قبائل میں قریش کا قبیلہ سب سے زیادہ  
متمکن تھا، خانہ بدوش عربوں کے برخلاف جو سال کے بیشتر حصہ میں گھاس اور پانی کی تلاش میں  
صحراؤں پر گھومتے تھے قریش کی بود و باش ایک میدانی شہر میں تھی جس کا نام مکہ تھا، بکریاں  
اور اونٹ پالنے کے مروجہ عرب پیشہ کی بجائے وہ تجارت کرتے تھے، پرچون اور تھوک دونوں  
پرچون تجارت کم استطاعت قریشی کرتے تھے، تھوک تجارت مہتمول اور سرمایہ دار لوگ، مردوں  
کے علاوہ عورتیں بھی تجارت کرتی تھیں، کچھ خود بیچتی تھیں اور کچھ اجرت پر کاندول سے خرید و فروخت

۱۔ ابن سعد ۸۹-۹۰، انساب الاشراف ۸۲-۸۳

۲۔ انساب الاشراف ۸۳

کراتی تھیں۔ قریش میں لکھنے پڑھنے کا بھی رواج تھا، متوسط اور اعلیٰ درجہ کے قرشی تاجر بالعموم اپنا حساب کتاب رکھنے اور خط و کتابت کرنے کی حد تک لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کے بعض افراد جیسے ذرّہ بن نوفل اور نضر بن حارث عبرانی، ہریاتی اور فارسی زبانوں سے بھی واقف تھے اور انجیل، توراۃ، زبور اور اوستا کا مطالعہ کرتے تھے۔ قریش کی تمدنی ترقی کے دو سبب تھے: ایک خانہ کعبہ اور متعلقہ اداروں کی تولیت اور دوسرا بیرونی متمدن ملکوں سے تجارتی روابط۔ خانہ کعبہ توحید کا قدیم مرکز تھا جسے تین ہزار برس پہلے پیغمبر ابراہیمؑ نے قائم کیا تھا، ابراہیمؑ کے لڑکے اسماعیلؑ کے بعد ان کے جانشینوں کی معرفت مکہ کی مٹی میں بعض اہم اخلاقی و انسانی قدس جڑیں پکڑ گئی تھیں۔ رفادہ اور سقایہ کے اداروں کی عظیم مالی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک طرف قریش میں تجارت کے ذریعہ دولت کمانے کا داعیہ پیدا ہوا تو دوسری طرف اس اعزاز و جاہت کے شایان شان زندگی بسر کرنے کی اہمیت کا احساس بیدار ہوا جو مفت کھانا کھلانے اور پانی پلانے سے ہزاروں عربوں کی نظر میں انھیں حاصل ہو گئی تھی، اس احساس کے ماتحت وہ گھٹیا، نازیبا اور رسوا کن کاموں سے بالعموم احتراز کرتے تھے۔ دارالبندوہ نے ان میں سماجی شعور اور جنگ و تشدد کی بجائے حتی الامکان مشورہ کے ذریعہ خاندانی، قبائلی اور بین القبائلی معاملات طے کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ وہ پڑوس کے ان چار ملکوں میں تجارتی قافلے لے کر جایا کرتے تھے۔ عراق، شام، یمن اور حبشہ۔ یہاں کی متمدن ہوا میں نسائیں لینے، مدنیت کے مظاہر دیکھنے، عیسائی، یہودی اور صابئی مذاہب کے لوگوں سے میل جول، علماء اور مذہبی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کرنے، مالدار تاجروں سے خلط ملط رکھنے، رسم و رواج سیاست و معاشرت کی جھلکیاں دیکھنے سے ان کی ذہنی سطح بلند ہو گئی تھی، انھوں نے ان ملکوں کے ایسے طور و طریق اختیار کر لئے تھے جن پر عربی ماحول میں عمل کرنا ممکن تھا۔

قریش میں نہ ملوکیت تھی نہ آمریت، ان کے دس بارہ ممتاز خاندان تھے جن کے اکابر نے اپنی دولتمندی اور صلہ رحمی سے اپنے خاندانوں میں اعزاز و صوغ حاصل کر لیا تھا۔



یہ اکابر دارالندوہ میں بیٹھ کر خاندانی، قبائلی اور بین القبائلی مسائل پر گفتگو کر کے فیصلے کیا کرتے تھے، فیصلے متفقہ یا اکثریت کی رائے سے ہوتے تھے۔ ہر خاندان کو اکثریت کی رائے سے اختلاف کرنے کا حق تھا، اس صورت میں بالعموم اس کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی جاتی تھی البتہ وہ ہدفِ ملامت بن جاتا تھا۔ قبیلہ میں نسبی شرافت کے بعد عزت و رسوخ حاصل کرنے کے دو طریقے تھے: دولتمندی اور دولت کو اپنے کنبہ کے علاوہ دوسرے ضرورتمندوں، بھوکوں، قحط زدوں، قرض داروں، یرغامی کاموں اور ہنگامی مالی مواخذات پر خرچ کرنا۔ چونکہ سب خاندانوں کی دولت اور داد و دہش یکساں نہ تھی اس لئے قبیلہ میں سب کی عزت و رسوخ بھی یکساں نہ تھا۔ رسول اللہ کے زمانہ میں سب سے زیادہ دولتمند اور داد و دہش کرنے والے خاندان تین تھے: بنو ہاشم و مطلب، بنو اُمیہ اور بنو مخزوم۔ بنو ہاشم و مطلب کے خاندان میں یرغادہ و سقایہ کے ادارے بھی تھے اس لئے انھیں قبیلہ سے باہر سارے ملک کے عربوں میں بھی عزت و وجاہت حاصل تھی، اس وجاہت نے ان کی مقامی عزت و وقار میں چار چاند لگادئے تھے اور سارے قرشی خاندانوں میں انھیں ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اکثر قرشی خاندانوں اور بالخصوص ان تینوں میں دولت بڑھانے اور اسے اعانتی کاموں میں خرچ کر کے معاشرہ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عزت و رسوخ حاصل کرنے کا مقابلہ رہتا تھا۔ کم عزت اور کم دولت خاندان زیادہ دولتمند اور زیادہ معزز خاندانوں پر رشک کرتے تھے جس میں حسد کی بھی چاشنی ہوتی تھی لیکن وہ لڑتے نہ تھے، لڑائی کی جگہ ان خاندانوں یا ان کے افراد میں منافرت نے لے لی تھی۔ جب دو خاندانوں کے دو ممتاز فرد معاشرہ میں اپنی دولتمندی اعلیٰ نسب، داد و دہش اور فیکنامی کے باعث سمجھتے کہ ہم دوسرے سے بہتر ہیں تو وہ کسی کا ہنر کسی عظیم ہستی یا بھروسہ کے آدمی کو ثالث بنا کر اس سے اپنی تمین و تقدیر کراتے تھے۔ اس طرح کی تمین و تقدیر کراتے والے قرشی افراد و خاندانوں کے چند نام یہ ہیں: ہاشم و اُمیہ بن عبدمنہ عبدالمطلب اور خرب بن اُمیہ، عاذ بن عبد اللہ مخزومی اور عاریث بن اسد بن عبد اسزی، خاندان

قصی اور خاندان مخزوم، خاندان مخزوم اور خاندان امیہؓ۔

اکابر قریش نہ خود لڑتے تھے نہ پڑوس کے عرب قبیلوں میں لوٹ مار کرتے تھے جیسا کہ دوسرے بہت سے قبیلے قحط، ناداری یا انتقامی جذبہ کے ماتحت کیا کرتے تھے، قریش حتی الامکان خون ریزی سے بچتے اور بد امنی کی فضا پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ مکہ کے باہر مشرق میں دور تک بہت سے چھوٹے بڑے قبیلے آباد تھے، قریش کے موثر اعلیٰ اسماعیلؓ کی اولاد میں جیسے کنانہ، نضر بن کنانہ، اسد بن کنانہ، دلش، احابیش، مالک بن نضر، نضر بن مالک، محارب بن نضر، لؤئی بن غالب، کعب بن لؤی، اور مرہ بن کعب۔ ان قبیلوں کے پڑوس میں غیر اسماعیلی نسل کے متعدد قبیلے آباد، اسماعیلی وغیر اسماعیلی قبیلوں میں گاہے گاہے لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے، کبھی اسماعیلی قبیلہ کا کوئی شخص غیر اسماعیلی قبیلہ کے کسی فرد کو طیش میں آ کر یا کسی بد عنوانی پر مار ڈالتا تھا اور کبھی غیر اسماعیلی قبیلہ کا کوئی آدمی اسماعیلی قبیلہ کے آدمی کے ساتھ اس طرح کی کوئی حرکت کر بیٹھا تھا جس کے نتیجہ میں دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن جاتی تھی۔ اسماعیلی قبیلوں نے اپنے ہاتھ مضبوط کرنے، اپنی دفاع موثر بنانے اور غیر اسماعیلی قبیلوں کے جارحانہ رجحانات کی روک تھام کے لئے قریش اکابر سے باہمی مدد کے معاہدے کر لئے تھے جنہیں عرف عام میں حلیف کہتے تھے اور حلیف کرنے والوں کو حلیف۔ اگر ایک حلیف پر کوئی پڑوسی قبیلہ دست درازی کرتا تو دوسرے حلیف پر اس کی مدافعت کرنا لازم تھا۔ قریش نے ایسے غیر اسماعیلی قبیلوں سے بھی باہمی مدد کے معاہدے کر لئے تھے جو ایک زمانہ میں مکہ کے حکمران اور کعبہ کے متولی رہے تھے، جنہیں بعد میں قریش کے پہلے حاکم قصی نے مکہ سے نکال دیا تھا یا جو نامساعد حالات سے مجبور ہو کر خود مکہ چھوڑ کر آس پاس کی وادیوں میں بس گئے تھے جیسے خزاعہ کی شاخیں۔ یہ حلیف قبیلے جنگ کی لپیٹ میں آ کر قریش اکابر سے مدد مانگتے تو معاہدوں کے تحت انہیں مدد کرنا پڑتی لیکن ان کی



مدد پیشتر متفقہ، گھوڑوں اور اونٹ یا ان تینوں کی فراہمی کے لئے روپیہ کی شکل میں ہوتی، قریشی خود جنگ و قتال میں نہ تو ماہر تھے نہ پیسے کو جان پر قربان کرنا پسند کرتے تھے، وہ مصالحت کے ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر لڑائی بند کر دیتے تھے۔ رسول اللہؐ کے بچپن سے ہجرت تک چالیس پچاس سال کے عرصہ میں قریشی اکابر نے کئی بار اپنے حلیف قبیلوں کی مدد کی جب پڑوسی قبیلے ان سے متصادم ہوئے۔ ان میں سے دو جنگوں نخلہ اور شمشطہ میں رسول اللہؐ خود بھی اپنے چچاؤں کے ساتھ شریک ہوئے تھے، ان دونوں میں فریقین کے دوسو سے زائد آدمی ہلاک ہوئے لیکن باقی لڑائیاں معمولی جھڑپوں تک محدود رہیں، ان معرکوں میں جو ایام الفجار کے نام سے مشہور ہیں قریشی اکابر نے جنگ کے دواعی دور کرنے، مقتولین کی دیت ادا کرنے اور فریق مخالف کی تالیف قلب کر کے جنگ ختم کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔ بیرونی قبیلوں کے علاوہ قریش نے اپنے خاندانوں سے بھی متعدد حلف کئے تھے جن میں سے حلف فضول کو خاص اہمیت حاصل تھی، یہ حلف ظلم و حق تلفی کا سد باب کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ اس کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ایک قریشی نے کسی یمنی تاجر کا سامان خریدا اور قیمت ایک مقررہ وقت پر ادا کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن وعدہ وفانہ کیا، جب یمنی تاجر کے سارے تقاضے بے سود ثابت ہوئے تو اس نے ایک ہاٹ میں بر ملا شکایت کی۔ قریشی اکابر نے جو ہاٹ میں بسلسلہ تجارت آئے ہوئے تھے بہت خفیف ہوئے اور ظلم و بد معاملگی کی روک تھام کے لئے خاندان ہاشم و مطلب، خاندان زہرہ اور خاندان تیم کے اکابر ایک قریشی رئیس عبداللہ بن جعدان کے گھر جمع ہوئے اور معاہدہ کیا کہ اگر مکہ میں کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و بے انصافی کرے گا تو معاہدہ کرنے والے سارے خاندان اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مظلوم کا ظالم سے حق دلوا دیں گے۔

۱۔ انساب الاشراف / ۱-۱۰۲، ۱۰۳

۲۔ سنن ص ۴۴، ۴۵، ابن سعد / ۱۲۸، ۱۲۹، یعقوبی / ۱۷/۲

قریش موحّد تھے لیکن ان کا سواد اعظم مخصوص مورتیوں۔ لات، عزیٰ، مناف اور  
ہبل کی تعظیم کرتا تھا، ان کا عقیدہ تھا جیسا کہ متعدد قدیم تہذیب یافتہ اقوام، یونانیوں، ہندوؤں  
اور صابئہ کا تھا کہ مورتیاں خدا کی مقرب ہستیاں ہیں جن کی اگر تعظیم کی جائے، خوش رکھا جائے،  
جنہیں نیاز مندی دکھائی جائے، جن پر قربانیاں کی جائیں تو وہ خدا سے سفارش کر کے حاجتمندوں  
کی حاجتیں پوری کر دیتی ہیں اور ان کے کاموں میں برکت پیدا کرتی ہیں۔ قریش کے آباؤ  
اجداد میں مورتیاں رائج کرنے والا پہلا شخص عمرو بن لُحی خندنی تھا، اسماعیل کی اولاد میں،  
قریش کے پہلے حاکم قصی سے بارہ پشتیں قبل۔ قریش میں ایسے لوگ ہر زمانہ میں ہوتے رہے  
جو خالص موحّد تھے، جو دربار خداوندی میں بتوں کے مقرب ہونے اور ان کی معرفت خدا سے  
سفارش کا عقیدہ باطل قرار دیتے تھے، جو مورتیوں کو پتھر کے ڈھانچہ سے زیادہ وقعت نہ  
دیتے تھے اور ان لوگوں کو سادہ لوح، کج فہم اور گرفتار توہم سمجھتے تھے جو بتوں کی تعظیم کرتے  
تھے، یہ لوگ خود کو خلیف اور دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے۔ ان میں سے چند مشہور یہ ہیں:  
۱۔ ابوکبشہ (وجز بن غالب) رسول اللہ کی پرمانی کا باپ، یہ مورتیوں اور ان کی تعظیم  
کرنے والوں کی مذمت کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے بعض قرشی اکابر رسول اللہ کا مذاق  
اڑانے کے لئے انہیں ابوکبشہ کہا کرتے تھے۔

۲۔ عثمان بن حویرث بن عبد العزیٰ بن قسّی۔ رسول اللہ کا ہم عصر۔

۳۔ فزقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزیٰ بن قسّی۔ خدیجہ کا چچا زاد بھائی اور رسول اللہ

کا ہم عصر۔

ب۔ انساب الاشراف ۹۱/۱

ج۔ منق ۱۴۵

د۔ ایضاً ۱۴۶، افان ۳/۳



۴۔ عبید اللہ بن جحش بن ربیع اسدی۔ رسول اللہ کا ہم عصر۔

۵۔ زید بن عمرو بن نفیل بن عبد العزیٰ عدوی۔ عمر فاروقؓ کا چچا زاد بھائی۔ عربی اخبار و آثار میں زید کے بارے میں یہ تصریح ملتی ہے: زید نے بتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا، صحیح مذہب کی تلاش میں شام آیا، یہود و نصاریٰ سے گنگو کی لیکن ان کے مذہب سے مطمئن نہیں ہوا اس نے مڑوہ، خون اور مورتیوں پر قربانی کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میں ابراہیمؑ کے رب کی عبادت کرتا ہوں، وہ ملت ابراہیمی کا پیرو تھا، ایک شخص نے دیکھا کہ زوال آفتاب کے بعد زید نے کعبہ کا رخ کر کے ایک رکعت نماز پڑھی اور دُوسجدے کئے، وہ سچ کرتا اور غرۃ میں کھڑے ہو کر کہتا۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ وَلَا نِدَا، پھر غرۃ سے چلتے وقت کہتا: لَبَّيْكَ مَتَعِبِدًا مَرْقُوقًا۔ زید ان لڑکیوں کا نفیل ہو جاتا تھا جنہیں ان کے والدین ناداری سے بچنے کے لئے زندہ دگر کر کے دے دیتے تھے اور وہ جب بڑی ہو جاتیں تو ان کے والدین سے کہتا: لڑکیوں کو لے لویا میرے پاس چھوڑ دو۔ عبد اللہ بن عمر۔ اعلان نبوت سے پہلے رسول اللہؐ زیرین بلذہ میں زید سے ملے اور اسے زادِ راہ پیش کیا جس میں گوشت بھی تھا، زید نے یہ کھکر گوشت کھانے سے انکار کر دیا کہ میں ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا جسے خدا کے نام پر ذبح کرنے کی بجائے مورتیوں پر ذبح کیا گیا ہو۔

### چند ممتاز قرشی موجد

۱۔ اُمیہ بن ابی العسل ثقفی۔ توحید خالص کا قائل تھا، ملت ابراہیمی کی تلاش میں اس نے شام کا دورہ کیا تھا، ایک اطلاع کے مطابق وہ خود بنی بنا چاہتا تھا اور اس کے لئے مناسب

کے متنق م

۳۸۱ - ۳۷۹/۲ ابن سعد

موقع کا منتظر تھا کہ رسول اللہؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا۔ اُمیہ شاعر بھی تھا اور اپنے کلام میں گرجوشی کے ساتھ توحیدی خیالات کی ترجمانی کرتا تھا، اس کے بہت سے شعر عربی لٹریچر میں محفوظ ہیں، اس کا کلام سن کر رسول اللہؐ بہت محفوظ ہوتے تھے۔

۲۔ اسعد بن زرارہ۔ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا مالدار زعیم، موجد اور رسول اللہؐ کا ہم عصر۔

۳۔ ابو قیس صرمہ نجاری۔ قبیلہ خزرج کا ایک خدا پرست زاہد اور رسول اللہؐ کا ہم عصر۔

۴۔ ابو عامر راہب (عبد عمرو بن صیفی) اوس کا بااثر لیڈر، موجد اور رسول اللہؐ کا

۵۔ ابو ہشیم مالک بن تہبان۔ قبیلہ اوس کا سردار، موجد اور رسول اللہؐ کا ہم عصر۔  
(باقی آئندہ)

۱۔ اغانی (ابوالفرج اصفہانی مصر) ۱۸۷/۲

۲۔ ابن سعد ۲۴۸/۳

۳۔ ابن ہشام ص ۲۲۸

۴۔ سمہودی (وفاء الوفاء مصر) ۲۵۷/۱، دیار بکری (تاریخ انجیس مصر) ۱۲۳/۲

الانساب الاشراف ۲۸۱/۱ - ۲۸۲

۵۔ ابن سعد ۲۴۸/۳

## گزارش

خریداری برہان یا ندوة المصنفین کی مبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا  
مئی آرڈر کرپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ نہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد  
میں تاخیر نہ ہو۔ (مینجر) ادارہ کے قواعد و ضوابط مفت طلب فرمائیے۔



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

۱۸۵۷ء میں تقسیم کے ساتھ ملک آزاد ہوا تو اب یونیورسٹی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تقسیم کو جس اصول اور جن وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ منظور کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں ۳ جون ۱۸۵۷ء کو پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ہاں کی اقلیتوں کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا اگر اس پر عمل کیا جاتا تو بات ہی کچھ نہ تھی، جس طرح ملک کی دوسری یونیورسٹیاں تھیں ایک یہ یونیورسٹی بھی تھی۔ ان کی ہیئت ترکیبی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس یونیورسٹی پر بھی نہ ہوتا، لیکن تقسیم سے پہلے جو شدید فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور جس کے نتیجے میں سرحد کے اُدھر اُدھر جو سیلابِ اشک و خون متلاطم ہوا اس نے یونیورسٹی کے نفس وجود کو معرضِ خطر میں ڈال دیا۔ تقسیم کے وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب مرحوم تھے جو مسلم لیگ کے بھی ایک نہایت اہم اور باوقار سربراہ تھے۔ اگر حالات نارمل ہوتے تو کوئی ضرورت نہ تھی کہ موصوف کو تقسیم کے بعد ان کا طریم ختم ہونے سے پہلے وائس چانسلر کے عہدہ سے سبکدوش کیا جاتا، لیکن حالات ایسے تھے کہ موصوف نے خود اس عہدہ پر قائم رہنا پسند نہیں کیا اور وہ الگ ہو گئے۔ ان کے بعد پنڈت جواہر لال

نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی متفقہ رائے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اس عہدہ کے لئے منتخب ہوئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ہندوستان کی ایک نہایت باوقار، معزز اور محترم شخصیت تھے۔  
 ڈاکٹر ذاکر حسین | ان کو حکومت اور اکثریت اور مسلمانوں سب کا اعتماد حاصل تھا، ان کی لیاقت، قابلیت، ان کا تعلیمی تجربہ، ان کی اخلاقی سر بلندی اور عظمت، ان کی جرأت حق گوئی و حق کوشی، ایک اعلیٰ مقصد کے لئے غیر معمولی ایثار و قربانی، ان کی سادہ اور بے لوث زندگی، یہ سب چیزیں روز روشن کی طرح ہر شخص پر عیاں تھیں، اس بنا پر جب وہ والس چالنر منتخب ہوئے تو ملک میں ہر طرف اس پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے سپرد جو ذمہ داری کی گئی تھی وہ وقت کی ایک نہایت اہم، نازک مگر سخت دشوار اور مشکل ذمہ داری تھی، اس ذمہ داری سے باحسن وجوہ وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا تھا جو دل میں سوز رکھتا ہو اور روشن دماغی کے ساتھ جس کی نظر بھی پاک ہو۔ اور ڈاکٹر صاحب میں ان اوصاف کی کمی نہیں تھی، مرحوم کے برادر خورد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول (یادوں کی دنیا ص ۱۳۱) مرحوم کو شروع میں علی گڑھ جانے میں پس و پیش تھا، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار پر وہاں جانے پر رضامند ہو گئے اور انھوں نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری سنبھال لی۔

ڈاکٹر صاحب یہاں کم و بیش آٹھ برس رہے، ان کے اس عہد کا یقیناً یہ بڑا کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی کے نفس وجود کو ہی جو خطرہ لاحق ہو گیا تھا، یونیورسٹی اس خطرہ سے نہ صرف یہ کہ محفوظ رہی، بلکہ جہاں تک تعلیمی اور انتظامی شعبوں کا تعلق ہے ان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوئی اور وہ ملک کی دوسری اعلیٰ ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی، ڈاکٹر صاحب کو یقیناً اس بات کا بھی کریڈٹ ملنا چاہیے کہ اس مدت میں انھوں نے کبھی اس امر



کو فراموش نہیں کیا کہ وہ کسی عام یونیورسٹی کے نہیں، بلکہ "مسلم یونیورسٹی" کے وائس چانسلر ہیں، چنانچہ نواب زادہ لیاقت علی خاں جو علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے ان کی وفات پر طلباء نے اپنی یونین کی دیرینہ ضابطہ کے ماتحت جب یونیورسٹی کا سائرن بجادیا اور اس پر ہندو فرقہ وارانہ اخبارات نے یونیورسٹی پر گندگی اچھالی تو ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر یونیورسٹی کے دفاع میں ایک ایسا پر زور بیان شائع کیا کہ ان اخبارات کے دانت کھٹے ہو گئے۔ لوگوں کا عام تاثر یہ ہے کہ یہ بیان ایسا ہی دندان شکن تھا جیسا کہ مولانا آزاد کی پارلیمنٹ میں وہ اہم تاریخی تقریر تھی جو انھوں نے ٹنڈن جی کی ایک تقریر کے جواب میں کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ میں قدم رکھا (اکتوبر ۱۹۴۸ء) تو اس وقت عالم یہ تھا کہ یونیورسٹی کے نامور اور دیرینہ اساتذہ کی ایک خاصی تعداد پاکستان جا چکی تھی، بچے کچھے جو یہاں تھے ان میں بھی متعدد اساتذہ جانے کے لئے پر تول رہے تھے علاوہ ازیں ملک کے اور دوسرے علاقوں کا حال بھی یہی تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہندوستان میں خال خال رہ گئے تھے، بیرونی ممالک میں جو مسلمان اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے ان سے توقع نہ تھی کہ وہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے وطن کا رخ کریں گے، اس لئے اس وقت سب سے بڑا اہم سوال یہ تھا کہ یونیورسٹی میں پروفیسروں اور ریڈروں کی جو جگہیں عنقریب خالی ہونے والی ہیں، ان کا بندوبست کیا ہوگا؟ تعلیم اور علاجِ امراض ان دونوں میں فرقہ واریت کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس بنا پر اس سوال کا ایک صاف اور سیدھا سا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں ہی نہیں تو یونیورسٹی میں پروفیسر یا ریڈر اور لکچرر کی جو جگہ بھی خالی ہو اس پر بے تکلف کسی مستحق غیر مسلم کا تقرر ہو جانا چاہئے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے واقف تھے کہ کسی شخص یا قوم کے جذبات اور اس کے نفسانی احساسات ہمیشہ منطق اور فلسفہ کے تابع نہیں ہوتے، اس بنا پر مسلم یونیورسٹی اگر اعلیٰ درجہ کے مسلمان اساتذہ سے خالی ہو گئی تو اس کا یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ اور خود مسلمانوں کے دل و دماغ پر کیا اثر پڑے گا،

ان وجوہ کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے اسٹڈی لیو (Study Leave) یعنی رخصت برائے تکمیل تعلیم کے قواعد و ضوابط میں بہت کچھ رد و بدل کیا اور مختلف فیکلٹیز میں جولاٹق و قابل اور مہونہار نوجوان اساتذہ تھے ان کو آمادہ کیا کہ وہ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی تکمیل کریں اور وہاں اپنے مضمون میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری لیکر علی گڑھ واپس آئیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریص و ترغیب پر نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس پر آمادہ ہو گئی اور موصوف نے ان لوگوں کے لئے ملک کے اندر اور باہر ہر قسم کی سہولتوں اور مالی امداد کا بندوبست کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے سخت صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات کے پیش نظر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ اس درجہ اہم اور عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب نے یہ کارنامہ انجام دیکر اس حیثیت سے یونیورسٹی کے مسلم کردار کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اس کارنامہ کو آید و مرداں چنیں کنند

چنانچہ آج آپ دیکھ لیجئے! عربی، فارسی، اردو اور دینیات کا تو کہنا ہی کیا ہے یہ شعبے تو مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں، آرٹس، سوشل سائنسز، سائنس، کامرس، قانون، انجینئرنگ ان سب فیکلٹیوں میں اور پالیٹکنک اور زنانہ کالج میں آپ کو مسلمان پروفیسر کی جو اکثریت نظر آتی اور سب ہی فیکلٹیوں کے ڈین جو مسلمان دکھائی دیتے ہیں تو یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کی ہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری کی دین ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے جو داغ بیل ڈالی تھی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان کے جانشینوں نے اس کو آگے بڑھایا، ترقی دی اور پروان چڑھایا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج علم و فن کا کوئی شعبہ یونیورسٹی میں ایسا نہیں ہے جس میں یورپ اور امریکہ وغیرہ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے والے مسلمان اساتذہ کثرت سے موجود نہ ہوں، اور جو اگر لکچرر ہیں تو ریڈر ہیں تو



پروفیسر کی جگہ پر مقرر ہونے کا استحقاق نہ رکھتے ہوں۔

یونیورسٹی کے ”مسلم کردار“ کے سلسلہ میں اس اہم کارنامہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے تین اہم سرچ اسکیمیں جو لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کی تھیں حکومت سے منظور کرائیں، ان میں ایک مشرق وسطیٰ پر سرچ کی، ایک اسلامیات پر سرچ کی، اور ایک اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم تھی، حکومت نے اس سلسلہ میں جس فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی اسلامی ملک بھی اس سے زیادہ اور کیا کرے گا، یہ دوسری بات ہے کہ آخری دو اسکیموں پر جو کام ہوا ہے وہ مجموعی اعتبار سے یونیورسٹی کی نیک نامی نہیں بلکہ اس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث ہوا ہے، لیکن یہ تصور ان لوگوں کا ہے جن کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، اس میں گورنمنٹ یا ڈاکٹر صاحب کا کیا تصور؟ ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ پہنچے ہیں تو اس وقت یونیورسٹی کا بجٹ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ لیکن آٹھ سال کے بعد جب وہ یہاں سے رخصت ہوئے تو بجٹ پچاس لاکھ سالانہ تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس مختصر مدت میں ہی یونیورسٹی کے کاموں میں کس قدر وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے لیکن جمالیات کا ذوق فطری تھا اور پھول پھلوانی کا انھیں بڑا شوق تھا، اس کا مظاہرہ علی گڑھ میں بھی ہوا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے پوری

۱۷ جب جامعہ قریل باغ میں تھی، ہمارا دفتر برہان بھی وہیں تھا، اس لئے ہم لوگ اکثر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر اور ڈاکٹر صاحب بھی کبھی دفتر برہان میں اور کبھی ہمارے مکان پر آتے جاتے رہتے تھے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا رہن سہن کس قدر سادہ تھا! اس زمانہ میں اس کا باور کرنا بھی شاید مشکل ہو۔ ایک تخت جس پر کھدک چاند بھی ہوتی تھی، دو چار مونڈھے، بس شیخ الجامعہ کے ڈرائنگ روم کی کل کائنات تھی، چائے آتی تھی تو ہینڈستان کی بنی ہوئی پیالیوں میں اور وہ بھی اس طرح کہ کبھی اس کے ساتھ بسکٹ یا دال سواگئے تو آگئے مدینہ صرف چائے، اس زمانہ میں پیدل پھرنے کا ٹانگہ اور ٹاموے میں سفر کرنا ڈاکٹر صاحب کیلئے روزمرہ کی بات تھی۔

یونیورسٹی کی چین بندی کر کے اس کو لالہ زار بنادیا۔ غرض کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہی کے سخت نازک دور میں مسلم یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی، بلکہ اس نے صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے جو غیر معمولی ترقی کی وہ جہاں ایک طرف گورنمنٹ کی کشادہ دلی اور فیاضی کی دلیل ہے تو دوسری جانب ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بیدار مغزی، روشن دماغی اور ان کے عزم و خلوص کا بھی روشن ثبوت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بجائے ایک نیا ایکٹ بنا  
 ۱۹۵۱ء کا ایکٹ | جو ۱۹۵۱ء مسلم یونیورسٹی امینڈمنٹ کہلاتا ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے ۱۹۵۱ء  
 کے ایکٹ کی متعدد دفعات بدل گئیں، مثلاً ۱۹۲۰ء ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی کورٹ کی ممبر شپ  
 مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی اب اس کا دروازہ غیر مسلموں کے لئے بھی کھول دیا گیا۔ پہلے  
 وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ کے ممبر کرتے تھے اب یہ قرار پایا کہ اگر کونسل تین اشخاص پر  
 مشتمل ایک پینل بنائے گی اور صدر جو اپنے عہدہ کے اعتبار سے یونیورسٹی کے ڈیڑھ ہوں گے وہ  
 ان تین میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس کو وائس چانسلر بنائیں گے، ۱۹۲۰ء کے ایکٹ  
 میں دینیات کی تعلیم ہر مسلمان طالب علم کے لئے ضروری تھی۔ اب دینیات کو لازمی مضامین میں  
 سے ایک مضمون بنایا گیا، یعنی اگر کوئی مسلمان طالب علم چاہے تو وہ دینیات کے علاوہ اس کا  
 ایک متبادل مضمون بھی اختیار کر سکتا ہے، علاوہ اور چھوٹی بڑی تبدیلیاں بھی ہوئیں لیکن اہم  
 اور بنیادی تبدیلیاں یہی تھیں۔ ہماری رائے میں یہ تبدیلیاں وقت اور حالات کے تقاضہ کے  
 مطابق تھیں اور ناگزیر تھیں، اگر سرسید زندہ ہوتے تو یقیناً ہے وہ خود بھی ان کو قبول کر لیتے،  
 کیونکہ انگریزوں کے عہد میں تو ہندو اور مسلمان الگ الگ دو کیمپ میں تھے۔ ہندو بنارس  
 یونیورسٹی صرف ہندوؤں کے لئے تھی اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے، اس لئے وہاں کوئی  
 مسلمان کورٹ کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں کورٹ کی ممبر شپ مسلمانوں کے لئے مخصوص تھی،  
 لیکن اب ملک آزاد تھا، یہاں ایک قومی حکومت قائم تھی، اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تعلیم



کے میدان میں بھی بعد و انتراق کی جو دیوار حائل تھی اسے لامحالہ گرنا تھا، یونیورسٹی اب سنٹرل گورنمنٹ کی یونیورسٹی تھی اور اس کے تمام اخراجات کی تکفل گورنمنٹ تھی اس بنا پر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ کورٹ میں گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کا کوئی نمائندہ نہ ہو، یا یونیورسٹی کے غیر مسلم اساتذہ میں سے جس کو اپنے عہدہ کے اعتبار سے کورٹ کا ممبر ہونا چاہئے تھا اسے محض غیر مسلم ہونے کے باعث کورٹ کی مبری سے محروم رکھا جاتا، یہی صورت حال ہکنٹو کونسل اور اکاڈمک کونسل کی بھی تھی، البتہ اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ یہ ایک اسلامی تہذیب کی نمائندہ یونیورسٹی تھی اس بنا پر اس کے اسلامی کردار کو باقی رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کورٹ میں بہر حال اکثریت مسلمانوں کی رہے، کیونکہ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے اور اس لئے یہاں فیصلے ووٹوں کی اکثریت پر ہوتے ہیں، مسلمانوں کے ووٹ اگر کم ہوئے تو اندیشہ ہے کہ کورٹ کبھی اپنے غیر مسلم ممبروں کے ووٹوں سے کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس سے یونیورسٹی کا اسلامی کردار مجروح ہو جائے۔ اگرچہ بد قسمتی سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اسلامی ملکوں میں بھی مسلمانوں میں ترقی پسند افکار و خیالات کے عام اور مقبول ہو جانے کے باعث اب کسی ادارہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو بھی اسلامی مفادات کے تحفظ اور ان کی بقا کا ضامن نہیں کہا جاسکتا، اور پھر یہ بھی ایک

۱۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں جب میں گلگتہ سے علی گڑھ آیا تو بعض دوستوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صنا کے عہد میں جب دینیات کا معاملہ اکاڈمک کونسل میں آیا تو ترقی پسند مسلمانوں کے ایک گروپ نے اس مضمون کو سرے سے ختم ہی کر دینے کی تجویز کی اور اس پر تقریریں کیں، لیکن جن لوگوں نے اس تجویز کی مخالفت میں سخت تقریریں کیں اور دینیات کو حسب سابق لازمی مضمون کی حیثیت سے باقی رکھنے کی پُرور حالت کی ان میں پیش پیش دو ہندو پروفیسر بھی تھے، ایک فزکس ڈپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر گل اور دوسرے شعبہ ہندی کے صدر پروفیسر شرما۔ اور اس طرح دینیات کا مضمون اپنی حیثیت میں محفوظ رہ گیا، علامہ علی خود میر نے زمانہ کی بات ہے۔ ایک مرتبہ جب کورٹ میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ یونیورسٹی میں (بقیہ صفحہ ۱۰۳ پر)

حقیقت ہے کہ اسلامی مفاد ہے کیا؟ اس سوال کے جواب میں بھی کوئی بات قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے، مثلاً ایک پختہ اور راسخ العقیدہ مسلمان کی ایمانداری سے یہ رائے ہے کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی علم و فن کے ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہئے کیونکہ یہ زمانہ مناسبت اور مقابلہ کا ہے اور اس لئے اسلامی مفاد کا تقاضا ہے کہ جن چیزوں سے قومیں ترقی کر رہی ہیں اور آگے بڑھ رہی ہیں ان میں مسلمانوں کا قدم بحیثیت ایک قوم کے کسی سے پیچھے نہ ہو، لیکن چند دوسرے مسلمان ہیں جو اس خیال کے حامی نہیں ہیں، اور دلائل کا سرمایہ ان کے پاس بھی کم نہیں، اب فرمائیے! اس صورت میں آپ کس خیال کو اسلام کے مفاد میں کہیں گے! بہر حال عام رسم و رواج اور قانون و دستور کے لحاظ سے کسی ایک قوم کے مفاد کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے افراد اکثریت میں رہیں، وہ افراد اگر خود ہی اپنے گھر کو آگ لگانے پر تیل جائیں تو دنیا میں اس کا علاج کہیں بھی نہیں۔ اس بنا پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادی کے بعد (اگر ملک تقسیم نہ ہوتا تب بھی) شیعہ کے ایکٹ میں امنڈمنٹ ضروری تھا اور یہ امنڈمنٹ شیعہ ایکٹ سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا، اور ہونا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے اور یہ ایکٹ انھیں کے دماغ کا تراویدہ تھا، اور کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مسیحی کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ کھولا جائے تو میں نے اور بعض ممبروں نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں، لیکن ایک مسلمان پروفیسر نے جو نماز روزہ کے پابند تھے اس تجویز کی حمایت میں ایک طویل اور پر زور تقریر کی اور استدلال میں کہا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں حجاز، بغداد اور کوفہ و بصرہ مسیحی کا گہوارہ ہو گئے تھے، میں ان کی تقریر پر حیران رہ گیا۔ موصوف اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ کورٹ کی میننگ کے بعد جب میں نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے یہ کیا کیا تو ایک بڑے زور کا تہقہہ لگا کر بولے۔ مجھے یقین تھا کہ تجویز منظور نہ ہوگی، لیکن میں چاہتا تھا کہ دیکھوں آپ میری دلیل کا کیا جواب دیتے ہیں۔



مسلمان اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ملک میں اسلامی مفاد کے تحفظ کا جو درد اس کے دل میں ہے وہ مولانا کے دل میں بھی نہیں تھا۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں یہ بل آیا اور منظور ہوا۔ اور اس وقت مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی (جمعیت العلماء) اور مسٹر محمد اسماعیل (مسلم لیگ) پارلیمنٹ میں موجود تھے، کسی نے اس بل کی مخالفت نہیں کی۔ اخبارات میں اور پبلک میں بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھی۔ اور کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا۔

اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ میں مسلمانوں کی اکثریت کو محفوظ رکھنے کا بندوبست یہ کیا گیا تھا کہ مسلم اداروں اور مسلم علاقوں (constituency) کو نمائندگی خاطر خواہ طور پر دی گئی تھی، چنانچہ اس ایکٹ کے ماتحت کورٹ کی جو تشکیل ہوئی اس میں جب تک یہ ایکٹ نافذ رہا مسلمانوں کی نمایاں اکثریت قائم رہی، اب رہا وائس چانسلر کا انتخاب! تو اگرچہ پہلے (۱۹۴۷ء) ایکٹ کے ماتحت) اس کا انتخاب کورٹ کرتا تھا، اور اب یہ انتخاب بہ صورت پینل (Penal) اکر کٹو کونسل کے سپرد کر دیا گیا جس میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہی ہوتی تھی تو اس میں فرق ہی کیا پڑا؟ فرق صرف اس قدر ہوا کہ اب پینل میں سے انتخاب وزیر کے سپرد کر دیا گیا، اس سے اسلامی کردار کس طرح مجروح ہو سکتا ہے؟ وزیر آخریونیورسٹی کا سب سے بڑا عہدہ دار ہے اور ملک کا صدر جمہوریہ! اگر اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو آخر یہ مسلمان اس ملک میں رہیں گے کس طرح؟ بہر حال جہاں تک کورٹ کی ممبر شپ، اس کے اختیارات اور اس کے نفوذ و اثر اور وائس چانسلر کے انتخاب کا معاملہ ہے، اسے کے ایکٹ میں ہرگز کوئی بات

۱۔ اس بے دماغی اور سبک دہنی کی مثال بھی شاید کہیں اور مشکل سے مل سکے گی کہ جو حضرات اس وقت خاموش رہے تھے اب اسے منڈ منڈ ایکٹ سامنے آیا تو اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے میں بھی کپڑے نکالنے لگے ہیں گویا اب تک وہ سو رہے تھے اب جاگ پڑے ہیں یا اس وقت ان کی زبان بندی تھی اب زبان کھل گئی ہے۔

ایسی نہیں ہے جو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض یا اشتباہ انگیز ہو، بلکہ حق یہ ہے کہ جدید حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دستوری طور پر دوسری سنٹرل یونیورسٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ تبدیلیاں ناگزیر اور ضروری تھیں !

اب رہا دنیات کا معاملہ ! تو اس میں بے شک یہ تغیر ضرور ہوا کہ پہلے یہ مضمون ہر دنیات مسلمان طالب علم کے لئے لازمی تھا، لیکن اب یکے از مضامین لازمی ہو گیا، اور ایک مسلمان طالب علم کو بھی یہ حق ہو گیا کہ اگر وہ چاہے تو اس کو چھوڑ کر اس کا کوئی دوسرا متبادل مضمون لے سکتا ہے، لیکن اس تبدیلی کو بھی یونیورسٹی کے اسلامی کردار پر اثر انداز کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے ؟ سب جانتے ہیں کہ دنیات کا مضمون اب تک لازمی ضرور تھا، لیکن علاؤ اس کی حیثیت کیا تھی ؟ اس کا نصاب کس درجہ ناقص اور اصلاح طلب تھا، اور اس کی تعلیم کس درجہ بے اعتنائی اور بے توقیری کے ساتھ ہوتی تھی، لوگ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں اس کے نصاب اور طریق تعلیم کا مذاق اڑاتے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایک عملی اور حقیقت پسند آدمی تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ میں محض کاغذی طور پر اس کو لازمی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو طلباء اسے پڑھنا چاہتے ہیں انہیں ضرور اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے، لیکن تعلیم صحیح معنی میں تعلیم ہونی چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ایک کمیٹی مقرر کر دی جس کے ممبر (جیسا کہ اب مجھے یاد ہے) حسب ذیل افراد تھے :

- (۱) نواب حاجی عبید الرحمن خاں صاحب شیروانی (۲) مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاری (۳) مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی (۴) مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی (۵) ڈاکٹر عبد العظیم (۶) سید اسماعیل آبادی۔

جب میں اس کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے کلکتہ سے علی گڑھ آیا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ



سے مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے ساتھ شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ حسب معمول بڑے تپاک اور گرم جوش سے ملے، اثنائے گفتگو میں دینیات کا ذکر آیا تو اپنے مخصوص والہانہ انداز میں فرمایا: لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ دینیات کا مضمون لازمی نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ کاغذی تحفظات اور محض رسم پرستی کا وقت نہیں ہے، بلکہ عمل کا اور کچھ کر دکھانے کا وقت ہے، جو طلباء کسی وجہ سے دینیات پڑھنا نہیں چاہتے ان کو خواہ مخواہ اس پر مجبور کرنا عقلمندی نہیں ہے، البتہ جو طلباء پڑھنا چاہتے ہیں — اور مجھ کو امید قوی ہے کہ اکثریت عظمیٰ ایسے ہی لڑکوں کی ہوگی — ان کو دینیات ضرور پڑھنی چاہئے، لیکن اس کی تعلیم محض رسمی اور بڑا خانہ پر ہی نہیں، بلکہ حقیقی اور اس کی اصل اسپرٹ کے ساتھ ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اس کا نصاب از سر نو مرتب کیا جائے جو وسیع و ہمہ گیر اور یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ یہ کمیٹی اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اور آپ کو یہ کام کتنا ہے۔

جب میٹنگ ہوئی تو نصاب سے متعلق بحث و گفتگو ہوئی اور آخر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ میں انٹرمیڈیٹ اور بی، اے کی کلاسوں کے لئے ایک نصاب بنا کر کلکتہ سے بھیج دوں، میں نے اس تجویز کی تعمیل کی اور ایک نصاب بنا کر حاجی عبید الرحمن خاں صاحب شیخانی کو جو غالباً اس کمیٹی کے کنوینر تھے بھیج دیا، اس کے بعد کمیٹی کی پھر ایک میٹنگ ہوئی جس میں بعد مسافت کے باعث شریک نہ ہو سکا۔ کمیٹی نے اس نصاب پر غور کر کے اس کو منظور کر لیا، اور پھر غالباً مولانا ابوالحسن علی میاں کی تحریک سے کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اب میں ہی اس نصاب کے مطابق ایک کتاب تیار کروں، میں اس زمانہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے بعض انتظامی معاملات کی وجہ سے سخت پریشان اور پر اگندہ خاطر تھا اور ابھی اپنی کتاب ”مدینۃ اکرہ“ کی تصنیف سے فارغ ہوا ہی تھا۔ بہر حال میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور جس طرح بن پڑا دین میں مہینہ میں ”دینیات“ کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے حاجی صاحب موصوف کی خدمت میں اس کا مسودہ ارسال کر دیا۔ کمیٹی نے اس کو بھی پسند کیا اور منظور فرمایا، اور خیر خواہ مولانا علی میاں نے اس کی بڑی تحسین کی،

چنانچہ یہ کتاب شائع ہو کر دنیات کے نصاب میں شامل ہو گئی اور الحمد للہ کہ آج تک گریجویٹ کلاسز میں وہ شامل نصاب ہے، اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے نصاب دینیات کی مقبول اور پسندیدہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ بد قسمتی سے بعض مسلمانوں کا دھیرہ یہ ہو گیا ہے کہ ایک بات پکڑ لی اور اس پر شور مچانا شروع کر دیا۔ ان حضرات کو شیعہ ایکٹ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ پہلے دینیات لازمی تھیں، اب اس کی حیثیت باقی نہیں رکھی گئی۔ حالانکہ گذشتہ سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ دینیات نہ صرف یہ کہ باقی رکھی گئی ہے، بلکہ اس کی فعالیت اور افادیت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے، رہا اس کا لازمی نہ ہونا! تو عملاً اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ عملاً مسلمان طلباء اب بھی ننانوے فی صدی دینیات ہی لیتے ہیں، بہر حال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیعہ ایکٹ سے یونیورسٹی کے اصل بنیادی مقاصد اور اس کی ہیئت ترکیبی پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوتا۔ اور یہ ایکٹ یونیورسٹی کو وقت اور زمانہ کے حالات و مقتضیات کے ساتھ مطابق کرنے کی کوئی نامستحسن کوشش نہیں ہے، جو لوگ شیعہ کے ایکٹ کی آڑ میں اب اس کا بھی ماتم کر رہے ہیں ان کا طریق فکر اور کرینٹ پٹری خود دلائق ماتم ہے۔

مسلمانوں کے بعض طبقوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت مختلف فیہ بھی ہے،  
ایک مختلف فیہ شخصیت اور بعض دماغوں میں اس سلسلہ میں بڑے شکوک و شبہات ہیں۔ پھر چونکہ

مسلم یونیورسٹی اپنے اس سخت بحران اور انقلابی دور میں ڈاکٹر صاحب کی سربراہی اور ان کی قیادت میں ہی داخل ہوئی اور اس نے اس لرزتی ہوئی زمین میں اپنے پیر جانے ہیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہم لوگ جب قنول باغ میں رہتے تھے اور جامعہ بھی وہیں تھی اس زمانہ میں سب ابواب جامعہ اور خصوصاً ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا بڑا غلامی اور رابطہ مضبوط تھا، ہم ان کے مکان پر اور وہ ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس طرح



ہم نے انہیں خلوت میں بھی دیکھا ہے اور طوت میں بھی، ان کی پبلک لائف بھی ہمارے سامنے ہے اور ان کی خانگی زندگی بھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے ذہن اور دماغ، علم و فضل، فکر و نظر، کردار و عمل اور اخلاق و فضائل کے اعتبار سے ایک نہایت بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھوں میں بڑی مقناطیسی کیفیت تھی اور باتوں میں بڑا رس تھا۔ ان کا انداز گفتگو بڑا مخلصانہ اور دل کو موہ لینے والا تھا، جس کسی سے بات کرتے تھے وہ بے اختیار ان کی طرف کشش محسوس کرتا تھا۔ ان کے تبسم میں شہد و انگبین کی جلالت تھی، جس نے اسے دیکھا اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ایک مثالی شخصیت تھی، اگرچہ ان کے حلقہ میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو مذہبی نہیں کہا جاسکتا لیکن ڈاکٹر صاحب خود ایک راسخ العقیدہ اور پختہ مذہبی فکر کے انسان تھے، نماز روزہ کے پابند تھے، اسلامی شعائر و روایات کے احترام کا جذبہ رکھتے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دہلوی سے بڑی عقیدت اور اداوت رکھتے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ جب تیس برس کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی ہندوستان واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے بڑے شوق اور جذبہ سے ان کو اپنے ہاں جامعہ میں مہمان رکھا اور ان کے تمام اخراجات برداشت کئے، اوکھلے کے قیام کے زمانہ میں متعدد مرتبہ نظام الدین کے تبلیغی مرکز بھی گئے اور ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے ہیں، ان کو اسلام سے وہی محبت تھی جو ایک سچے اور پکے مسلمان کو ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ انہیں محبت نہیں عشق تھا۔ اور آخر میں تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ

جب نام ترا لیجے تب چشم بھراوے

اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کہتے ہیں: ”ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہونے کے بعد بدل گئے تھے“ میں کہتا ہوں: جی ہاں! بدل گئے تھے لیکن ان کا دل نہیں بدلتا تھا، چنانچہ جس سال ان کا انتقال ہوا ہے غالباً اس سال

ہندوستان کی طرف سے جو ج ڈبلی گیشن گیا تھا اس کے ایک ممبر ہمارے فاضل اود نہایت عزیز دوست مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار بھی تھے، مولانا کا بیان ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے رسمی طور پر ہم لوگوں کو چائے پر مدعو فرمایا، فراغت کے بعد جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے عرض کیا: ”حضرت! میرے لائق خدمت کوئی کام!“ ڈاکٹر صاحب نے یہ سنتے ہی میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے اور بولے: ”بس! مولانا! حضور پر نور کی سرکاریں میرا سلام عرض کیجئے اور دعا فرمائیے کہ میری عاقبت بخیر ہو۔“ مولانا کا بیان ہے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کے دونوں ہاتھ کپکپا رہے تھے تھے، آنکھیں اشک آلود تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی، سینہ میں جذبات کا طوفان اٹھتا ہے تو مدعا ئے دل زبان و بیان کی گرفت میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر چپ ہو گئے لیکن اس کے بعد بھی دیر تک مولانا کے ہاتھ پکڑے اور ان کی طرف دیکھتے کھڑے رہے۔

ملاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خادم خاص کا جو ہر وقت ان کی خدمت میں رہتا تھا بیان ہے کہ مرحوم بہت صبح سویرے بیدار ہو جاتے اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، چنانچہ جس روز ان کا انتقال ہوا ہے اس روز بھی ان کا یہ معمول ناغہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: ”ذہنی طور پر وہ (ذاکر میاں) عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان ہیں، جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی عبادت کرتے ہوئے دیکھے،..... ان کی عبادت نمائش کے لئے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہار عبودیت کے لئے ہے۔“ (یادوں کی دنیا ص: ۱۲۹) ان شواہد کی روشنی میں اس میں شک و شبہ

نہ چوںکہ عبادت کا معاملہ اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان راز و نیاز اور سرگوشی (بقیہ صفحہ ۱۱۰ پر)



نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر صاحب عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے یکے پیچے اور مجلس مسلمان تھے۔

کہتے ہیں کہ آخر میں وہ بدل گئے تھے اور ان کی زندگی جو تقسیم کے بعد تھی اس

فلسفۂ انقلاب | زندگی سے مختلف تھی جو تقسیم سے پہلے تھی، آئیے اب اس پہلو پر بھی غور

کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب پیدا ہوتا ہے تو ہمیشہ وہاں دو جماعتیں

ہوتی ہیں (۱) انقلاب آفریں اور (۲) انقلاب زدہ، پہلی جماعت وہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ

میں فتنہ نمدی و کامرانی کا علم ہوتا ہے، اقتدار کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور وہ طاقت و

قوت کی اورنگ نشین ہوتی ہے، اس کے برخلاف دوسری جماعت انقلاب کی ماری ہوئی ہوتی

ہے، انقلاب کے سیلابِ بلا کی تلاطم آفریں موجیں اس جماعت کے شیرازہ امن و سکون کو درہم برہم

اور اس کے کاشانہ اطمینان و عافیت کو تہ و بالا کر کے رکھتی ہیں۔ انقلاب کی عظیم و شدید

تباہ کاریاں اس قوم کو اس درجہ خستہ حال، زبون و پامال کر دیتی ہیں کہ اس پر خوف و دہشت اور

مایوسی و ناکامی کا غلبہ ہو جاتا اور میدانِ زندگی تنگ نظر آنے لگتا ہے، اس وقت انقلاب

زدہ قوم میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ”دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے“ کے مطابق

اپنے آپ کو وقت کے سیلاب کی موجوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جدھر وہ موجیں لے جائیں

اور جہاں پاہیں انھیں غرق کر دیں انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اکثریت

(بقیہ ماشیہ ص ۲۹ پر) مناجات کا ہے اس لئے ہم نے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ مسجد میں فرض جماعت

کے ساتھ ادا کئے اور اپنے غلوت کدہ میں چلے گئے وہاں وہ سنن اور نوافل اور ادا و وظائف جو کچھ

پڑھنے ہوتے تھے اور اس خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اس وقت ان حضرات

کا خشوع و خضوع اور ان کی محویت و استغراق کا یہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ یہ منظر ایک رتبہ ہم نے

مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمد اقبال کا بھی دیکھا ہے اور جو کچھ دیکھا ہے طبیعت پر اب تک اس

کا اثر ہے۔

ایسے افراد کی ہوتی ہے جنہیں اپنے گھر کے پرانے در و دیوار سے عشق ہوتا ہے، محلہ کے گلی کوچے جن میں ان لوگوں نے بچپن کے دن اور جوانی کی راتیں گزاری ہیں ان کی ایک ایک اینٹ انہیں پیاری ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو موجوں کے حوالہ کر دینے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن ان میں موجوں کی بلا انگیزی کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت اور طاقت نہیں ہوتی، اس بنا پر وہ عالم حسرت و نامرادی میں اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جاتے ہیں اور اکثر اوقات مکان کی کھڑکیاں اور دیواروں میں روشندان بھی بند کر لیتے ہیں کہ کہیں سیل رواں کی موجیں اچھل کر ادھر سے اندر نہ آجائیں، غرض کہ پوری انقلاب زدہ قوم کے لئے اس کی زندگی کا یہ موڑ انتہائی نازک اور خطرناک ہوتا ہے، اور تشدد و انتشار، اور پراگندگی و سراسیمگی کا شکار ہو جاتی ہے، اس پر نہ جائے رفتن و نہ پائے ماندن کا عالم حیرانی طاری ہوتا ہے، اس کو اپنے ماضی کی شاندار عمارتیں کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں، حال مایوس کن اور مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے، کیونکہ جو لوگ اس عالم میں کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رخش امواج کی پشت پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں، یقین ہے کہ اب وہ اپنے وطن کو واپس نہ لوٹ سکیں گے، موجیں یا تو انہیں غرق کر دیں گی اور یا اگر وہ زندہ اور سلامت رہے بھی تو کسی دوسرے ملک کے ساحل پر انہیں پٹخ دیں گی اور وہ اس ملک کی زبان اور تہذیب اختیار کر کے اپنے لوگوں کے لئے اجنبی اور پردیسی بن جائیں گے، اب رہے وہ لوگ — ادا کثرت انہیں لوگوں کی ہے — جو سیلاب کی ہولناکیوں سے ڈر کر اپنے گھروں اور حویلیوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہیں! تو یہ بھی اپنی خیر کب تک منائیں گے، دیواریں بوسیدہ اور پرانی ہیں اور سیلاب کی قہرمانی شدید اور مسلسل موجیں ہیں کہ در و دیوار سے برابر ٹکرا رہی اور شور قیامت برپا کر رہی ہیں، آخر ایک وقت آئے گا جب یہ دیواریں بھی بیٹھ جائیں گی اور دروازے مقاومت کی تاب نہ لا کر دھڑام سے گھر پڑیں گے، اور موجیں گھروں کے اندر گھس



آئیں گی، اس وقفہ میں اگر بڑھے بوڑھے اپنی جان سلامت لے بھی گئے تو وہیں ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو بہالے جائیں گی، اس طرح پوری قوم انقلاب کی زد پر اور اس کا نشانہ ہوتی ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے اور جو بلا ان پر مسلط ہو گئی ہے اس سے کیونکر اور کس طرح رستگاری حاصل کی جائے۔

اگر قدرت کو اس قوم کو زندہ رکھنا منظور ہوتا ہے تو اس عالم اضطراب و کشمکش میں آخر کچھ لوگ پردہ ظہور پر آتے ہیں، یہ روشن خیال اور بالغ نظر ہوتے ہیں، ان کو ایک جانب اپنے ماضی کی تابناکی اور قومی و ملی انفرادیت کا یقین ہوتا ہے اور دوسری جانب وقت کی ہواؤں کا رخ پہچان لینے کا ان میں سلیقہ ہوتا ہے، وہ زمانہ کے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ سکتے اور انقلاب روزگار کی صداؤں کو سن سکتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اب نہ مقاومت مجہول سے کچھ فائدہ ہو گا اور نہ عزت گزینی و فراریت کی راہ اختیار کرنے سے کام بنے گا۔ اب وقت جدوجہد اور سعی و عمل کا ہے جو وقت کے دھارے کا رخ اس طرح موڑ دے کہ وہ ہلاکت کے بجائے ان کی سلامتی کا سبب بن جائے، اور یہ کام مصالحت اور مطابقت کے ذریعہ ہی سرانجام ہو سکتا ہے، یہ لوگ شک و تردد اور حیں بیمن کا لبادہ اتار کر غم و ہمت اور پامردی و استقلال کے ساتھ اپنی کشتی لیکر سیلاب میں کود پڑتے ہیں اور کہتے ہیں:

ہرچہ بادا بادا کشتی در آب انداختیم

یہی وہ لوگ ہیں جو اس وقت قوم کی قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی کوششوں کے صدقہ میں قوم کو حیات نو اور نشاۃ ثانیہ حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی راہ آسان نہیں ہوتی۔ ایک طرف وہ انقلاب آفریں قوم ہوتی ہے جو اقتدار کی ملک ہوتی ہے اور اس کے دل میں انقلاب زدہ قوم کی طرف سے شکوک و شبہات کا جن میں کچھ جذبہ انتقام بھی شامل ہوتا ہے ایک طوفان برپا ہوتا ہے، اور دوسری جانب خود اپنی قوم ہوتی ہے جس میں احساس شکست، کم نظری اور کم حوصلگی، پست ہمتی اور کوتاہ بینی

کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے، اس بنا پر اس قائد کو ایک نہیں بلکہ دو دو محاذوں پر کام کرنا ہوتا ہے، وہ غیروں کو اپنانے اور اپنے زخموں کو دھو دینے کی جو کوشش کرتا ہے اس میں بسا اوقات خود اپنوں سے جن کے لئے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے طعن و تشنیع اور سب و شتم سننے پڑتے ہیں، وہ اس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے اور بات بات پر اس پر نکتہ چینی اور حرف گیری کرتے ہیں، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وقت کے سیلاب کی موجیں شدید اور باد مخالف تیز و تند ہوتی ہیں اس بنا پر کشتی شروع شروع میں اسی سمت چلتی ہے جس سمت موجیں جارہی اور ہوائیں ان کو لئے جارہی ہیں۔ لیکن کشتی کا ملاح اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب کہ سیلاب کی رفتار بھی ہو، موجوں کا تلاطم کم ہو اور ہوائیں مخالف نہ رہیں۔ جب ایسا وقت آتا ہے تو کشتی کا ملاح اپنے پتوار اور بادبان درست کر لیتا ہے اور پھر کشتی کو اپنی منزل کی طرف لے آتا ہے، یہ پورا عمل وہ ہے جو عمل مطابقت (Adjustment) کہلاتا ہے اور اگر یہ کامیاب رہے تو اس سے قوم کو دوبارہ توانائی اور مصافحہ زلیست میں پیش قدمی کرنے کی ہمت ملتی ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کا یہی آئین فطرت اور ازلی دستور ہے، اور تاریخ میں ہمیشہ اسی پر عمل ہوتا آیا ہے، دور جانے کی ضرورت نہیں، سرسید کو دیکھئے! انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کام کیا اور جس پہنچ پر کیا اس کی نوعیت یہی تھی، یہ ضروری نہیں ہے کہ نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد میں ایک قائد جو کام بھی کرے اور اس سلسلہ میں اس کے زبان و قلم سے جو کچھ بھی نکلے وہ سب سن و عن درست اور صحیح ہی ہو، نہیں! بلکہ اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے اور آپ اس کو اپنی زبان میں ”مردوبیت“ یا فکر و نظر کی بے اقتدا بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس شخص کی نیت اور جذبہ پر حملہ کرنا ایک شخص کے چند جزوی اقوال و اعمال کے باعث اس کی زندگی کے تمام واقعات اور اس کے کیریئر سے منکر ہو جانے کے مترادف ہوگا۔ ایک جنرل جو کسی مصلحت سے اپنی فوج کو پیچھے ہٹنے یا میدان جنگ چھوڑ دینے



کا حکم دے رہا ہے آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے اس کو ملک اور قوم سے غداری کا الزام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ سرسید کی نسبت کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ بڑی حد تک ان کی ہی کوششوں اور جدوجہد کی مرہون احسان ہے، لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سرسید کا دامن غلطیوں سے پاک نہیں ہے، اور بعض غلطیاں کوئی شبہ نہیں بہت شدید اور ناقابل تلافی ہیں، لیکن اس کے باوجود سرسید کا جو مرتبہ و مقام انیسویں صدی کے اکابر و اعظم اسلام میں ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے!

سرسید اور ذاکر حسین کا موازنہ | ذاکر حسین کا موازنہ کیجئے تو دونوں میں بہت سی باتوں میں مشابہت ملے گی، ذاکر صاحب کی نسبت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے کہ ”وہ ذہنی طور پر عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان تھے“ غور کیجئے، یہ فقرہ کس طرح ہو ہو سرسید پر بھی صادق آتا ہے۔ جہاں تک مذہب کے احکام و مسائل اور اس کے مباحث کا تعلق ہے سرسید کی عقل پسندی نے معتزلہ اور علم کلام کے بعض دوسرے مذاہب کے دامن میں پناہ لی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقل پسندی کو تصوف کے مختلف مکاتب فکر اور صوفیائے کرام کے مسلک صالح کل سے سہارا ملا۔ ساگ دونوں کے الگ الگ ہیں لے بہر حال ایک ہی ہے، سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں سے عہدہ برآ ہونا تھا جو مسلمانوں کے خلاف شدید جذبہ انتقام سے پر تھے اور ڈاکٹر صاحب کو ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں سے معاملہ صاف کرنا تھا جو تقسیم اور اس کے ہولناک نتائج کے باعث مسلمانوں کے خلاف بری طرح پھرے ہوئے تھے، سرسید اگر اپنی دھن اور لگن میں قرآن مجید میں تفسیر بالرائے بلکہ سچ یہ ہے کہ تحریف کی منزل تک پہنچ گئے، انگریزی لباس پہننے اور انگریزوں کی طرح پر کھانے پینے لگے تو آپ کو اس پر تعجب کیوں ہو کہ کل کا شیخ الجامعہ شکر اچاریہ کے چرنوں میں جا کر بیٹھ گیا، دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار اور ہندی میں تقریر کرنے لگا۔ سرسید کا نظریہ تھا کہ انگریز اہل کتاب ہیں اس لئے ان کے ساتھ یگانگت اور مجالست پیدا کرنا

چاہئے، ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ ہندو ہمارے ہم قوم و ہم وطن ہیں، ان کی اور ہماری تہذیب جو ہندوستانی تہذیب کہلاتی ہے مشترک ہے اس لئے ہم کو اسے اپنانا چاہئے، سرسید انگریزوں کی استرضائیں اتنے آگے نکل گئے کہ جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، ذاکر صاحب کو اپنے عہدہ صدر جمہوریہ کی وضعداری میں اتنا غلو ہوا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے، مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی رہی لیکن انھوں نے اپنی زبان بند رکھی، درحقیقت یہ سب وقت کے وہ تھپیڑے ہیں جو کم یا بیش ہر اس شخص کو کھانے پڑتے ہیں جو سمندر کی تلاطم موجوں اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں بھی اپنی کشتی کے بادبان کو الٹ جانے سے بچانے کی کھرتا ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی "ان جنگ میں

وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل پڑے۔

جو غلطی ہے وہ ہزار تاویلوں اور برہان تراشیوں کے بعد بھی غلطی رہے گی، لیکن جو ہندو قوم کی خاطر "شب تاریک و بیم موج گردا بے چینی ہائل" سے دوچار ہوں اگر کہیں ان کا پاؤں پھسل جائے "تو سبکساران ساحلہا" کو زیب نہیں دیتا کہ ان کا مذاق اڑائیں، ان پر پھبتی کہیں یا خدائی فوجدار بن کر اپنی مغفرت سے زیادہ ان حضرات کی مغفرت کی فکر کرنے لگیں، ہونا تو نہیں چاہئے تھا لیکن بد قسمتی سے ہوتا یہی آیا ہے، سرسید نے کالج قائم کیا اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا لیکن جب کالج کے اسٹاف سے متعلق پالیسی کا معاملہ آیا اور پرانے ساتھیوں سے ان کو اختلاف ہوا تو مولوی طفیل احمد منگوری جیسے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ "سرسید آخر میں وہ نہیں رہے تھے جو شروع میں تھے، بلکہ بدل گئے تھے" یہی معاملہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ پیش آیا، وہ یونیورسٹی کے سربراہ ہوئے اور اس کی تاریخ کے نہایت نازک دور میں اس کی حفاظت کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط بنا کر اسے ترقی دی، لیکن جب ان کی بعض چیزوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہوا تو انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب بدل گئے



تھے، حالانکہ جہاں تک دل اور ضمیر اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا حال اس شعر کے مصداق تھا:

نہ میں بدلانہ تم بدلے نہ دل کی آرزو بدلی  
میں کیونکر اعتبار انقلاب آسمان کر لوں

بہر حال ڈاکٹر صاحب کے عہد وائس چانسلری میں یونیورسٹی کا نہ اسلامی کردار بدلا اور نہ وہ جسے آج کل اقلیت کردار کہتے ہیں تبدیل ہوا۔ طلباء اور اساتذہ میں، کورٹ میں اور اگر کوئی کونسل میں ہر جگہ مسلمانوں کی اکثریت تھی، دینیات کی تعلیم کا وہی اہتمام تھا، مساجد اور ان میں اماموں اور موزنوں کا وہی انتظام، عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات اور سرچ کا بندہ پہلے سے زیادہ، رمضان شریف کے احترام اور یوم میلاد النبی کے جلسے کی وہی شان، تجوید و قرأت کی تعلیم کا وہی سہارا، غریب مسلمان طلباء کے لئے وظائف اور مالی امداد کے وہی طریقے۔ یہ سب پیریں علیٰ حالہا اور بھنبہا قائم رہیں۔ بلکہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کے لئے ان میں ترقی ہوئی۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے عہد سمیت مہدی یونیورسٹی کی ہیئت ترکیبی و اجتماعی میں چند در چند ایسی تبدیلیاں ضرور ہوئیں جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب یونیورسٹی کا چلن وہ نہیں رہا ہے جو پہلے تھا اور اب وہ ایک دوسرے ہی ڈگر پر چل پڑی ہے، لیکن یہ تبدیلیاں جن وجوہ اور اسباب سے پیدا ہوئیں غالباً ڈاکٹر صاحب کا ان پر اختیار نہ ہوا تھا اور وہ خود بھی ان پر خوش اور مطمئن نہ تھے، چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بد دل اور بیزار ہو کر اپنے عہدے کے دوسرے ٹرم کے پورا ہونے سے کئی سال پہلے ہی اس عہدہ سے سبکدوش ہو کر اپنے گھر جامعہ نگر میں جا بیٹھے، ڈاکٹر صاحب کی بددلی اور بیزاری کے کیا اسباب تھے؟ اس پر اس واقعہ سے روشنی پڑے گی، بہار کے گورنر ہونے کے زمانہ میں جب جنوری ۱۹۵۹ء میں ڈاکٹر صاحب جدیو پور یونیورسٹی میں خطبہ جلسہ تقسیم اسناد

پڑھنے کے لئے کلکتہ تشریف لائے اور کئی روز کلکتہ میں مغربی بنگال کی گورنر مس پدمبانیڈو کے مہمان کی حیثیت سے گورنمنٹ ہاؤس میں قیام فرمایا تو دیرینہ تعلقات کی وجہ سے ازراہ کرم و عنایت مجھ کو بھی یاد فرمایا۔ چنانچہ ایک دن میری درخواست پر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی تشریف لائے، تمام اساتذہ اور طلباء سے ملاقات کی اور مدرسہ کے کاموں اور اس کی عمارتوں کا معائنہ کیا، اور اس کے علاوہ جب تک وہ کلکتہ میں رہے میں روزانہ شام کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ اس وقت حسب عادت وہ بہت بے تکلف ہو کر گفتگو کرتے تھے جس میں سنجیدہ علمی موضوعات کے ساتھ کچھ سنسنی بذاق کی باتیں بھی ہوتی تھیں، ایک دن اسی طرح کی گفتگو کے موقع پر میں نے عرض کیا: ڈاکٹر صاحب ابھی تو آپ کی وائس چانسلری کی مدت کے ختم ہونے میں دو برس باقی تھے، آپ اس سے پہلے ہی سبکدوش ہو گئے، کیوں؟ اپنے خاص انداز میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے فرمایا: میں کیا کرتا! وہ لوگ جن کو میں اپنا دست و بازو بنا کر علی گڑھ لایا اور ان کو ترقیاں دیں، جب وہ ہی قدم قدم پر میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے تو میں علی گڑھ نہ چھوڑتا تو کیا کرتا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ جملہ ان کے سوز و دروں اور کرب نہاں کا غماض ہے، میں اگرچہ علی گڑھ سے بہت دور تھا، لیکن وہاں کے حالات اور سیاست سے بے خبر نہ تھا، ڈاکٹر صاحب یہ جملہ فرما کر خاموش ہو گئے اور میں نے بھی اس کی مزید تشریح کرانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بردار

ورنہ در مجلس زنداں خبرے نیست کہ نیست

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ علی گڑھ سے ان کی یہ ناراضگی آخر وقت تک رہی اور ان کا دل کبھی اوھر سے صاف نہیں ہوا۔



# اسلامی حدود کی حکمت

(۲)

از مولانا حبیب رحمان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ، البیضاء (لیبیا)

شریعت کی بخشی ہوئی تمام آسانیوں سے اسلامی حکومت کا ہر باشندہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے | فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کسی شخص سے گناہ سرزد ہوتا ہے اور وہ حدود الہیہ کو توڑتا ہے اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، وہ اپنے ہر گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پاک و صاف بن سکتا ہے، اس کی توبہ کے لئے کسی تیسرے وسیط، شیخ، بزرگ، پیر یا پادری کی مطلق ضرورت نہیں، سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ جو اوپر لکھی گئی تھی صاف حکم دیتی ہے کہ صرف خدا سے دعا اور توبہ کرو، اور حسب ذیل آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ گناہ کو بخشنے کا حق صرف خدا کو ہے، اور یہ کہ کسی بڑے سے بڑے فحش گناہ یا اپنے نفس پر ظلم کے بعد بھی اگر اخلاص اور دکھ ہوئے دل کے ساتھ انسان خدا کو یاد کرے اور توبہ کی شرطوں کے ساتھ توبہ کرے جس میں گناہ پر اصرار نہ ہو اور ندامت ہو تو خدا اس کو اپنی رحمت و مغفرت سے معاف کر دیتے ہیں **وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ فَرَّغَ إِلَيْهِمْ وَلَمْ يُعْمَرْ عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ أُولَٰئِكَ جِزَاءُ هُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَلَهُمْ أَجْرٌ**

الْعَامِلِينَ (آل عمران - ۱۳۵ - ۱۳۶) ترجمہ ”جنت جن لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے ان میں سے چند کا تذکرہ کرنے کے بعد اور وہ لوگ (بھی) جو جب کوئی کھلا گناہ کریں یا اپنے حق میں ظلم کریں تو اللہ کو یاد کریں یعنی غافل اور بدست نہ ہو جائیں اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہیں اور کون ہے جو گناہوں کو بخشے سوائے اللہ کے ؟ اور وہ اپنی بد عملی پر اصرار نہ کریں جانتے ہوئے ، ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش ہے اور وہ جنتیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں ، ہمیشہ رہیں گے اس میں ، اور عمل کرنے والوں کا اجر (بدلی بہت خوب ہے۔“ پھر دوسری آیت میں خدائے پاک نے فحش و ظلم کے اس حکم کی تشریح اس طرح کی ہے کہ شرک کے سوا ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے ، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ظلم سے مراد شرک سے کم درجے کے گناہ ہیں ، ارشاد ہے : إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء - ۱۱۶) ترجمہ (اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم کو جس کے لئے چاہتا ہے بخش دیتا ہے) ، ..... خدائے توبہ کا حکم دیا ہے اور گناہ کے بعد توبہ سے مایوسی اور خدا کی رحمت سے تنوط (یاس) کی مانعت کی گئی ہے ، بلکہ تمام گناہگاروں ، خطاکاروں اور نفسِ بشری کی غلطیوں سے آلودہ ہو جانے والے انسانوں کے لئے مژدہ بشارت ان کے رب کی طرف سے اس طرح موجود ہے کہ رحمت الہی سے مایوس نہ ہو اور توبہ کرو اور توبہ یہی ہے کہ اطاعت کرو اور سب سے اچھی اور کامل شریعت کی پیروی کرو کہ اس آسمانی ہدایت کی پیروی نہ کرنے والے دنیا و آخرت کی حسرتوں سے دوچار ہوں گے ، چند آیتیں ملاحظہ ہوں ، گناہگاروں کو کیسا اصلاح و اتباع کا درس دیا گیا ہے ، اور یہ درس تمام امت پر واجب ہے قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ، وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ وَالتَّبَعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ



الْعَذَابُ بَعْتَةً وَآنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (زمر-۵۳-۵۵) ترجمہ (کہو، اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر گناہ کے ذریعے) زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوؤ، بیشک اللہ سارے گناہ بخش دیتا ہے، بیشک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کی حکم برداری کرو، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے اور تمہاری مدد (کسی کی طرف سے) نہ کی جائے، اور اتباع (پیروی) کرو اس اچھی بات (اسلام، قرآن اور شریعت) کی جو تمہاری طرف اتاری گئی تمہارے رب کی طرف سے، اس سے پہلے کہ اچانک تم پر عذاب آجائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو)

اس آیت کے ابتدائی حصے میں گناہگاروں کے لئے مغفرت کی بشارت ہے، اور وسط میں اتباع کتاب الہی و شریعت اسلامیہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت ہے، اور آیت کے آخری فقرے میں اسلام کی مکمل تابعداری اور شریعت منکرہ پر عمل نہ کرنے کی صورت میں اچانک عذاب کی وعید بھی موجود ہے، اور جس طرح افراد کے گناہ دربار الہی میں توبہ کے ذریعے معاف ہو سکتے ہیں اسی طرح قوموں، امتوں اور مسلم سوسائٹیوں کے گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں، صرف شرط یہ ہے کہ گناہ کا پہلے تو تعین ہو جائے اور پھر اس پر اصرار نہ ہو، گناہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے بجائے انسانی قوانین اور وضعی شریعتیں نافذ ہیں، ان کو باقی رکھنے پر اصرار توبہ کے معافی ہے اور اخلاص کے ساتھ شریعت اسلامیہ کا قانون اور خدا کی بتائی ہوئی راہ اگر اپنالی جائے پھر رحمت و مغفرت کے دروازے کھل سکتے ہیں اور سکون و سعادت کے بادل آسمان سے ایسی بارش کر سکتے ہیں کہ کشت زار ہستی امیدوار مان کے پودوں سے لہلہا سکتی ہے، کشت و خون کا بازار سرد پڑ سکتا ہے، چوری، ڈاکہ اور تمام اخلاقی جرائم کم سے کم تر ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا، ہر گناہ اور غلطی اور حد تک کی اسلامی نظامِ قضا میں رحم و کرم کے اصول

معافی توبہ اور دعا سے ہو سکتی ہے کیونکہ معافی کا حق صرف خدا کو ہے اور بندہ کسی گناہ کے بعد اگر وہ کسی کو معلوم نہیں ہوا ہے اور عدالت تک نہیں پہنچا ہے

تو براہ راست خدا سے توبہ کر سکتا ہے، لیکن گناہ اگر اتنی شہرت، ڈھٹائی اور عام طور پر یہ ظاہر کر کے کیا گیا ہے کہ وہ تفسیر (کیس) بن کر عدالت تک پہنچ گیا ہے تو اس صورت میں اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ مجرم، مجنی علیہ (جو اس جرم سے متاثر ہوا) اور سوسائٹی تینوں کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کرنا چاہتی ہے، اور ایسے کلی اصول پیش کرتی ہے جن سے جرم کا انسداد ہو، اور جرم کے تصور ہی سے مجرم کے رونگٹے کھڑے ہوں اور سوسائٹی جرم سے باز رہے، قانونی طور پر جرائم کے سلسلے میں تین قانون اسلام نے پیش کئے ہیں، ایک قصاص کا قانون، دوسرا حدود کا اور تیسرا تعزیرات کا قانون، قتل کی صورت میں معافی کا حق حاکم یا کورٹ کو نہیں بلکہ مقتول کے ولی الدم کو رہتا ہے اور سزا کی تنفیذ کا حق حاکم کو، تاکہ اس طرح دلوں میں نفرت، غصہ اور حقہ کے بجائے محبت کی فضا دوبارہ قائم ہو جائے اور اس طرح دیت دی جاسکتی ہے، لیکن ولی الدم کو خون بہا لینے کا پورا پورا حق بھی شریعت نے دیا ہے، تعزیرات وہ جرم ہیں جن کی سزا شریعت میں منصوص (واضح طور پر محدود اور معلوم) نہیں ہے، تعزیرات کی دو قسمیں ہیں، اللہ کا حق اور بندوں کا حق، اللہ کا حق یہ ہے کہ سوسائٹی میں گناہ اور منکر کو دیکھ کر اس سے باز رکھنے کی کوشش ہر شخص کرے، لیکن قانونی طور پر اضطراب و قلق اور انتظامی خلل کے خطرے سے تعزیر امام یا عدالت ہی کو نافذ کرنی چاہئے، حق الہی جیسے ناز کو ترک کرنا اور شرعی اوار کو ادا نہ کرنا یا گناہ کرنا وغیرہ، ان میں تعزیر امام پر واجب ہے، کیونکہ برے افعال پر تادیب اگر نہ کی جائے تو اس سے زیادہ فحش اور قبیح کام کرنے کی ہمت اور عادت ہو جائے گی، بشرطی کا قول ہے کہ اس میں کوئی چیز مقدر (مقرر) نہیں ہے، بلکہ قاضی کی رائے اور مجرم کی نوعیت جرم اور جرم سے باز رہنے اور رک جانے کی صلاحیت دیکھ کر وہ جو چاہے سزا دے سکتا ہے۔ (فتح القدیر ۴-۲۱۲) تعزیر کی شکلیں اور حدیں فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، بندوں کا حق یہ ہے کہ کسی شخص پر کوئی الزام یا تہمت لگائی گئی، تہمت کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک کسی ایسی چیز کی تہمت جس پر شرعی حد مقرر ہے، خصوصیت کے ساتھ زنا کی تہمت، اس کو قذف کہتے



ہیں اور شریعت میں اس کی حد مقرر ہے، دوسری وہ تہمت جس میں حرام کا الزام نہیں لگایا جاتا بلکہ شخصیت مجروح ہوتی ہے، گالی گلوچ، تکلیف پہنچانا، کسی پر خیانت کا الزام یا اس قبیل کی دوسری حق تلفیاں، اس تعزیر کا حق بھی امام یا اس کے نائب، عدالت کو ہے، لیکن معاف کرنے کا حق عدالت کو نہیں اسی کو ہے جس پر تہمت لگائی گئی یا زیاتی کی گئی۔ حدود وہ جرم ہیں جن کی سزائیں کتاب و سنت میں واضح اور محدود و مقرر ہیں، ثبوت قطعی کے بعد ان میں معافی کا حق نہ حاکم کو ہے نہ کورٹ کو اور نہ مجنی علیہ کو، اور یہ بات عقلی طور پر بھی صحیح ہے کیونکہ معافی کی صورت میں دوسرے غیر مجرموں کو جرم کی رغبت ہوتی ہے اور جرم کرنے کے بعد جرم کی سزا سے چھوٹ جانے کا دروازہ کھل جاتا ہے، صرف حد حرابہ کے سلسلے میں نص قرآنی کی رو سے اس پر اتفاق ہے کہ حاکم ان کو معاف کر سکتا ہے اور شریعت کی مصلحت اس میں یہ ہے کہ کسی منظم اور مسلح فساد کی گروہ پر معافی اور توبہ کا دروازہ کھول کر مزید ظلم و ستم سے اس کو اور عوام کو بچانا مقصود ہے، اگر ان کی معافی نہ ہو تو پھر وہ آخر دم تک ہتھیار نہ ڈالیں گے اور اس طرح فساد کا طوفان مچاتے رہیں گے اور عوام، پولیس اور ان کی جانیں اس ہنگامے اور ضد میں مزید تلف ہوں گی، حرابہ کے علاوہ دوسری حدود حاکم یا عدالت معاف نہیں کر سکتی، لیکن کیا یہ حدود توبہ سے ساقط ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس کی تحقیق تفصیل انشاء اللہ تفصیل مقالے میں پیش کروں گا۔

مجرم کے ساتھ نرمی کا برتاؤ شریعت اسلامیہ اس طرح کرتی ہے کہ اگر عدالت کے پاس کیس آنے سے پہلے ہی معاملہ رفع دفع ہو جائے تو بات ختم ہو جاتی ہے، عام انسانوں کو چشم پوشی اور معافی کی ترغیب دی گئی ہے، گواہی کی شرطیں بہت سخت ہیں، مجرم کو کسی بھی قانونی یا فطری چھوٹ سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے، حد کو شبہ سے بھی ختم کیا جاسکتا ہے اور اس کی جگہ تعزیر ہو سکتی ہے، یعنی اگر ۹۹ چیزیں مجرم کے خلاف ہیں اور ایک چیز میں شک یا اشتباہ ہے تو حد ختم ہو سکتی ہے، اور دوسری ایسی تفصیلی اشیاء فقہ اسلامی میں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا

ہے کہ شریعت نے مجرم کے ساتھ کس قدر نرمی اور احتیاط برتی ہے اور حدود کا قیام کس قدر مشکل اور نادر الوقوع ہے، ان اشیاء کی کچھ تفصیل راقم حدود سے متعلق تفصیلی مضمون میں کرے گا۔

مجھنی علیہ کے ساتھ رحم و کرم یہ ہے کہ اس کو قانونی طور پر اپنے حقوق واپس لینے کا پورا پورا حق موجود ہے تاکہ وہ مظلومیت کا نہ شکار ہو اور نہ اسے اس کا احساس ہو۔ اور سوسائٹی کے ساتھ مسخفانہ اور رحمانہ برتاؤ یہ ہے کہ حدود کے قیام سے قبل ہی صرف ان کا اعلان، قانون اسلامی میں اس بات کی ضمانت ہے کہ سوسائٹی میں عامۃ الناس ان قبائح کے ارتکاب سے باز رہیں گے جن پر حدود نافذ ہوں گی، اور پھر اس جرم کے ظاہر ہونے اور عدالت میں ثابت ہونے کے بعد کسی ایک شخص یا چند افراد پر حد کا قیام اور شرعی سزا کا اجراء پوری سوسائٹی کے لئے عبرت اور سبق آموزی کا ایسا لازوال درس ہوگا جو سینکڑوں قوانین، جیلیں اور دوسری تعزیرات نہیں پیدا کر سکتیں، اور اسلام صاف اور نظیف سوسائٹی پیدا کرنا چاہتا ہے، اور تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جب اور جہاں اسلامی حدود اور قوانین نافذ ہوئے ہیں جرموں کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر کم ہو گئی ہے اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں بہشت دنیا جہنم زار بن گئی ہے۔

بہر حال اسلامی قانون کا نام سن کر ہی آزاد خیال  
اسلامی حدود پر بربریت کا الزام اور اس کا جواب | بلکہ یوں کہئے کہ مغربی انکار کے غلام اور مشرقی

اوہام کے شکار چراغ پا ہو جاتے ہیں، لیکن اسلامی حدود کا نام سن کر تو پریشانی اور حیرانی میں مہیٹریا کے مریض معلوم ہونے لگتے ہیں، اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے بعد اسلامی ہمدردی کے طور پر اسلام ہی کو ایک بیمار دین ثابت کرنے لگتے ہیں، لیکن اسلوب اور لہجہ ایسا اختیار کرتے ہیں جس سے بظاہر واقعی ہمدردی اور حسن نیت ظاہر ہو، اور بین الاقوامی ضمیر، اور انسانی قیمت، ہمدردی اور مسلمانوں کی رسوائی اور اس نظام میں وحشیت اور بربریت



ذخیرہ کی کتابیاں دینے لگتے ہیں، حالانکہ اگر یہ وحشیت اور لاقانونیت ہوتی تو اقوام متحدہ میں سعودی عرب کو رکنیت و شمولیت نہ ملتی، اور امریکن جرائم سے عاجز آئے ہوئے اجتماعیات کے ماہر اور اسپیشلسٹ، جرائم کے انسداد کے لئے سعودی عرب کی مثال استحسان اور خوبی کے لہجے میں بار بار پیش نہ کرتے۔ اور یہ ہمدردیہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس طرح سوسائٹی میں ہر طرف بے اور لنگڑے نظر آئیں گے، حالانکہ اگر بغرض محال ایسا ہو بھی تو وہ اس سے تو بہتر ہے کہ سوسائٹی میں ہر طرف ساہوکار کے بھیس میں چور، رشوت خور، قانون شکن، اور اخلاق باختگی کے دلدادے، ظلم و ستم میں درندے، اور مکرو فریب پر فریفتہ لوگ نظر آئیں، حالانکہ بات ایسی نہیں ہے، اس سلسلے میں ہم اختصار کے ساتھ وہی جواب دے سکتے ہیں جو اسلامی تربیت اور حدود کی حکمت کے سلسلے میں اوپر لکھا گیا ہے، اور اس کے بعد ہاں ان لوگوں کے لئے جن کے زندہ اور حساس ضمیر کے لئے جو چوری، ڈاکہ، حرام خودی، حرام کاری، شراب نوشی، بلیک، ذخیرہ اندوزی، سود خواری اور ان جیسی رزلیتوں اور لاقطی حرکات کے خلاف پابندی کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسلامی حدود پر اعتراض کرتے ہیں آپ دو جواب اور بھی دے سکتے ہیں، ایک عقل اور ایجابی پہلو رکھتا ہے اور دوسرا واقعاتی اور سببی پہلو رکھتا ہے، یہ دونوں جواب دوبارہ لکھنے کے بجائے راقم اپنی مطبوعہ کتاب سے پیش کرتا ہے اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، چوری کی وجہ سے اکثر گھرانوں کا سکون مٹ جاتا ہے، برسوں کی پونجی لٹ جاتی ہے اور نوبت چور کی طرف سے قتل تک آجاتی ہے اور سوسائٹی سے چوری ختم نہیں ہوتی، اس کے برخلاف جب اسلامی حدود نافذ تھیں شاذ و نادر ہی چوری ہوتی تھی اور آج بھی دنیا میں سب سے کم چوری کی شرح سعودی عرب میں ہے۔ حیرت نہیں تو اور کیا ہے کہ وحشی، لیٹری اور چوری کی عادی قوم، — آج سے پچاس سال قبل کے احوال جاننے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں — کس طرح ایماندار اور چوری سے باز رہنے والی بن گئی، کوئی

صاحب یہ توجیہ نہ کریں کہ مال و زر کے انبار انہیں مل گئے، کیونکہ امریکہ یقیناً سعودی عرب سے زیادہ مالدار، زیادہ تعلیم یافتہ اور عصر حاضر کا سب سے ترقی یافتہ ملک ہے، وہاں چوری اور سنگین جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور اس کے حساب کے لئے اب منٹ تک ناکافی ہو کر نوبت سیکنڈوں تک آگئی ہے، اور اس کے مقابلے میں شاہ عبدالعزیز کی پوری مدت حکومت چوبیس سال میں صرف سولہ چوری کی وارداتیں ہوئیں، جبکہ عبدالعزیز کا شروع زمانہ فقر و مصائب اور مشاغل کا زمانہ تھا، یہ بجائے خود اس اعتراض کا جواب ہے کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا جائے تو ہر طرف نیچے ہی نیچے نظر آئیں گے حالانکہ یہ اعتراض بالکل قابل اعتبار نہیں، کیونکہ اس طرح تو پھر ہر اچھی چیز کو چھوڑنا پڑے گا، موٹروں کو ایکسیڈنٹ کے خطرے اور سوسائٹی میں اپاہج پیدا کرنے کے الزام میں چھوڑنا پڑے گا، ہوائی جہاز، فیکٹریاں اور تعمیر و ترقی کے سارے پلان بند کرنے پڑیں گے کیونکہ عالم فائدہ کی ہر چیز میں کسی نہ کسی فرد کے لئے کوئی نقصان نکل ہی سکتا ہے۔ اس سلسلے کی آخری بات رہ گئی، وہ یہ کہ عصر حاضر کے ترقی پسند، آزاد اور مہذب ذہن اور زندہ ضمیر سے جو حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کرے کہ قاتل کو قتل کیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹا جائے، اور اسلامی قصاص و حدود کو قبول کر لے جس جس طرح عالمی ضمیر نے ویٹ نام میں ہلاکت کا سامان بہم پہنچایا ہے اور سرخ انقلاب میں پانچ ملین انسانوں کو آزادی اور مساوات کے نام پر خاک و خون میں تر پیا یا، اسلامی خلافت کے سارے مشرقی و مغربی علاقوں پر ظلم و ستم کی دردناک کہانیاں پیش کیں، پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی اجازت دی، چور کی سزا قتل تک تجویز کی، سامراجی زمانہ میں پھانسی کے تختے لٹکائے، انسان کی چربی سے صابون بنائے گئے، انسانی کھال جوتوں میں استعمال کی گئی، آتشیں بموں نے شہروں کو ویران اور جسموں کو خاکستر بنایا اور پستول کی گولیاں چوروں، ڈاکوؤں اور بعض اوقات قانون اور امن کے محافظوں کے ذریعہ ہر پرامن شہری کے سینے کو داغدار کرنے



کارمان رکھتی ہیں، اور آبرو باخشی اور جنسی اتار کی کے مریض ہر عفت آب گھرانے کا سکون دل۔  
لوٹنے کے لئے بیکار نظر آتے ہیں، ایسے پاکباز، طاہر و نظیف اور بیدار مغربی و مشرقی،  
سیسی یا محمد عالمی ضمیر پر ذرا سی کوشش بھی اگر کی جائے تو شاید مجرم کو شرعی طور پر سزا دینے پر  
وہ راضی ہو ہی جائے اور اسلام کی منظم اور محتاط طریقوں پر نافرمانی کی جانے والی حدود اسے اپنے  
غیر قانونی کردار اور جھگڑ کے دستور کے مقابلہ میں زیادہ منصفانہ، ہلکی اور موثر نظر آئیں۔

۱۔ تخلیق انسانی کا مقصد دین و شریعت کا قیام ۱۸۹-۱۹۰ مطبوعہ دارالتصنیف والترجمہ بھوپال

## اہل علم کے لئے پانچ نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی : جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط وارشائع ہو رہی ہے۔

قیمت معروضہ کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے

آج ہی مبلغ دس روپیہ پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائے اب تک

۲ جلد طبع ہو چکی ہیں باقی دس جلد عنقریب طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ تفسیر جلالین شریف مصری : مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں

۱) باب النقول فی اسباب النزول للسیوطی (۲) معرفت النسخ

والمسوخ ابن حجر قیمت مجلد ۲۵/-

۳۔ الفیہ بن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت مجلد ۲۵/-

۴۔ حاشیہ بیضاوی سورہ بقرہ مکمل قیمت ۸۵/-

۵۔ فتح الباری : جو قسط وارشائع ہو رہی ہے۔ خدا کے فضل سے دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں

ملنے کا پتہ :

ادارہ مصطفائیہ دیوبند (یو۔ پی)

# مکتوبات مجدد الف ثانی

از جناب مفتی عتیق الرحمن عثمانی

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۳ شوال ۹۷۱ھ مطابق ۵ جون ۱۵۶۲ء کو ہوئی اور وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۲ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۶۲۲ء میں، آپ کا پورا نام ابوالبرکات احمد بدیع الدین ہے اور لقب امام ربانی مجدد الف ثانی، مجدد صاحب کے چھٹے دادا امام رفیع الدین فیروز شاہ تغلق کے دور میں سرمنہاں کر آباد ہوئے، امام رفیع الدین اپنے وقت کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے اور ان کی اولاد بھی صلاح و تقویٰ اور علم کے زیور سے آراستہ رہی، حضرت مجدد صاحب کے والد بزرگوار کا نام مخدوم عبدالاحد ہے، مخدوم خواجہ عبدالاحد حید عالم اور پاک باز صوفی تھے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ہات پر بیعت کی اور خلافت شیخ گنگوہیؒ کے صاحبزادے شیخ رکن الدینؒ سے حاصل کی، مخدوم عبدالاحد کے سات صاحبزادوں میں مجدد صاحب چوتھے صاحبزادے ہیں، مجدد صاحب کی پیشانی پر بچپن ہی سے ہوش مندی اور ذکاوت و نجابت کے آثار نمایاں تھے، بچپن میں ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے، آپ کی والدہ ماجدہ نے اس وقت کے بزرگ شیخ کمال تادری کیسٹلی سے دعا صحت کی درخواست کی، شاہ صاحب نے دعا کی اور فرمایا پریشان نہ ہو، یہ بچہ بڑا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس سے بڑے بڑے کام لے گا، نو سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا اور پھر اپنے والد ماجد خواجہ عبدالاحد اور دوسرے علماء سے محنت، لگن اور مکمل



انہماک سے مروجہ کتابیں پڑھیں ، ۱۷ سال کی عمر میں تمام کتبِ درسی سے فراغت حاصل کر لی اور والد سے تجدیدِ بیعت کی ، مجدد صاحب کی جو کیفیتِ علوم ظاہری کی تحصیل کے وقت تھی وہی کیفیت مراحلِ سلوک طے کرنے کے وقت رہی ، چنانچہ مدارجِ تصوف سے جلد جلد گزرتے چلے گئے اور ان منازل کی تکمیل کے بعد والد صاحب نے آپ کو سندِ خلافت مرحمت فرمادی ۔

سالِ حج کے ارادے سے دہلی پہنچے اور آپ کی ملاقات شیخ حسن کشمیری سے ہوئی ، شیخ حسن مجدد صاحب کی طالبِ علمی کے زمانے کے دوست اور حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ، ان کو مجدد صاحب کے رجحانات کا اندازہ تھا کہ طریقہ نقشبندیہ سے تلبی لگاؤ ہے اور کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں رہتے ہیں ، اسی بنیاد پر شیخ حسن نے اپنے مرشد کا ذکر کیا اور خواہش کی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات کریں ، مجدد صاحب ان کے ساتھ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ، دونوں صاحب کمال تھے اور دونوں کے دل الٰہی سے منور تھے ، ملاقات کے ساتھ ہر ایک کی حالت و کیفیت دوسرے پر منکشف ہو گئی اور اس طرح آپ کی دیرینہ آرزو برآئی اور حضرت خواجہ صاحب کے سلسلہ میں داخل ہو گئے دو اڑھائی سال کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کمالات کے اعلیٰ درجات تک پہنچا دیا یہاں تک کہ خواجہ صاحب نے اپنے تمام مریدوں کو آپ کی تربیت میں دے دیا ، خواجہ صاحب کا ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۱۲۰ھ کو وصال ہو گیا اور مجدد صاحب سرہند واپس تشریف لے آئے ۔ حضرت مجدد صاحب کا دور اکبر اور جہانگیر کی شوکت و سلطوت کا دور تھا ۔ مغل سلاطین کے اس دور میں آپ نے حق کی شان اور صداقت کی اس قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کے مصائب برداشت کئے یہاں تک کہ دو سال تک قلعہ گوالیار میں قید بھی رہے بالآخر وقت کے اقتدار اعلیٰ کو

آپ کی عزیمت کے سامنے جھکنا پڑا اور اعلیٰ کلمۃ الحق کے لئے آپ نے جو راہ اختیار کی تھی زندگی کے آخری لمحات تک اُس پر ایک مضبوط چٹان کی طرح جمے رہے، زیرِ نظر ریڈیائی تقریر حضرت مجدد صاحب کے حالات و سوانح اور مجددانہ کارناموں کی تفصیل پر نہیں صرف مکتوبات اور ان کی خصوصیات پر ہے، ریڈیو سے جو تقریریں نشر ہوتی ہیں، مختصر بھی ہوتی ہیں اور ان کا رنگ بھی جدا ہوتا ہے، امید ہے قارئین اس تقریر کو اسی نظر سے پڑھیں گے۔

### علیق الرحمن عثمانی

ہندوستان میں اسلامی دور کے ملفوظات اور مکتوبات کا معتبر و مستند سرمایہ بہت کم ہے، ملفوظات و مکتوبات دونوں میں تحریف و تبلیس کا امکان زیادہ ہوتا ہے، ملفوظات کے بہت سے مجموعے جنہیں لوگ مستند سمجھتے ہیں فی الحقیقت بے اصل اور موهوع ہیں۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی اس جعلی لطیفہ پرچہ کے متعلق یہ رائے تھی: ”در آں بسیار الفاظ است کہ مناسب اقوال ایشان نیست“ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی معتبر مجموعہ ملفوظات و مکتوبات سامنے آگیا ہے تو اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی اثر آفرینی سے پورے ماحول اور سماج کو متاثر کیا ہے بلکہ دلوں کی دنیا بدل دی ہے، شہنشاہِ سخن امیر خسرو نے امیر حسن علاء بخاری کے مرتب کردہ مجموعہ ملفوظات حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ ”فوائد الفوائد“ کے متعلق بے اختیار کہہ دیا تھا ”کاش کہ تمامی کتب کہ عمر دہاں صرف کردہ ام براء امیر حسن را بودے، و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردہ است را بودے“ یعنی کاش میری تمام تصنیفات جن کی ترتیب و تدوین پر عمر کا بہترین حصہ صرف ہوا ہے براء امیر حسن کی ہوتیں اور صرف ان کے جمع کئے ہوئے سلطان المشائخ کے ملفوظات میرے ہوتے۔“ بہر حال بہت تھوڑے حضرات ایسے ہیں جن کے ملفوظات اور مکتوبات کو سندِ اعتبار و صحت اور نعمتِ مقبولیت حاصل ہو سکی ہو، حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات ہمارے ملک کے اسلامی دود کے سب سے قیمتی، سب سے محفوظ اور



ضعیم و عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، معرفت و تصوف کی چند ہی کتابوں کو وہ شہرت و عظمت اور قدر و منزلت حاصل ہوئی ہے جو مکتوباتِ امام ربانی کے حصے میں آئی، مجددِ صاحب کی حیات ہی میں ان کے خطوط کی نقلیں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی تھیں اور لیل و نہار کی ہزاروں گردشوں کے باوجود آج بھی ان کی اہمیت و مقبولیت کا یہی عالم ہے، فارسی سے دوسری زبانوں میں ترجموں کے علاوہ روس کے ایک بکئی مہاجر ملامراد نے عربی میں ان کا ترجمہ کیا جو ٹائپ میں چھپ کر تمام عرب ممالک میں پہنچ گیا، عربی زبان میں اشاعت کے بعد حدیث و تفسیر کی کتنی ہی کتابوں میں مکتوبات کے مضامین نقل کئے گئے، علی الخصوص سلطان عبدالحمید خاں ترکا خلیفہ کے عہد کے مشہور و مقبول عالم علامہ سیاح محمد آلوسی کی تفسیر ”روح المعانی“ میں تو اس کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے کہ جس جگہ بھی ان مکاتیب کے ذکر کا موقع آجاتا ہے ”قال المجدد الفاروقی“ کے نام سے آپ کے خاص خاص نظریات اور تعبیرات کو بڑے اہتمام سے پیش کرتے ہیں اور اہم تر مسائل کے تصفیہ میں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان مکتوبات کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ ایک طرف ان کے مضامینِ عالیہ کی اثر انگیزی، ان کی انقلابی اور اصلاحی اسپرٹ، صاحبِ مکتوبات کی وسیع و عمیق علمیت اور روحانی شرف و فضیلت ہے، دوسری طرف ان کا اچھوتا اور دل نشین طرزِ تحریر ہے۔ مکتوبات کو پڑھ کر یہ حقیقت پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے کہ حضرت مجدد، ایک مجددِ وقت، ایک دانائے روزگار حکیم، ایک بلند پایہ عالمِ دین اور ایک بیدار قلب روحانی پیشوا ہی نہیں تھے بلکہ اول درجہ کے انشاء پرداز بھی تھے، جن کی تحریر میں ادب و انشاء کی نزاکتیں اور لطافتیں موجود ہیں۔ وہ تحریرِ خطوط کے وقت تحریر کی انشائی اور ادبی باریکیوں پر مبصرانہ نظر رکھتے تھے، ان کے مکتوبات کے بڑے حصے میں علمی، دینی اور حکمت و معرفت کے مسائل ہیں اور ان پر محققان بحثیں ہیں، ان کے بیان کے لئے انہوں نے وہی عالمانہ تحقیقی طرزِ تحریر اختیار کیا ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی اور حقائق ادا ہو جائیں، وہ اگرچہ ادبِ بابِ تصوف

اور اصحابِ باطن کی مروجہ اصطلاحیں کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور اسی لئے ناواقف لوگوں کو بعض مطالب کے سمجھنے میں دشواری بھی پیش آتی ہے، لیکن ان میں ثقیل الفاظ بہت کم ہیں، خاص طور پر ان خطوط کی زبان جو عقیدوں کی وضاحت یا بتدلیوں اور نوجوان طالبوں کے لئے لکھے گئے ہیں نہایت سلیس، سبک اور عام فہم ہے۔ مکتوبات کا ایک حصہ ہم عصر اُمراء کے نام ہے، اس میں ان امیروں اور دولت مندوں کو روحِ شریعت کی حفاظت اور دینِ حق کی مدد کی تلقین کی گئی ہے، اس طرح کے تمام مکاتیب کا اندازِ تحریر علمی خطوط سے قطعی طور پر مختلف ہے، ان خطوط میں عالمانہ بھاری بھر کم اصطلاحیں کم ہیں، الفاظ اگرچہ روحانیت کے پر شکوہ قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن سربِ الفہم ہیں، آسانی سے اُن کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے، اس کے باوجود اسلوب بیان میں خطیبانہ جوش اور داعیانہ ولولہ ہے، ان خطوط کا ایک ایک لفظ روحانی تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ تمام خطوط دل پاک باز سے نکلے ہوئے جذبات کا صاف و شفاف آئینہ ہیں اس لئے قدرتی طور پر ان کا اثر براہِ راست باطن پر پڑتا ہے اور دل کی شکنیں کھلتی چلی جاتی ہیں، پیش نظر مقصد کی تشریح کے لئے کہیں کہیں کوئی نفیس شعر یا شعر کا کوئی مصرعہ بھی استعمال کرتے ہیں جس سے مضمون کی دل نشینی اور اثر انگیزی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ الفاظ کے موزوں انتخاب اور تقابل کے حسن کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کی ادبی اور روحانی طاقت سے ایک عظیم اور زبردست سماجی انقلاب کی آبیاری کی، ایک پورے عہد کو بدل ڈالا اور ایک نئے عہد اور اُس کی لطافتوں اور انگوں کو پیدا کیا۔ اُن کے دامنِ عقیدت کے وابستگان میں درویش بھی ہیں اور صوفی بھی، سالک بھی ہیں اور مجذوب بھی مادہ پرست فلسفی بھی ہیں اور عارفینِ حق اور کالمینِ حکمت و معرفت بھی، نامور فاتحین بھی ہیں اور صاحبِ سطوت اُمراء بھی۔ آئیے اس پس منظر کی روشنی میں ان کے مکتوبات پر ایک ہلکی سی نظر ڈالیں۔



حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کے تین دفتر اور تین حصے ہیں، حضرت خواجہ باقی باللہ کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کے بعد ان مکاتیب کی ابتداء ہوئی، کم و بیش چار سال کی مدت میں بیس خط اپنے پیرو مرشد کو لکھے، ان مکتوبات کی حیثیت باقی خطوط کے سرنامے کی ہے، اس طرح تحریر خطوط کی ابتداء ۱۰۸۵ھ سے ہوئی ہے۔ مکتوبات کے پہلے دفتر کے جامع اور مرتب مولانا یار محمد البیدرخشی الطالقانی ہیں، ۱۰۸۵ھ میں مکتوبات شریف کی تعداد ۳۱۳ ہو گئی تو تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق حضرت مجدد صاحب نے مولانا یار محمد سے فرمایا کہ خطوط کی یہ تعداد اصحاب بدر کی تعداد کے برابر ہو گئی ہے، بہتر ہو کہ اس دفتر کو اسی تعداد پر ختم کر دو، اس کے بعد خطوط مبارک کو مولانا عبدالحی حصاری نے جمع کرنا شروع کیا، ۱۰۸۸ھ میں دفتر دوم کے خطوط کی تعداد ۹۹ ہو گئی تو ارشاد ہوا کہ اسماء حسنیٰ کی تعداد بھی یہی ہے، اس حصے میں یہی تعداد رہے۔

تیسرے مرحلے میں آپ کے خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی نے یہ خدمت انجام دی، یہاں تک کہ جب خطوط کی تعداد ۱۱۴ ہو گئی تو فرمایا، قرآن مجید کی سورتوں کی بھی یہی تعداد ہے، تیسرا و تینا اس حصے کو اسی عدد پر ختم کر دو، یہ سلسلہ ہر کا واقعہ ہے، بعد میں اس تیسرے حصے میں چند مکاتیب کا اور اضافہ ہوا، دفتر اول کا نام دُرّ المعرفت، دفتر دوم کا نام نور الخلائق اور دفتر سوم کا نام معرفۃ الخلائق ہے۔

مجدد صاحب کی شخصیت کی طرح اُن کے خطوط کا یہ عظیم الشان ذخیرہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتا، اُن کے طرز تحریر میں قوس قزح کے سارے رنگ جمع ہو گئے ہیں، کہیں زور خطا ہے، کہیں مشکلانہ اور فقیہانہ موٹنگانی اور کہیں انتہائی علمی متانت و وقار اور ہر منزل میں اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت اور انداز بیان کی اہمیت کا احساس، — شریعت و طریقت اور عقائد و معرفت کے اس بحر ذخار کو اگر مختصر عنوانوں میں یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ مکتوبات کا بنیادی تعلق تین عنوانوں سے ہے (۱) دینی،

(۲) سماجی اور اصلاحی (۳) سیاسی - دینی مکاتیب میں تصوف کے نازک اور الجھے ہوئے مسائل کو آپ نے جس حسن و خوبی اور تحقیق و بصیرت سے حل فرمایا ہے اس کا پڑھنے سے تعلق ہے، ایک مکتوب میں عالم مثال کے متعلق لکھا ہے، یہ عالم صرف دیکھنے کی جگہ ہے، رہنے کی نہیں، کیونکہ یہ عالم روح اور عالم جسم کے درمیان میں ہے اور آئینہ کی طرح ہے، اس میں ان دونوں عالموں کا عکس نظر آتا ہے۔ توحید و جود اور توحید شہودی کے مسئلے پر معرکہ الارباب بحث و تحقیق ہیں، آپ نے ان مغالطہ انگیز بحثوں کو زیادہ سے زیادہ دل پذیر بنانے کی کوشش کی ہے، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ”بے شبہ توحید و جود کا مقام سالک کو پیش آتا ہے لیکن یہ مرحلہ اول ہوتا ہے، انتہائے سفر نہیں ہے، اس مقام میں سالک نے شراب محبت کا جام پی لیا، جس نے اس کو مدہوش کر دیا ہے، اس کو نہ اپنی خبر ہے نہ دوسروں کی، جب تک بے ہوش رہے گا اس کو محبوب حقیقی کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، اس مقام کی بے ہوشی اتنی پر کیف اور رنگین ہے کہ اس سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا، اس مقام کے بعد عالم ظلال اور عالم خمار ہے، یعنی بے ہوشی اور مدہوشی کے درمیان کی حالت، اس مقام اور حال میں سالک نہ پورے ہوش میں ہوتا ہے نہ پوری مدہوشی میں، اس عالم کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد کامل ہوش اور صحو کا مقام آتا ہے، اس کا نام مقام عبدیت ہے، یہ انکساری اور خاکساری کا مقام ہے، اس مقام پر بندہ بندہ ہے اور خالق خالق ہے، یہی مقام حضرات انبیاء کا ہے، جن کے اللہ کی مخلوق کی رہنمائی اور ہدایت وابستہ ہے، اس منصب پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو کامل ہوش میں ہو، اس مقام پر پہنچنے کے بعد سالک راہ طریقت کو معلوم ہو جاتا ہے کہ مدہوشی کے پہلے مقام میں اس کی زبان پر ”تو ہی تو“ کا جو نعرہ تھا وہ شراب محبت کا اثر تھا، بنا بریں یہ توحید صرف شہودی ہے، حقیقی اور جودی نہیں“ وحدۃ الوجود کا سہارا لے کر بعض نام نہاد صوفیوں نے، اتحاد و حلول کی مصیبت اور گمراہی کمری کر دی تھی، حضرت مجدد صاحب نے اس زندہ اور اتحاد کے خلاف بھی زبردست جنگ کی اور اپنی تمام صلاحیتوں اور توانائیوں



کے ساتھ حق کو واضح کیا، اس سلسلے میں اُن کے بہت سے خطوط مطالعہ کے لائق ہیں۔ مکتوب ۴۲ دفتر دوم میں تحریر فرماتے ہیں، جو حضرات وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے قائل ہیں اُن کا منشاء و رادہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزیں اس کے ساتھ بالکل متحد ہیں اور حق تعالیٰ مرتبہ تنزیہ سے اتر کر دائرہ تشبیہ میں آ گیا ہے اور واجب ممکن بن گیا ہے، یہ سب کچھ اتحاد اور گمراہی ہے، ہمہ اوست، کے معنی یہ ہیں کہ صرف وہی موجود ہے اور سب نیست ہیں۔ مکتوب ۸۹ دفتر سوم میں لکھتے ہیں جو صوفیائے کرام ہمہ اوست کے قائل ہیں وہ عالم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد نہیں جانتے اور علول و سریان ثابت نہیں کرتے، وہ جو کچھ کہتے ہیں ظلیت کے اعتبار سے کہتے ہیں وجود و تحقق کے لحاظ سے نہیں، اگرچہ اُن کی عبارتوں اور بیانات سے اتحاد وجود کا شبہ ہوتا ہے لیکن ان کی مراد ہرگز یہ نہیں، یہ تو کھلی ہوئی گمراہی ہے، اس لئے ہمہ اوست کے معنی، ہمہ از دست“ ہی کے ہیں یعنی ظہور و شہود جو کچھ ہے اسی سے ہے۔ حضرت مجدد حساب کی ٹھوس اور خاموش انقلابی تحریک کا ہلکا سا نقشہ مکتوب ۶۵ دفتر اول، مکتوب ۸۱ دفتر اول، مکتوب ۶۷ دفتر دوم، مکتوب ۴۷ دفتر اول اور مکتوب ۵۴ دفتر سوم اور اسی طرح کے بہت سے خطوط سے سامنے آ جاتا ہے۔ خان جہاں جو سلطان وقت جہانگیر کے مقربان خاص میں تھے اُن کو ایک طویل مکتوب میں لکھتے ہیں۔ دیکھو بادشاہ مثل روح کے ہوتا ہے اور باقی انسان منزلہ جسم کے، روح ٹھیک ہے تو جسم بھی صحیح سلامت ہے، روح میں خرابی آ جائے تو جسم بھی خراب ہو جاتا ہے، ضروری ہے کہ بادشاہ کی اصلاح کی کوشش کرو کہ یہی تمام لوگوں کی اصلاح کی کوشش ہے۔ ایک خط میں شیخ فرید کو جو بارگاہ سلطانی کے ممتاز مقربین میں شامل تھے، تحریر فرماتے ہیں ”حاکم وقت کو دنیا سے وہی نسبت ہے جو پوزے بدن سے دل کو ہے، دل صحیح ہے تو بدن بھی صحیح ہے، دل میں فساد آیا تو بدن اور جسم بھی فاسد ہو جائے گا۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہ کی اصلاح و فساد سے دنیا کا اصلاح و فساد وابستہ ہے۔“ اسی طرح عام ماحول اور صلح کی اصلاح کے سلسلے میں بھی بہت سے خطوط ہیں، مکتوبات مجدد الف ثانی کی یہی وغیرہ

خصوصیات ہیں جنہوں نے ان کو ”ادب ملفوظ“ کی تاریخ میں بے مثال بنا دیا ہے۔ آخر میں علامہ اقبال کے اشعار بھی سنئے جائیں جو انہوں نے حضرت مجدد صاحب کے مزار پر ان کی شان میں کہے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر      وہ خاک کہ ہے زیرِ زمیں مطلعِ الوار  
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستار      اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صبا اسرار  
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے      جس کے نفس گرم سے ہے گرمیِ احرار  
وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں  
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار  
(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)

## انتخاب الترغیب والترہیب

مولفہ: حافظہ محدث ذکی الدین المنذری

ترجمہ: مولوی عبد اللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر زجر و عتاب پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس مضمون پر المنذری کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، اس کے متعدد تراجم ہوئے مگر نامکمل ہی شائع ہوئے کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اصل متن، تشریحی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ ملا کر طبع کرایا جائے۔ ندوۃ المصنفین نے نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔ صفحات ۴۵۰ قیمت ۱۲/- جلد ۱۳/-

لئے کاپیہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی



## ادبیات

# غزل

جنابِ نقضا ابنِ فیضی

قلم بھی حرف بھی لوح و کتاب بھی لے جاؤ  
بھٹکنے دو مرے ماحول کو اندھیروں میں  
جزیرہٴ مہ و اختر کے جادہ پیاؤ  
پھر اس کے بعد مرادِ درِ تشنگی پوچھو  
مے نفس میں ہے صرف اس کے پیار کی خوشبو  
دیارِ سنگ میں کیا خالی ہاتھ جاؤ گے  
جنوں سے کم نہیں آشفگی میں دیوانو!  
جہاں محیط ہے ظلمت دھکتے چہروں کی  
نہ جانے پیاس کا کب زاویہ بدل جائے  
وہ بزمِ محشرِ دیدہ و راں سہی، لیکن  
صبا سے بھی کسی شاخ پر سجادے گی  
اک اچھی شے ہے نشاطِ مطالعہ کے لئے  
جو سہ سکو مرے فن کا عذاب بھی لے جاؤ  
جہاں سحر ہو وہیں آفتاب بھی لے جاؤ  
وہیں پہ اب مری دنیا کے خواب بھی لے جاؤ  
لہو بھی بانٹ لو میرا، شراب بھی لے جاؤ  
ہواؤ! نکہتِ گل کا جواب بھی لے جاؤ  
یہ زخمِ سر کے سلگتے گلاب بھی لے جاؤ  
ہماری دانش خانہ خراب بھی لے جاؤ  
وہیں یہ دامنِ حبیب و نقاب بھی لے جاؤ  
سب کو کدوں میں چمکتے سراب بھی لے جاؤ  
وہیں مری نگہ انتخاب بھی لے جاؤ  
چمن میں یہ مرا زخمِ شباب بھی لے جاؤ  
جو پڑھ سکو مرے دل کی کتاب بھی لے جاؤ

بہ قدرِ ذوق نہیں اس کی نغمی بھی نقضا  
یہ اک غزل کا شکستہ رباب بھی لے جاؤ

## تبصرے

الہند فی العہد الاسلامی (عربی) | از مولانا سید عبدالحمی الحسنی لکھنوی، تقطیع  
کلاں، ضخامت ۷۰ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن قیمت درج نہیں۔ پتہ: دائرۃ المعارف العلماء  
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔

مولانا سید عبدالحمی صاحب الحسنی لکھنوی اپنے ہم نام مولانا عبدالحمی فرنگی محلی کی طرح جامعیت  
علوم و فنون، وسعت نظر اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے ہندوستان کے ان بلند پایہ علماء  
اور مصنفین میں سے ہیں جو اگرچہ بیسویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے کارنامے کمیت  
و کیفیت، اور نوعیت کے اعتبار سے علمائے سلف کے نہج پر ہیں، اردو میں چند کتابوں کے علاوہ  
مولانا کی دو کتابیں ”نزهت الخواطر“ (دس جلدوں میں) اور ”الثقافة الإسلامية في الهند“ جو شائع  
ہو کر عام ہو چکی ہیں عربی لٹریچر میں حوالہ کی کتابوں کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ بڑی  
خوشی کی بات ہے کہ اب مولانا کے ہی قلم سے عربی زبان میں ایک اور ضخیم کتاب حکومت  
ہند کی وزارت تعلیم کے خرچ پر بڑے اہتمام کے ساتھ چھپ کر شائع ہوئی ہے، اور یہ بھی  
مصنف علام کی جامعیت اور خصائص تصنیف کے آئینہ بردار ہونے کے باعث بڑی  
محبوب و غریب کتاب ہے، یہ کتاب اصلاً تین فنون پر تقسیم ہے، فن اول جو ہندوستان  
کے جغرافیہ پر ہے ایک مقدمہ اور پانچ ابواب پر تقسیم ہے، ان میں پہلے جغرافیہ کے اصطلاحات  
کی تشریح کی گئی ہے اور پھر ہندوستان کا جغرافیہ طبعی یعنی محل وقوع، یہاں کے پہاڑ،  
مدیا، آب و ہوا، پیداوار، پھول پھل، جڑی بوٹیاں، باغ و بادشاہ، حیوانات، کانیں،



مذہب اور زبانیں، صوبے، مشہور شہر، گاؤں اور قصبے، مشہور خطے اور علاقے، ہندوستان کا سیاسی جغرافیہ، یعنی وہ علاقے جن پر ہندوستانیوں (ہندو اور مسلمان) کا قبضہ ہے اور وہ علاقے جو انگریزوں، فرانسیسیوں یا پرتگالیوں کے زیر نگین رہے، پھر باشندگان ملک کی مجموعی آبادی اور مذہب داران کی تقسیم اور اعداد و شمار، یہ تمام چیزیں نہایت مفصل مکمل اور مرتب بیان کی گئی ہیں، فن ثانی جو ہندوستان کے بادشاہوں پر ہے دس ابواب اور ہر باب کے ماتحت مختلف فصول پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان میں اسلام کی آمد پر گفتگو کرنے کے بعد غزنوی، غوری، خاندان غلامان، خلجی، تغلق، پٹھان، تغل جو دلی کے تحت پر قابض رہے۔ ان کے علاوہ سلاطین کشمیر، شاہان دکن، سلاطین گجرات، سلاطین شرق (جونپور) بادشاہان مالوہ (مندو) پھر ملوک الطوائفی کے زمانہ کے بنگال، دکن، بہار و اڑیسہ، میسور، کرناٹک، اودھ اور روہیلکند وغیرہ کے نواب اور امراء، ان سب کا تذکرہ بڑے سلیقہ اور عمدگی سے کیا گیا ہے، فن ثالث جو خطہ اور آثار پر ہے اور ہمارے نزدیک یہی حصہ کتاب کی جان اور اس کا مغز ہے تین ابواب اور ہر باب کے ماتحت چند در چند فصول پر مشتمل ہے، اس حصہ میں جو ایک سو چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ان تمام رفاہی، علمی، تعلیمی، تمدنی اور مذہبی و سیاسی اقتصادی و معاشی اور تاریخی و ادبی کارناموں اور یادگاروں کا معلومات افزا اور بصیرت افروز تذکرہ جو مسلمان بادشاہوں، امراء و وزراء اور نوابان و سلاطین کے حسن ذوق و عمل اور ان کی حوصلہ مندانہ کوششوں اور مساعی کی مرہون احسان ہیں، چنانچہ اس میں بادشاہوں کے عادات و اطوار، ان کا رہن سہن، ان کے طور طریق، طریق جہان بانی، فوجوں کی تربیت و ترتیب، ان کے دفاتر، عہدے اور منصب، جشن اور تہوار، ان کے مطعومات و مشروبات، ان کی عداالتیں اور ان کے دربار، ان کے طبوسات اور تزیینات، ان کا مالی نظام، ان کے لگائے ہوئے باغات اور حین، سرکاری اور شاہراہیں، مساجد اور مدارس، ان کی عمارتیں، ان کے عہد کی ایجادات و اختراعات، نہریں اور حوض، پل، بازار، شفا خانے، سرائیں، درگاہ

رسل و رسائل، عجائب گھر، چڑیا گھر، غرض کہ ان میں کوئی چیز ہے جس کا مبسوط اور مکمل تذکرہ و تعارف ان صفحات میں نہیں ہے، علاوہ ازیں چونکہ فاضل مصنف کی وفات حسرت آیات ۱۹۲۳ء کے اوائل میں ہو گئی تھی۔ اور ظاہر ہے اس وقت سے لیکر اب تک جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اس ملک میں نہایت اہم اور عظیم تغیرات و تبدلات ہوئے ہیں، اس بنا پر مولانا کے فرزند ان گرامی ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نے ”تذیل و تکمیل“ لکھ کر اس کتاب کو بالکل اپنا ٹوڈیٹ بنا دیا ہے اور حق یہ ہے کہ فن ثالث کا بڑا حصہ انہیں دونوں بھائیوں کا مرہون قلم ہے، باپ بیٹے ہوں تو ایسے ہوں، فرزند ان ارجمند نے جو کچھ لکھا ہے وہ زبان و بیان، معلومات اور انداز جمع و ترتیب کے اعتبار سے اصل کتاب کے کینڈے میں اس طرح کھپ گیا ہے کہ اصل اور تذیل میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا، واقعی ! ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْہِ مَن یَّشَاءُ۔ مزید برآں مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نے شروع میں مختصر (منفصل سوانح عمری مولانا کے ہی قلم سے شائع ہو چکی ہے) مصنف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح حیات اور ایک مقدمہ کتاب بھی لکھا ہے، یہ دونوں بھی خاصہ کی چیزیں اور بہت مفید ہیں، مقدمہ میں مولانا نے بجا طور پر مصنف علام کا موازنہ علامہ مقریزی اور ابن عساکر کے ساتھ کر کے یہ بتایا ہے کہ جس طرح ان بزرگوں نے اپنے اپنے ملک کی تاریخ لکھ کر اس کے خدو خال کو اجاگر کیا اسی طرح مولانا نے یہ کتاب لکھ کر ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کا حق ادا کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس موضوع پر ابوالفضل کی ”آئین اکبری“ ایک نہایت جامع کتاب ہے، لیکن اولاً تو وہ فارسی میں ہے اور پھر اس میں اسی زمانہ تک کے حالات و واقعات ہیں، اس کے بعد فارسی، انگریزی اور کسی حد تک اردو میں بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں موضوع بحث کا اس درجہ جزئیاتی استقصار و حد استیعاب کیا گیا ہو، اس کتاب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عرب ممالک جو ہندوستان



میں مسلمانوں کے عہد کی تاریخ سے عام طور پر کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں وہ واقف ہو جائیں گے اور اس کا فائدہ نہ صرف مسلمانوں کو، بلکہ حکمرانیت اور ملک کو بھی پہونچے گا، ہمارے خیال میں حاجی الدیر کی کتاب "ظفر البوالہ منظر و آئہ" کے تجدید پہلی تاریخ ہے جو ہندوستان کے اسلامی عہد پر عربی زبان میں اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ فیضانِ اسلام۔

از مولانا سید ابوالحسن علی الندوی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۲۹ صفحات  
معرکہ ایمان و مادیت کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت مجلد ۵/3 پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

سورہ کہف قرآن مجید کی ایک نہایت اہم سورت ہے اور احادیث میں اس کے فضائل و مناقب بہت کچھ بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا نے اس سورت کی تفسیر پر پہلے چند مضامین لکھے، پھر ان مضامین کو مرتب کر کے عربی میں ایک کتاب شائع کی اور اب یہ زیر تبصہ کتاب اسی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو حسب معمول مولانا محمد الحسن مدیر البعث کے قلم شکستہ قلم سے سورہ کہف کی سب سے بڑی فضیلت جو احادیث میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اس کا ورد رکھے گا وہ آخر زمانہ میں دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ مولانا علی میاں یہ نہیں سمجھتے کہ دجال سے مراد کوئی خاص شخص ہے، بلکہ اس سے مراد ایک عظیم تہذیبی، سیاسی اور اجتماعی فتنہ ہے، جو تہذیب فرنگ کی شکل میں موجود ہے اور اس تفسیر کا سارا تار و پود اسی ایک مفروضہ سے تیار ہوا ہے، اگرچہ سورہ میں چار قصے بیان کئے گئے ہیں، لیکن مولانا کے نزدیک ان سب کا موضوع ایک ہی ہے یعنی ایمان اور مادیت کی کشمکش اور یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، یہ کس طرح؟ مولانا نے تاریخ، روایات اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان سب کو ثابت کرنے اور مغربی تہذیب کی ہولناکیوں اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیروں پر سورت کے مشتمل

کو منطبق کرنے کی سعی کی ہے، خود مولانا نے کتاب کے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے کہ ”اس سورۃ کے بارہ میں جو کچھ آگے آئے گا وہ مفسرین کے مخصوص طریقہ پر نہیں لکھا گیا ہے، بلکہ صرف تاثرات اور واردات کا مرقع اور سورۃ کہف کا ایک عمومی اور اصولی جائزہ ہے۔“ (ص ۷۶) ہماری رائے میں بھی اس کتاب کو سورۃ کہف کی تفسیر کہنا صحیح نہ ہوگا، بلکہ سورت کے مضامین سے مجموعی طور پر مغربی تہذیب کے پس منظر میں جو تاثرات پیدا ہوئے ان کا ایک بے ساختہ اور اثر انگیز بیان ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے قابل دید اور لائق مطالعہ ہے البتہ دو باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ مولانا نے (ص ۱۳) تورات کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی پر یقین اور اس کے لئے تیاری، زمین میں تخریب و فساد کی نفی اور زہد و قناعت کے مضامین سے خالی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر قرآن مجید میں اس کو ”ہدایت“ اور ”نور“ کیونکر فرمایا گیا؟ کیا ان بنیادی اہم مضامین سے خالی کتاب بھی قرآن کے نزدیک ہدایت اور نور ہو سکتی ہے؟ اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ تورات میں تحریف ہو گئی ہے، تو گزارش یہ ہے کہ تحریف تو حضور پر نور کے زمانہ میں ہی ہو گئی تھی، تو پھر اس کے باوجود قرآن نے اس کی کیوں مدح سرائی کی؟ اور کیا توراۃ اور انجیل سے متعلق قرآن کا وجود یہ ہے اس کے پیش نظر حسن ادب کا یہ تقاضا نہ ہوگا کہ ہم بھی اس معاملہ میں محتاط رہیں، اور جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی مذمت کریں اور جو لوگ ان تحریفات کے ذمہ دار ہیں ان کو طاعت کریں، لیکن نفس توراۃ و انجیل کو برا بھلا کہنے سے محتجب رہیں، علاوہ ازیں (۲) دوسری بات یہ ہے کہ مولانا نے جو عملی اور اخلاقی برائیاں یہود اور نصاریٰ میں بتائی ہیں کیا آج بھی وہی طور پر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیش گوئی کے مطابق خود مسلمان ان میں مبتلا نہیں ہیں جس کی منشا آج وہ بھگت رہے، اگر مبتلا ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر یہود اور نصاریٰ اپنی ان تمام معصیت کشیوں کے باوجود ”دراشت ارضی“ کے کیوں مالک ہیں اور مسلمان روز بروز کیوں بے وقعت اور کم حیثیت ہوتے جا رہے ہیں،؟ یہ وہ دواہم سوال ہیں



جن پر مولانا علی میاں جیسے روشن خیال اور وسیع النظر عالم اور بلند پایہ داعی اسلام کو ضرور غور کرنا چاہئے، !! پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک اور سوال جو دماغ میں ابھرتا ہے یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک سورہ کہف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا موضوع ایمان اور مادیت کشش ہے، گذارش یہ ہے کہ یہ تو قرآن مجید کا خاص موضوع ہے اور اس میں سورہ کہف کی ہی کیا خصوصیت! قرآن مجید کا تو ایک صفحہ بھی اس مضمون سے خالی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ اچھا تو پھر آپ کے نزدیک سورہ کہف کی کیا خصوصیت ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ سورہ کہف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو بظاہر ایک بالکل انہونی بات اور خلاف عقل واقعہ ہے لیکن جب قرآن نے اس کو بیان کیا ہے تو وہ سچا ضرور ہے، ایک مسلمان جب اس کو بار بار پڑھے گا تو اس کے دل پر خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و جلالت شان کا نقش زیادہ سے زیادہ گہرا ہوگا، اور اس کے دل میں اس بات کا بھی یقین پیدا ہوگا کہ حقائق کونیہ کے ادراک میں عقل ایک مسافر آبلہ پا ہے، اور اس کا سب سے یقینی ذریعہ وحی الہی ہے، ان دونوں چیزوں کے اذعان و یقین سے ایمان باللہ پختہ اور مستحکم ہوتا ہے اور انسان اندھا بن کر عقل کے پیچھے دوڑنے سے باز رہتا ہے، پس یہ ہے سورہ کہف کی وہ خصوصیت جس کے باعث اس کے اتنے فضائل و مناقب بیان فرمائے گئے ہیں۔

اداسرا ندوۃ المصنفین دہلی کے قواعد و ضوابط

اور فہرست کتب مفت طلب فرمائیے

مینجند وۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

موجودہ دنیا میں "اسلام" ہی نے تبلیغی مذہب کی یہ جھک یہ بنیاد رکھی تھی کہ "تم حسین ترین امت ہو اس لئے کہ تم بھلائیوں کو نافذ کرتے ہو۔ برائیوں کی راہ بند کرتے ہو اور اللہ پر یقین کامل رکھتے ہو۔" لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج ساری دنیا میں اگر کوئی غیر تبلیغی مذہب ہے وہ اسلام ہی ہے! آج اپنا پیغام ساری دنیا کی قوموں کو ان کی اپنی زبان میں اس طرح پہنچا رہی ہے کہ اگر کسی کا پتہ انہیں مل جاتا ہے تو فوراً ان کا لٹریچر بلا قیمت آنا شروع ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ آج دور اتحادہ امریکہ میں بدھ مت اور ہندو مت کے تبلیغی مرکز قائم ہو رہے ہیں اور یہ سارے مذاہب اور ان کے اصحاب خیر اپنی دولت اس مہم میں جھونک کر ان کے اصحاب قلم کو مفت مذہبی لٹریچر پھیلانے میں بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ ہماری تبلیغ کی ساری دھڑ دھوپ مسجد تک ہو کر رہ گئی یا قلی راہ سے مسلمانوں کیلئے اردو ہندی میں کچھ رسالے نکالنے اور کتابیں چھاپنے سے شروع ہو کر وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔ اسلام سے محروم انسانیت کا پورا سمندر ہماری تبلیغی رسائی سے دور ہو کر رہ گیا۔ ہمارے پاس کوئی ایک بھی ایسا ادارہ نہیں کہ جو مختلف قوموں کی نفسیات کے مطابق ان کی اپنی زبانوں میں مفت لٹریچر شائع کرنا تقسیم کر سکتا ہو۔ خدا کا کس طرح شکر ادا کیا جائے کہ اس نے انتہائی بے سرو سامانی کی حالت میں ہندی میں ہمارے مقصد کیلئے ماہنامہ "مارگ ویپ" نکالنے کی توفیق بخشی اور بہت جلد اس کو ان درد مند ان انسانیت کی بارگاہ میں باریابی اور اس مقصد کی پکار بلند کرنے کی راہ دکھائی۔

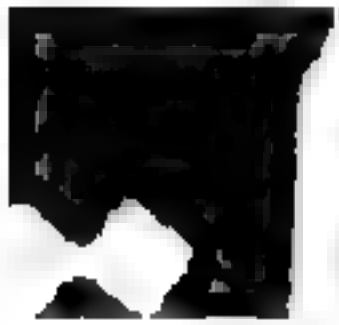
اب۔۔ ہم اس حقیر آواز کے ذریعہ ان تمام انسانوں کو ان کے اس عظیم ترین فرض کی پکار سناتا ہیں کہ جو کل ساری دنیا کے معبود حقیقی سے ملاقات کے دن اس معاملے میں سرخروئی کی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس مقدس ترین کام میں تعاون کر کے اپنے نامہ اعمال کو ایک بلند ترین نیکی سے آراستہ فرمائیں۔ اعزازی خریداری کی رقم پانچ سو (500) روپے سالانہ سے سو (100) روپے سالانہ تک۔ عام خریداروں کی رقم محض پانچ سو (500) روپے سالانہ رکھی گئی ہے جو تقریباً لاگت کے بقدر ہے۔ اس لئے کہ اس رسالہ سے ہمارا مقصد اس سرائے فانی میں دولت کے ڈھیر لگا کر بنانا نہیں ہے۔ وباللہ التوفیق!

ایڈیٹر ماہنامہ مارگ ویپ رشی پبلشنگ ہاؤس، خسرو باغ روڈ، رام پور (یوپی)



# انکم ٹیکس و ہندوگان!

تھکر انکم ٹیکس کی طرف سے



وہ جس نے ہندوگان کا لاکھ  
کیا ہے وہ انکم ٹیکس کے چلانوں،  
گوشتوں، سبزیوں، میٹوں، کتابت  
کا بھی نہ تنگ ہے، یہ انکم ٹیکس  
ما کے انکم ٹیکس خاتل  
کیا جائے۔

اگر خاتل سے آپ کو در مستقل کھاتہ نہ ہوا ہے ہو گئے ہیں  
یا کوئی بھی نہ ہوا ہے نہیں کیا گیا، تو انکم ٹیکس  
انکم ٹیکس انکم ٹیکس سے کہیں کہو آپ کے در سوے نہ ہو  
مستقل کریں یا کوئی نہ ہوا ہے کریں۔

انکم ٹیکس اپنے گوشتوں، میٹوں، سبزیوں وغیرہ پر اپنے  
مستقل کھاتہ نہ ہوا ہے جو انکم ٹیکس کے ہیں۔ اس سے  
جہاں آپ کے کہیں نہ کریں گے، وہاں تھکر ہی آپ کی  
پہرے سے تمام دے سکے گا۔

ملک کر دو۔  
ڈاکٹر کیو رٹ آف انکم ٹیکس  
(ریسٹریکٹڈ ٹیکس و ہندوگان کی پیش)  
نئی دہلی



# برہان

جلد ۱	ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۳ء	شمارہ ۳
-------	--	---------

- ۱۔ نظرات  
مقالات  
۱۳۶ سعید احمد اکبر آبادی
- ۲۔ رسول اللہ کی ولادت  
بچپن، شادی، بچے  
۱۵۰ جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب  
پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی دہلی
- ۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
تقسیم کے بعد  
۱۴۲ سعید احمد اکبر آبادی
- ۴۔ لیبیا میں سرقت و حراہ کے حدود  
۱۸۹ مولانا حبیب ریحان ندوی  
لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ البیضا ریبیا
- ۵۔ خلافت  
۲۰۸ ڈاکٹر محمد احسان اللہ صاحب
- ۶۔ تبصرے  
۲۱۳ س ع



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا عبدالسلام صاحب، فاروقی کا ۶۷-۶۸ برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال ہو گیا، مرحوم بلند پایہ عالم اور خوش بیان مقرر ہونے کے علاوہ بڑے صالح اور مستقی بھی تھے۔ فقہ ان کا خاص فن تھا اور استعداد بڑی پختہ تھی، اپنے معمولات کے بڑے پابند اور جو بھی ان کے افکار و خیالات تھے ان میں سخت جامد اور کڑ تھے۔ تواضع، فروتنی، سادگی اور بے لوثی ان کے اوصاف خصوصی تھے، ان اوصاف و کمالات کے باعث لکھنؤ کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، چنانچہ ان کے جنازہ کے نہایت عظیم جلوس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگوں کے علاوہ ان کی تعزیت کرنے والوں میں غیر مسلم حضرات کی بھی متدبہ تعداد شامل تھی، عمل اور اخلاق کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ نین جس سال (غالباً ۱۳۱۷ھ) مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں داخل ہوا ہوں اسی سال مرحوم بھی اپنے بڑے بھائی مولوی عبدالغفور مرحوم کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اور مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری کی نگرانی میں رہتے تھے، دونوں بھائی نہایت کم آمیز، شرمیلے اور کم گو تھے، اور طلباء سے بہت کم ملتے جلتے تھے، ایک عرصہ دراز کے بعد علی گڑھ میں ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یہ زمانہ یاد دلایا تو انھیں یاد آگیا اور اس کے بعد ابھی ایک برس پہلے جب یہاں دلی میں ملاقات

ہوئی تو بڑی محبت اور تعلق خاطر کے ساتھ پیش آئے۔ اب ایسے با وضوح، پاک باطن اور پاک نظر لوگ کہاں ملیں گے؟ اللہ تعالیٰ ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے، آمین

خدا خدا کر کے لاکھوں ستم دیدگان روزگار انسان جن میں جوان اور بوڑھے بھی تھے، مرد اور عورتیں بھی، بچے اور بچیاں بھی اور جو دو بیس سے امید و بیم اور خوف ورجا کی زندگی تینوں ملکوں میں الگ الگ بسر کر رہے تھے ان کی خلاصی و رستگاری کی راہ پیدا ہوئی اور ہندوستان و پاکستان کی حکومتوں کے نمائندگان خصوصی کی بات چیت و پچھلے دنوں نیو دہلی میں کامیاب رہی، تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ جنگ ہوتی ہے ہزاروں میدان جنگ میں کام آجاتے ہیں اور ہزاروں انسان اپنی آبادیوں میں رہتے ہوئے تباہی اور بربادی کے عفریت کا لقمہ بن جاتے ہیں، پھر جو بچ رہتے ہیں وہ مستقبل میں زندگی بسر کرنے کا نقشہ بناتے ہیں اور اب وہ بھول جاتے ہیں کہ کل کسی نے کسی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ آج تاریخ نے پھر اپنا وہ سبق دہرایا ہے اور مدیہ ہے کہ مصالحت کی گفتگو کے کامیاب ہو جانے کا سہرا خود پاکستان بنگلہ دیش کے سر باندھ رہا ہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس کریڈٹ میں ہندوستان اور پاکستان کا حصہ بھی برابر ہی کا ہے، بہر حال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اور اس سے انکار نہیں کہ بہت کچھ ہو چکا ہے اور تینوں ملک معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے اب تک اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور نہیں معلوم کب تک بھگتتے رہیں گے، اگر مصالحت کی بنیاد تینوں ملکوں کا یہ عزم صمیم اور سچے دل سے ان کا یہ عہد ہے کہ آئندہ وہ مل جل کر دوستی اور یگانگت کے جذبہ کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کا معاملہ خیر اندیشی اور غیر سگالی کا ہو گا تو کوئی مشبہ نہیں کہ یہ مصالحت بڑا مبارک اقدام ہے اور اس کو برصغیر میں پائیدار امن اور تینوں ملکوں کی ترقی اور خوش حالی کے لئے ایک فال نیک اور اس کا پیش خیمہ کہنا



چاہئے، ایک زمانہ میں یورپ کا کیا حال تھا؛ ایک ملک دوسرے ملک سے  
 برد آزما تھا، آئے دن باہمدگر دست و گریبان رہتے تھے، اور وحشت و  
 بربریت کا وہ کونسا سلوک تھا جسے ایک ملک اپنے حریف ملک کے  
 لوگوں کے لئے روانہ رکھتا ہو، لیکن علم و فن کی ترقی اور تہذیب و شائستگی  
 کے عروج کے باعث اب ان کا کیا عالم ہے! اور کس طرح یورپ کے یہی ملک  
 ایک دوسرے کے ساتھ متحد اور متفق ہیں، اگر مغرب میں یہ تجربہ  
 کامیاب ہو سکتا ہے تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا، علی الخصوص اس  
 وقت جب کہ اب سے ایک ربع صدی پیش یہ تینوں ملک ایک ہی  
 تھے اور اب بھی جزائیائے عہد بندوں کے باوجود تینوں میں نسلی، تاریخی،  
 ثقافتی، لسانی اور تہذیبی روابط اور تعلقات ہیں، ہم دعا کرتے ہیں کہ  
 خدا کرے یہ مصالحت پائدار امن کا پیش خیمہ ہو اور تینوں باہمدگر  
 صلح و آشتی اور دوستی کے ساتھ رہیں۔ و لیس ذالک علی اللہ  
 بعزیز۔

نومبر میں لکھنؤ میں اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی  
 جو ایک عظیم الشان کانفرنس اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے  
 ہو رہی ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جن اغراض و مقاصد  
 کے لئے اس کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے اس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں۔  
 ابھی پچھلے دنوں اس کانفرنس کے ایک نہایت سرگرم اور پر جوش کارکن  
 دوست سے یہ معلوم کر کے سخت مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ ان غیر مسلم  
 ادیبوں اور شاعروں کی جو فہرست تیار ہوئی ہے اس میں اس وقت تک

ڈیڑھ ہزار ناموں کا اندراج ہو چکا ہے، اسے واہ اردو کی شان !  
اتنا ہی یہ ابھرے گی جتنا کہ دبا دیں گے

## انتخاب الترغیب والترہیب

حصہ اول

مولفہ : حافظ ذکی الدین المنذری

ترجمہ : مولوی عبداللہ صاحب دہلوی

اعمال خیر پر اجر و ثواب اور بد عملیوں پر زجر و عتاب پر متعدد کتابیں  
لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر المنذری کی اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب  
نہیں ہے، اس کتاب کے متعدد تراجم ہوئے مگر نامکمل ہی شائع ہوئے۔  
کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اس کی ضرورت تھی کہ اصل متن  
تشریحی ترجمہ اور حواشی کے ساتھ ملا کر طبع کرایا جائے۔ ندوۃ المصنفین نے  
نئے عنوانوں اور نئی ترتیب کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے جس کی  
پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔ دوسری جلد زیر ترتیب ہے۔

صفحات ۴۵۰ قیمت ۱۲/- مجلد ۱۳/-

ملنے کا پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد ہلالی



# رسول اللہ کی ولادت

## بچپن، شادی، بچتے

(۲)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

محمد رسول اللہ کے والد عبد اللہ اور دادا عبد المطلب تھے۔ عبد المطلب کا پردادا مکہ کا پہلا قرشی حاکم قصی بن کلاب تھا جس نے پچاس ساٹھ برس پہلے قریش کے بھرے ہوئے پسماندہ اور گمنام خاندان کو مکہ میں آباد کر کے وہاں کے یمنی مکہ انوں کو نکال کر قریشی عظمت کی بنیاد استوار کی تھی۔ عربی روایت کے مطابق عبد المطلب یمن کے کسی رئیس کے ہاں مہمان تھے کہ آسمانی کتابوں کے ایک عالم سے ان کی ملاقات ہوئی، اس نے بتایا کہ آپ کے خاندان میں نبی پیدا ہوگا جس کی ماں قریش کے زہرہ گھرانے کی عورت ہوگی۔ عبد المطلب نے مکہ لوٹ کر پہلی فرصت میں اپنے لڑکے عبد اللہ کی زہرہ خاندان کی لڑکی آمنہ بنت زہب سے شادی کر دی۔ عبد المطلب بھاری بھر کم، وجیہ و جمیل آدمی تھے، دیکھنے والا انہیں دیکھ کر مرعوب ہو جاتا تھا، ان کے لڑکے بھی ان کی طرح قداور، شکیل اور رعب دار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ کی پیشانی پر نبوت کا نور جھلکتا تھا جسے دیکھ کر ایک قیافہ شناس باخبر عورت نے ان سے شادی کی فرمائش کر دی تاکہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کی ماں بننے کا اسے فخر حاصل ہو، عبد اللہ کی بات آمنہ سے طے ہو چکی تھی اس لئے اس کی مراد بر نہ آئی۔

رسول اللہ آمنہ کے پیٹ میں تھے تو کسی نے ان سے خواب میں کہا: تمہارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ اور نبی ہے یا تمہارے ایک بچہ ہوگا، اس کا نام احمد رکھنا، وہ ساری دنیا کا بادشاہ بنے گا یا تمہارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ ہے۔ جب رسول اللہ پیدا ہوئے تو آمنہ نے دیکھا کہ ان کے جسم سے ایک روشنی نکلی جس سے بھری (شام) کے محل جگمگانے لگے۔

رسول اللہ کی ولادت سے کئی ماہ پہلے ان کے والد عبد اللہ ایک تجارتی قافلہ لے کر جنوبی شام کے ساحلی تجارتی مرکز غزہ گئے جسے آج کل انگریزی میں گازامہ کہاجاتا ہے۔ وہاں سے فروخت کے لئے شام کی مصنوعات لے کر آرہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑ گئے اور علاج کے لئے مدینہ میں ٹہر گئے جہاں ان کی ننھیال تھی، مرض نے پیچھا نہ چھوڑا اور ایک ماہ بیمار رہ کر پچیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

رسول اللہ کی ولادت لگ بھگ ۵۶۸ء عیسوی میں ہوئی، اُس وقت فارس کے شہنشاہ کسری نوشیرواں کی تاجپوشی کو چالیس سال گزر چکے تھے۔ ولادت کے بعد ان کے دادا عبد المطلب انہیں خانہ کعبہ لے گئے، ان کی پیدائش پر خدا کا شکر ادا کیا اور ان کی سلامتی و کامرانی کی دعا مانگی۔ رسول اللہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح صاحب جلال و جمال تھے۔ خوشحال عربوں میں ماؤں کی بجائے کنیزوں اور نادار عورتوں سے اجرت دے کر دودھ پلوانے کا دستور تھا، پہلے رسول اللہ کے گھر کی ایک کنیز ثویبہ نے کچھ دن دودھ پلایا پھر وہ پرورش اور دودھ پلانے کے لئے گاؤں کی ایک

۱۔ ابن سعد ۱/۹۸

۲۔ ایضاً ۱/۱۵۱

۳۔ ابن ہشام ص ۱۰۲، انساب الاشراف ۱/۸۱

۴۔ ابن ہشام ص ۱۰۲

۵۔ انساب الاشراف ۱/۱۰۳



عورت حلیمہ بنت عبداللہ کے سپرد کر دیئے گئے۔ حلیمہ انہیں اپنے گاؤں لے گئی، گاہے گاہے انہیں آمنہ کے پاس لاتی رہتی تھی۔ جب رسول اللہؐ پانچ سال کے ہوئے تو حلیمہ نے انہیں مستقل طور پر آمنہ کے حوالہ کر دیا۔ چھ سال کی عمر میں آمنہ رسول اللہؐ کو لے کر مدینہ گئیں جہاں ان کی نخیال تھی، وہاں ایک ماہ قیام کے دوران رسول اللہؐ نے تیز ناسیکہ لیا، واپسی پر مدینہ کے مضافات میں بمقام ابواء آمنہ کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفنائی گئیں۔ رسول اللہؐ کی کھلائی ام یمن انہیں لے کر یثرب آئیں مکہ میں ان کے دادا عبدالطلب ان کے سر پرست ہو گئے۔ عبدالطلب حج کے اہم ترین عہدوں۔ رقادہ و سباقیہ پر فائز ہونے کے علاوہ مکہ کے سارے قرشی اکابر سے زیادہ معزز، باوقار اور بارسوخ شخصیت تھے اور خانہ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں مجلس کیا کرتے تھے، ان کے لئے ایک قالین پر گاؤتکیہ رکھا جاتا تھا، قالین کے حاشیہ پر ان کے لڑکے اور ملاقاتی بیٹھ کر ان کا انتظار کیا کرتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ عبدالطلب سے پہلے رسول اللہؐ آجاتے اور گاؤتکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتے ان کے چچا انہیں ہٹانے کی کوشش کرتے لیکن وہ نہ ہٹتے، اتنے میں عبدالطلب آجاتے اور لڑکوں سے کہتے: بیٹھنے دو میرے بیٹے کو (گاؤتکیہ سے لگ کر)، میرا بیٹا بادشاہ بننا چاہتا ہے (ان ابنی یحمد اللہ نفسه بملاک)

دو سال بعد جب رسول اللہؐ آٹھ سال کے تھے عبدالطلب کا بیاسی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا، ان کے بارہ لڑکے، چھ لڑکیاں اور چھ بیویاں تھیں، مرتے وقت عبدالطلب نے رسول اللہؐ کو اپنے لڑکے ابوطالب کی سرپرستی میں دے دیا اور ہر طرح ان کا خیال رکھنے کی وصیت کر دی۔ جب رسول اللہؐ بارہ سال کے ہوئے تو ابوطالب نے شام کے سفر کی تیاری کی۔ ابوطالب رسول اللہؐ کو بہت چاہتے تھے اور رسول اللہؐ بھی ان سے بہت مانوس تھے، اس کے باوجود

لہ ابن سعد ۱/۱۱۶

لہ ایضاً ۱/۱۱۶

ابوطالب نے سفر کی گفتگو کے پیش نظر رسول اللہ کو شام لے جانا مناسب نہ سمجھا اور جانے والوں کی فہرست میں انہیں داخل نہیں کیا۔ رسول اللہ کو اس کا بہت دکھ ہوا، انہوں نے چچا سے مندرجہ ذیل کے ساتھ لے چلے اور جب وہ نہ مانے تو روکنے لگے۔ ابوطالب کا دل بھرا آیا اور بھتیجے کو ساتھ لے لیا۔ شام پہنچ کر ابوطالب کا تجارتی قافلہ شہر بصری کے ایک گرجا کے پاس اتراجو مشرقی اردن میں شام کا ایک تجارتی مرکز تھا جہاں سے ہو کر کئی تجارتی راستے ملک کے بڑے بڑے شہروں کو جاتے تھے۔ گرجا کا ایک راہب تھا بحیرا نامی، رسول اللہ کا جلال و جمال دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا، اسے ان کے چہرہ اور آنکھوں میں کچھ ایسی علامتیں نظر آئیں جو اس نے انجیل میں آنے والے نبی کی پڑھی تھیں، مثلاً لال آنکھیں، دونوں کندھوں کے درمیان کبوتر کے اندھے کے برابر ایک ابھار، اُس نے ابوطالب سے کہا تمہارا بھتیجا منصب نبوت پر فائز ہوگا۔

ابوطالب کی آمدنی کم اور مالی ذمہ داریاں زیادہ تھیں، خرچ کی ایک مدہ ہر سال زائرین کعبہ کے لئے کھانے پینے کا بندوبست تھا جس کے لئے انہیں چندہ میں ایک گران قدر رقم دینا ہوتی تھی اور کبھی چندہ کی رقم وہ اپنے مالدار بھائی عباس بن عبدالمطلب سے قرض لے کر دیتے تھے۔ جب رسول اللہ بائیس تیس سال کے ہوئے تو ابوطالب نے ان سے کہا: میری مالی حالت خراب ہے، قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے، اس میں خدیجہ بنت خویلد کا کافی سامان ہے تم خدیجہ سے ملو اور شام میں ان کا سامان بیچنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرو، مجھے امید ہے کہ وہ بخوشی تمہاری خدمات قبول کر لیں گی۔ خدیجہ مکہ کے پہلے قرشی حاکم قصی کے پر پوتے کی رط کی تھیں، شریف خاندان، منظم اور نہایت مالدار، ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، وہ ہر سال تجارت کا سامان خرید کر حجاز اور شام کے بازاروں میں بیجا کرتی تھیں۔ ابوطالب کے حسب ہدایت



رسول اللہ ﷺ خدیجہ سے ملے، انھوں نے خوشی سے رسول اللہ کی خدمات دو چند معاوضے کے بالمقابل حاصل کر لیں۔ شام میں داخل ہونے کے بعد حسب سابق رسول اللہ نے بصری کے گرجا کے پاس پڑاؤ ڈالا، اس موقع پر عربی روایت کے مطابق شطرنج نامی راہب رسول اللہ کے جلال و جمال سے متاثر ہوا اور نبیؐ کی طرح اسے ان کی لال آنکھوں اور چہرہ پر نبوت کی علامتیں نظر آئیں جن کا اس نے رسول اللہ کے ساتھی منیرہ سے ذکر کیا جسے خدیجہ نے رسول اللہ کی خدمت اور سامان کی نگرانی کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ منیرہ نے جو کچھ شطرنج سے سنا رسول اللہ کو بتا دیا اور مکہ واپس آ کر خدیجہ کو بھی مطلع کیا۔ خدیجہ کو رسول اللہ کی معرفت تجارت کرانے سے سابق کی نسبت دگنا فائدہ ہوا اور انھوں نے رسول اللہ کو مقررہ معاوضہ سے دو چند معاوضہ دیا۔ وہ رسول اللہ کے جلال و جمال سے متاثر تھیں ہی، ان کی تجارتی کارگزاری اور ان کے بارے میں نبوت کی بشارت سے ان کی اور زیادہ گرویدہ ہو گئیں اور ان سے شادی کی طلبگار ہوئیں۔ انھوں نے نفیسہ نامی ایک عورت کو رسول اللہ کا عندیہ لینے بھیجا، نفیسہ نے کہا: محمد تم شادی کیوں نہیں کرتے؟ رسول اللہ: میرے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ مہر ادا کر سکوں۔ نفیسہ: اگر روپیہ کا بندوبست ہو جائے اور تمہیں ایک خوبصورت، مالدار، شریف خاندان اور تمہارے ہم رتبہ عورت مل جائے تو اس سے شادی کرنا قبول کر لو گے؟ رسول اللہ: وہ عورت کون ہے؟ نفیسہ: خدیجہ بنت خویلد۔ رسول اللہ: اس سے شادی کس طرح ممکن ہے؟ نفیسہ: اس کا بندوبست میں کر دوں گی۔ رسول اللہ: مجھے شادی منظور ہے۔ نفیسہ نے جا کر سب باتیں خدیجہ کو بتائیں۔ خدیجہ نے رسول اللہ سے کہلا بھیجا کہ فلاں وقت آ کر مجھ سے مل لو۔ خدیجہ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے اپنے چچا عمرو بن اسد کو بلا بھیجا کہ آکر ان کی شادی کرادیں۔ رسول اللہ اپنے چچاؤں کو لے کر آ گئے، دوسو پچاس روپیہ مہر پر نکاح ہو گیا۔ اُس وقت رسول اللہ کی

عمر تیس سال اور خدیجہ کی اٹھائیس سال تھی۔ بعض لوگ پچیس اور چالیس سال بتاتے ہیں۔  
 خدیجہ کے رسول اللہ سے دُلہ کے ہوئے۔ قاسم اور عبد اللہ، چار لڑکیاں۔ زینب، رقیہ،  
 فاطمہ اور ام کلثوم، ان سب میں ایک ایک سال کا فرق تھا اور سب نے اجرت پر دودھ پلانے  
 والی عورتوں کا دودھ پیا تھا۔ خدیجہ لڑکے کے عقیقہ پر دو بکریاں اور لڑکی کے عقیقہ پر ایک  
 بکری ذبح کیا کرتی تھیں۔ رسول اللہ کے دونوں لڑکے کم سن میں ہجرت سے پہلے فوت ہو گئے۔  
 خدیجہ نے رسول اللہ سے پوچھا: تم سے میری اولاد بعد انتقال کہاں جائے گی؟ رسول اللہ:  
 جنت میں۔ خدیجہ: بغیر اچھے کام کئے ہوئے۔ رسول اللہ: ان کے عمل کا حال خدا کو معلوم ہے۔  
 خدیجہ: سابقہ (دو) شوہروں سے میرے متوفی کم سن بچے کہاں جائیں گے؟ رسول اللہ: دوزخ  
 میں۔ خدیجہ: بغیر برے کام کئے ہوئے انہیں یہ سزا ملے گی؟ رسول اللہ: ان کے عمل کا حال خدا کو  
 معلوم ہے۔

رسول اللہ کی سب سے بڑی لڑکی زینب کی شادی اعلان نبوت سے چند سال پہلے اس کے  
 خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیعہ (لقبیط) سے ہوئی، ابوالعاص مکہ کا ایک دولتمند، نیک طینت  
 اور خوش معاملہ آدمی تھا۔ اعلان نبوت کے بعد خدیجہ اور ان کی چاروں لڑکیاں مسلمان ہو گئیں تو بعض  
 قرشی اکابر نے ابوالعاص سے کہا کہ محمد کی لڑکی کو طلاق دیدو پھر تم جس قرشی لڑکی سے چاہو گے  
 تمہاری شادی کرادی جائے گی۔ ابوالعاص طلاق دینے کے لئے تیار نہیں ہوا، اس نے کہا زینب  
 کے اسلام سے ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی ناخوش گوار تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہے، وہ اپنے مذہب  
 پر عامل ہے، میں اپنے مذہب پر قائم ہوں، اس کے یا اس کے والد کی طرف سے مجھے مذہب بدلنے

۱۔ ابن سعد ۸/۱۷، انساب الاشراف ۱/۹۸

۲۔ ابن سعد ۱/۱۳۴

۳۔ یعقوبی ۲/۳۵



پر نہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ طلاق دے۔ ہجرت کے دوسرے سال اجتماعی دباؤ میں آکر ابوالعاص قرشی اکابر کے ساتھ جنگ بدر میں شریک ہوا اور کئی درجن دوسرے قریشیوں کی طرح میدان جنگ میں گرفتار ہوا۔ رسول اللہؐ کو روپے کی ضرورت تھی اور سارے گرفتار قریشی ان کے شہ دار تھے اس لئے طے ہوا کہ زرِ مخلص لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ زرِ مخلص کی رقم حسب حیثیت فی کس دو ہزار، ڈیڑھ ہزار اور ہزار روپے مقرر کی گئی۔ زینب کو شوہر کی گرفتاری کا علم ہوا تو انہوں نے ایک ہار ابوالعاص کی رہائی کے لئے مکہ سے بھیجا، یہ ہار انہیں خدیجہ نے جہیز میں دیا تھا، اسے دیکھ کر رسول اللہؐ کا دل بھر آیا۔ (نوش لہا س قہ شد یدتہ) انہوں نے ساتھیوں سے کہا: یہ ہار خدیجہ کا دیا ہوا ہے، اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو اسے واپس اور ابوالعاص کو رہا کر دیا جائے۔ صحابہ تیار ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے ابوالعاص سے کہا کہ تمہیں اس شرط پر رہا کر سکتا ہوں کہ مکہ جا کر زینب کو میرے پاس بھیجنے کا وعدہ کرو۔ ابوالعاص نے وعدہ کر لیا۔ رسول اللہؐ نے اپنے لے پالک زید بن حارثہ کی قیادت میں ایک ٹولی مکہ کے پاس ایک مقام پر زینب کو اپنی حفاظت میں مدینہ لانے کے لئے بھیجی۔ ابوالعاص نے وعدہ پورا کیا اور زینب کو اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ اونٹ پر سوار کر کے بھیج دیا۔ مکہ سے باہر کچھ قریشیوں نے زینب کا اونٹ دیکھا، ان میں سے ایک شخص شرارۃً زینب کو ڈرانے کے لئے اُن کی طرف نیزہ لے کر لپکا، زینب ڈر گئیں، ان کے پیٹ میں بچہ تھا، کئی دن بعد انہیں استقاط ہو گیا اور ایک خبر یہ ہے کہ اس شہری کے نیزے سے اونٹ بدکا، زینب گر گئیں اور ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔

ہجرت کے چھٹے سال ابوالعاص ایک تجارتی قافلہ لے کر شام سے مکہ آ رہا تھا، جب وہ مدینہ کے نواح میں پہنچا تو رسول اللہؐ کے جاسوسوں نے انہیں قافلہ کی خبر دی، رسول اللہؐ

۱۔ انساب الاشراف ۱/ ۳۹۷، ابن ہشام ص ۲۶۵

۲۔ انساب الاشراف ۱/ ۳۹۸

نے قافلہ کا سامان بچھیننے کے لئے ایک فوجی دستہ بھیجا، دستہ نے ابوالعاص کو گرفتار کر لیا اور سامان سے لدے ہوئے سارے اونٹ پکڑ لئے۔ ابوالعاص رات میں مدینہ پہنچا اور زینب سے پناہ مانگی، انہوں نے دے دی اور اگلی صبح نماز فجر کے بعد عورتوں کی صف سے اٹھ کر زینب نے کہا: سب لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ میں نے ابوالعاص کو پناہ دے دی ہے۔ لوگوں نے رسول اللہ کا اشارہ پا کر زینب کی امان قبول کر لی۔ رسول اللہ نے پکڑنے والے دستہ کے ارکان سے کہا جو قرآنی مضابطہ، غلبت کے مطابق اس کے پانچ حصوں میں سے چار کے حقدار تھے: میرا ابوالعاص سے جو رشتہ ہے اس سے تم واقف ہو، میں چاہتا ہوں کہ اس کا مال واپس کر دیا جائے۔ دستہ کے ارکان تیار ہو گئے۔ ابوالعاص مسلمان ہو گیا۔ رسول اللہ نے زینب کو بلا تجدید نکاح اس کے حوالہ کر دیا۔ ابوالعاص نے رسول اللہ کی کسی جنگ میں شرکت نہیں کی، پانچ چھ سال بعد سلمہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ابوالعاص سے زینب کے دو بچے تھے۔ علی اور امامہ۔ علی کا لڑکپن میں انتقال ہو گیا، امامہ سے علی حیدر نے فاطمہ کی وفات کے بعد شادی کر لی۔ ابوالعاص کے پاس جانے کے تقریباً دو سال بعد شہرہ میں زینب نے وفات پائی۔

رسول اللہ کی منجھلی اور چھوٹی لڑکی رقیہ اور ام کلثوم رسول اللہ کے چچا ابولہب کے لڑکوں عتبہ اور معتبہ کو بیاہی تھیں، اعلان نبوت کے پہلے سال سے رسول اللہ کے تعلقات ابولہب سے زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے، ابولہب اور اس کی بیوی ام جمیل کی مذمت میں جب ثبت ید ابا ابی لہب والی سورت نازل ہوئی تو دونوں میاں بیوی سخت برہم ہوئے اور جوش انتقام میں آ کر انہوں نے اپنے دونوں لڑکوں سے رقیہ اور ام کلثوم کو طلاق دلوادی۔ کچھ عرصہ بعد رقیہ کی شادی رسول اللہ نے عثمان غنی سے کر دی جن کا تعلق ابوالعاص کی طرح عبد شمس کے ایک معزز گھرانے سے تھا



اور جو ابوالعاص کی طرح خب مالدار بھی تھے، صورتِ شکل بھی اچھی تھی اور صاف ستھری پڑ آرام زندگی بسر کرتے تھے۔ اعلانِ نبوت کے پانچویں سال اکابر قریش کی مخالفت بڑھی اور عثمان غنی کے رشتہ دار انھیں ڈرانے اور ستانے لگے تو رسول اللہ کے ایما پر عثمان غنی رقیہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے جہاں کے تاجروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ سات آٹھ سال بعد جب ہجرت ہوئی تو وہ مع رقیہ مدینہ آ گئے۔ ہجرت کے دوسرے سال ٹھیک اس وقت جب بدر میں رسول اللہ اور قریش کی فوجیں صف آرا ہونے والی تھیں رقیہ چیمپ میں مبتلا ہوئیں اور کچھ دن بعد دنیا سے کوچ کر گئیں۔ عثمان غنی کے رقیہ سے ایک بچہ تھا عبد اللہ جس کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ رسول اللہ کا اشارہ پا کر عثمان غنی نے رقیہ کی بہن ام کلثوم سے شادی کر لی۔ ام کلثوم کو اعلانِ نبوت کے پہلے سال طلاق دی گئی تھی، اس وقت سے سلسلہ ہجرت تک تقریباً تیرہ چودہ سال وہ بیوہ رہیں یا ان کی کسی سے شادی ہوئی، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ام کلثوم کا سلسلہ میں انتقال ہوا۔

ہجرت کے بعد ابوبکر صدیق نے رسول اللہ کی تیسری لڑکی فاطمہ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے رشتہ مناسب نہ سمجھا، پھر عمر فاروق کا پیغام آیا، رسول اللہ نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور سلسلہ کے ادائل میں فاطمہ کی شادی اپنے چچا زاد بھائی علی حیدر سے کر دی جو آٹھ نو سال کی عمر سے رسول اللہ کی سرپرستی میں تھے۔ فاطمہ کا سلسلہ میں رسول اللہ کی وفات کے چند ماہ بعد ستائیس اٹھائیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ علی حیدر کے ان سے پانچ بچے تھے، تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔ حسن، حسین، محسن، زینب اور ام کلثوم۔ محسن بچپن میں فوت ہو گئے۔

۱۰ الشاہب الاشراف ۱/۴۰۱

۱۱ ایضاً ۱/۴۰۲

خدیجہؓ نے رسول اللہؐ کے ساتھ تقریباً تیس سال گزارے، سترہ سال اعلان نبوت سے پہلے اور دس سال اعلان کے بعد۔ جب خدیجہؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہؐ نے ان سے کہا: جنت میں اپنی سوتوں سے میرا سلام کہہ دینا۔ خدیجہؓ: وہ کون ہیں؟ رسول اللہؐ: خدا نے جنت میں تم سے میری شادی کی اور تمہارے علاوہ مریم بنت عمران سے، آسیہ بنت مزاحم سے اور موسیٰ کی بہن کلثوم سے۔

ہجرت سے تین سال قبل اور اعلان نبوت کے دسویں سال پہلے ابوطالب کا انتقال ہوا اور اس کے چند ہفتے بعد خدیجہؓ رحلت کر گئیں۔ ان دونوں کی وفات رسول اللہؐ کے لئے ناقابل تلافی خسارہ تھی، ان کے لئے دونوں کا وجود بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ابوطالب ان کے حامی و پاساں تھے، انھوں نے قرشی اکابر کے ہاتھوں رسول اللہؐ کو کبھی ذک نہ پہنچنے دی اور ان کے قتل کے منصوبوں کو اپنے رسوخ اور تدبیر سے ہمیشہ ناکام بناتے رہے (کان ابوطالب یحفظہ ویحوطہ ولعیضہ دینصرہ الی ان مات) خدیجہؓ کی دولت مندی نے رسول اللہؐ کو معاشی نکروں سے آزاد کر دیا تھا اور ان کے مشن میں پیش آنے والی آزمائشوں میں وہ اپنے پیسے، خاندانی اثر اور دل خوش کلمات سے ان کا حوصلہ بلند رکھتی تھیں۔

وثوق کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ شادی کے بعد سے اعلان نبوت تک جو سترہ سال گزرے اُن میں رسول اللہؐ کے مشاغل اور سرگرمیاں کیا تھیں، ہماری معلوم کی حد تک ان کے مشاغل اور سرگرمیوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ قرآن کا سہارا لے کر کہا جاسکتا ہے کہ اس عرصہ میں

۱۔ یعقوبی ۳۵/۲

۲۔ ابن سعد ۱۲۵/۱

۳۔ ایضاً ۱۳۱/۱

۴۔ ابن ہشام ۱۵۵



وہ اپنا دو تہہ تاجر بیوی کے ساتھ کاروبار کی دیکھ بھال اور اعلان نبوت کے لئے زمین تیار کرنے میں مصروف رہے ہوں گے۔ اس طویل عرصہ میں رسول اللہ کی سرگرمیوں کی سرف ایک جھلکی عربی کے قدیم ترین مافذوں میں نظر آتی ہے جسے یہاں پیش کیا جاتا ہے: اس جھلکی کا تعلق خانہ کعبہ کی تعمیر نو سے ہے۔ مکہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا شہر ہے، جب زیادہ بارش ہوتی تو پہاڑیوں کے پانی کی بارش مکہ میں گس آتی اور نشیبی علاقے غرق ہو جاتے، کبھی کبھی خانہ کعبہ میں بھی پانی بھر جاتا، بار بار اس عمل کے زیر اثر خانہ کعبہ کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں، چھت اور دیواروں میں شکاف پڑ گئے تھے۔ قرشی اکابر نے از سر نو مضبوط بنیادوں پر کعبہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا، یہ بھی طے ہوا کہ اس کے لئے جو چندہ دیا جائے وہ کلیتہً ملال اور پاک کھائی کا پیسہ ہو۔ اس زمانہ میں ایک یونانی کشتی بحر قلزم میں جدہ کے پاس شعیبہ بندرگاہ کے قریب چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی تھی، اس کا پکتان جس کا نام باقوم تھا کشتی کو ساحل تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خبر قریش کو ہوئی تو انہوں نے اپنا ایک نمائندہ شعیبہ بھیجا، اس نے باقوم سے خانہ کعبہ کے کواڑ، چھت اور ستونوں کے لئے لکڑی خرید لی، عرب فن تعمیر سے ناواقف تھے اس لئے نمائندہ نے باقوم سے کہا کہ چند یونانی سماروں کا انتظام کر دے۔ باقوم کو خود عمارت بنانے کا تجربہ تھا، اس نے اپنی خدمات پیش کیں اور مع لکڑی کے مکہ آ گیا۔ خانہ کعبہ کی پرانی چہار دیواری گوا دی گئی اور آس پاس سے پتھر جمع کئے گئے۔ برکت حاصل کرنے کے لئے قریشی اکابر کی طرح رسول اللہ بھی کچھ پتھر اٹھا کر لائے۔ نئی تعمیر کے وقت کعبہ کے کمرہ کا رقبہ کئی گز کم کر دیا گیا، دیواریں اور بنیادیں پتھر سے چنی گئیں، چھت میں پندرہ کڑیاں ڈالی گئیں اور اس کے نیچے چھ لکڑی کے ستون نصب کئے گئے، دروازہ پہلے کی نسبت بہت اونچا رکھا گیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جاسکے اور صرف دربان کی اجازت سے دخول کی تمہیدیں پوری کر کے اندر جائے۔ مکہ کے سارے قرشی خاندانوں کو چار حصوں میں بانٹا گیا، ہر حصہ یا فریق نے ایک دیوار اور چوتھائی چھت کا خرچہ اپنے ذمہ لے لیا۔ ہر فریق سرخرو ہونے کے لئے چاہتا تھا کہ دروازے والی دیوار

اس کے پیسے سے بنے، اس لئے قرعہ ڈالا گیا، قرعہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے نام پر نکلا، اب ایک دوسرا قضیہ پیدا ہوا، ہر فریق کی خواہش تھی کہ حجر اسود کو خانہ کعبہ میں رکھنے کا شرف اُسے حاصل ہو، معلوم نہیں اس قضیہ کا حل بھی قرعہ ڈال کر کیوں نہیں کیا گیا، طے یہ ہوا کہ جو شخص سب سے پہلے کعبہ کے دروازہ سے داخل ہوا سے اپنے ہاتھ سے حجر اسود رکھنے کا کام سونپا جائے۔ اتفاق سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ تھے۔ انہیں قضیہ کا علم ہوا تو انہوں نے ایک ایسا حل نکالا جس سے قریش کے ہر فریق کو حجر اسود اٹھانے کی فضیلت حاصل ہو گئی، انہوں نے اپنی سفید شامی چادر زمین پر پھیلا دی، اس کے بیچ میں حجر اسود رکھا اور چاروں فریقوں کے نمائندوں سے کہا کہ چادر کا ایک ایک کونا پکڑ لیں، پھر چاروں نے چادر میں رکھا ہوا حجر اسود اٹھایا اور خانہ کعبہ میں لے گئے۔ حجر اسود کا زیریں حصہ اونچا نیچا تھا، اسے سیدھا رکھنے کے لئے رسول اللہ کو مزید ایک پتھر کی ضرورت ہوئی۔ حاضرین میں سے ایک غیر قرشی عرب جو نجد کا باشندہ تھا پتھر لانے کے لئے اٹھا تو رسول اللہ نے یہ کہہ کر اسے پتھر لانے سے روکا: خانہ کعبہ کے تعمیری کاموں میں صرف قرشی حصہ لے سکتا ہے، دوسرا آدمی نہیں (انہ لیس یبنی معنای البیت الاحمنا) یہ بات نجدی کو بری لگی اور اس نے رسول اللہ کی تنقیص میں کچھ کلمے کہے۔ کعبہ کی اس تعمیر نو کے وقت رسول اللہ کی عمر پینتیس سال تھی اور اعلان نبوت میں ابھی پانچ سال باقی تھے۔

اس واقعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ پینتیس سال کی عمر تک رسول اللہ کے تعلقات قرشی اکابر سے خوشگوار تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں تعمیر کعبہ میں شرکت کا موقع نہ دیا جاتا، دوسری بات یہ کہ رسول اللہ نے اس وقت تک توحید اور مورتیوں کی مذمت کی تحریک شروع نہیں کی تھی یعنی تحریک کا منصوبہ ان کے دماغ سے عملی دنیا میں منتقل نہیں ہوا تھا کیونکہ



انہوں نے اپنی تحریک کی اگر خفیہ اشاعت بھی کی مہلت تو اکابر قریش کو اس کا ضرور علم ہو جاتا، وہ رسول اللہؐ سے منحرف ہو جاتے اور انہیں جبراً سود رکھنے کی خوشی خوشی اجازت نہ دیتے۔

## اعلانِ نبوت

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سن بلوغ کو پہنچتے پہنچتے رسول اللہؐ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نبی بنوں گا۔ سب سے پہلے ان کی والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ جب تم پیٹ میں تھے تو کسی نے خواب میں مجھ سے کہا: تمہارے پیٹ میں عرب قوم کا بادشاہ اور نبی ہے، پھر جب تمہاری ولادت ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم سے ایک روشنی نکلی جس سے بُھری (شام) کے محل جگمگانے لگی۔ اس کے بعد دادا عبدالطلب سے انہیں معلوم ہوا کہ مین کے ایک عالم نے ان کے گھر میں نبی پیدا ہونے کی بشارت دی تھی اور تصویر کی تھی کہ اس کی ماں خاندانِ زہرہ کی عورت ہوگی جیسا کہ ان کی ماں آمنہ تھیں، پھر بارہ سال کی عمر میں شام کے سفر کے دوران بُھری کے راہب ہجرانہ نے ان کا چہرہ اور پیٹ پر کبوتر کے انڈے کے بقدر اجمار دیکھ کر ان کے نبی ہونے کی پیش گوئی کی تھی، متعدد دوسرے ذرائع سے بھی رسول اللہؐ کو اس بات کی شہادتیں ملی تھیں کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہوں گے۔ اس یقین کے ماتحت انہوں نے اپنی سیرت کو اچھے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا، وہ ایسے کاموں سے بچنے لگے جو نبی کے شایانِ شان نہ تھے، وہ جھوٹ نہ بولتے، گالی نہ دیتے، بد اخلاقی سے پیش نہ آتے۔ وہ پیغمبرِ ابراہیم کی اولاد میں تھے جنہوں نے کعبہ کو توحیدِ خالص کا مرکز بنایا تھا، اس مناسبت سے رسول اللہؐ نے توحید ہی کو اپنا نصب العین بنالیا، انہوں نے سورتیوں کی تعظیم چھوڑ دی۔ سورتیوں پر چڑھائی ہوئی قربانی کھانا ترک کر دیا۔ بائیس تیس سال کی عمر میں خدیجہ کا کاسا مان بیچنے شام گئے تو وہاں کسی تاجر سے ان کا جھگڑا ہو گیا، تاجر نے کہا اگر تم لات اور عڑی کی قسم

کھا لو تو میں تمہاری بات مان لوں، رسول اللہؐ نے کہا: میں نے ان کی کبھی قسم نہیں کھائی ہے، میں ان کے سامنے سے گذرتا ہوں تو منہ پھیر لیتا ہوں۔

اعلان نبوت سے کافی عرصہ پہلے رسول اللہؐ خواب دیکھنے لگے تھے، خواب میں انہیں توحید خالص کی تلقین کی جاتی، کبھی موتیوں کی مذمت، کبھی توحید کی اشاعت کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ رسول اللہؐ کبھی توحیدی تحریک چلانے کے امکانات پر غور کرتے، کبھی اس بات پر کہ ان کا خاندان ان کا قبیلہ اور عرب قوم یہ دعوت قبول کر لے گی یا نہیں، مورتیوں کی تعظیم چھوڑ دے گی یا نہیں، کبھی اس بات پر غور کرتے کہ توحید کے تقاضے اور مطالبے کیا ہونے چاہئیں۔ جوں جوں توحید خالص پھیلانے کی لگن ان کے دل میں بڑھتی گئی ان کی کاروباری دلچسپیاں سمٹتی گئیں، وہ تنہائی پسند کرنے لگے اور ایک وقت ایسا آیا کہ مکہ کے باہر حراء پہاڑی کے غار میں معتکف ہو گئے، ان کے دادا عبدالمطلب بھی یہاں آکر رمضان کا مہینہ عبادت و ریاضت میں گزارا کرتے تھے۔ غار میں رسول اللہؐ کو آسمان کی طرف سے آوازیں سنائی دیتیں اور کبھی روشنی نظر آتی، ایک دن جبریل فرشتے نے آکر کہا کہ خدا نے میری معرفت پیغام بھیجا ہے، یہ کہہ کر اس نے اقرأ باسم ربك الذی خلق والی سورت پڑھی اور عالم یعلو تک رسول اللہؐ کی زبان سے ادا کرا کے واپس چلا گیا، کچھ عرصہ بعد یا ایہا المدثر والی سورت نازل ہوئی، پھر جلد جلد قرآنی آیتیں اترنے لگیں جن میں توحید، عبادت اور رسول اللہؐ کو نبی ماننے کی تلقین ہوتی تھی۔

نزول وحی کے بعد رسول اللہؐ نے اپنی نبوت کا اعلان کر دیا اور توحید خالص کی دعوت شروع کر دی لیکن یہ دعوت خفیہ تھی اور تقریباً تین سال تک دبی دبی چھپی چھپی رہی۔ دعوت کے اولین مخاطب لڑکے، جوان، غلام، بے سہارا، بے یار و مددگار اور نادار لوگ تھے۔

۱۳/۱ ابن سعد

۸۴/۱ انساب الاشراف



دعوت کے لئے ترکیبی تھی تھے۔ توحید خالص، نماز اور اقرارِ نبوت۔ رسول اللہ اور ان کے ساتھی فرداً فرداً ایسے لوگوں سے ملتے۔ سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں جن کے بارے میں انہیں حسن ظن ہوتا اور ان کے سامنے دعوت پیش کرتے، وہ مسلمان گھروں میں بھی جاتے اور وہاں دعوت کی تشریح اور قرآن کی تلاوت کرتے۔ بہت جلد رسول اللہ کے ہاشمی و مطلبی اقلب اور اکابر قریش کو دعوت کا علم ہو گیا۔ اقارب مسلمان نہیں ہوئے لیکن انہوں نے رسول اللہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کی اخلاقی تائید کرنے لگے۔ قرشی اکابر نے رسول اللہ کی دعوت کے دو جز، توحید اور نماز برداشت کر لیے کیونکہ یہ دونوں ان کے معتقدات کے منافی نہیں تھے، اس وقت تک صرف چاشت اور عصر کی نماز فرض ہوئی تھی، اکابر قریش رسول اللہ کو چاشت کی نماز بھی صحن کعبہ میں ادا کر لینے دیتے تھے لیکن وہ رسول اللہ کے نبوت کے دعوے کا مذاق اڑا کر اسے جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تجارتی نقل و حرکت کے دوران حجاز، یمن اور شام کے عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں سے رسول اللہ کی نبوت کے بارے میں تحقیق کی تو کسی نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ وہ نبی ہیں، نہ اس بات کی شہادت دی کہ ان کی آسمانی کتابوں میں آنے والے نبی کی وہ جہانی صفات بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ میں موجود تھیں۔ جب رسول اللہ کی دعوت بڑھ چکی تو اس نے رخ بدلا، رسول اللہ مورتیوں کو برا کہنے لگے کہ وہ پتھر کے ڈھانچے ہیں جن میں نائدہ یا نقصان پہنچانے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔ اکابر قریش کو مورتیوں کی مذمت شاق گذری، انہیں یہ بات اور زیادہ ناگوار ہوئی کہ رسول اللہ مورتیوں کی تعظیم کرنے والوں کو جن سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد مراد تھے، گمراہ، کور باطن، کافر اور اسی طرح کے توہین آمیز الفاظ سے یاد کرتے تھے اور سب کا ٹھکانا جہنم بتاتے تھے، ان اکابر کو اپنی دولت مندی، تجارتی کارگزاری، صلہ رحمی، داد و دہش اور رفاہی کاموں سے اپنے

خاندانوں اور قبیلے میں بڑی عزت حاصل تھی اور عزت کے احساس نے ان میں رعوت پیدا کر دی تھی، اپنے ایک رشتہ دار کی زبانی جو عمر میں بھی ان سے کم تھا اپنے لڑکوں، غلاموں اور ماتحتوں کے مدبر و اپنی عزت کو پامال ہوتا دیکھ کر اکابر قریش کا برشتعل ہو گئے اور رسول اللہؐ کی مخالفت پر کمر بستہ۔ فقیہ و محدث زہری: رسول اللہؐ نے اسلام کی خفیہ دعوت دی اور مورتیوں سے قطع تعلق کر لیا، ان کی دعوت نو عمروں اور بے سہارا لوگوں نے مانی، بعد میں ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھ گئی، اکابر قریش نے دعوت ناپسند نہیں کی۔ جب رسول اللہؐ ان کے اجتماع سے ہو کر گذرتے تو وہ طنزاً ان کی طرف اشارہ کر کے کہتے: وہ آیا عبد المطلب کا لڑکا جس سے خدا باتیں کرتا ہے۔ جب رسول اللہؐ نے ان کی مورتیوں کی مذمت شروع کی اور بتایا کہ اکابر قریش کے آباء و اجداد کفر و گمراہی کی حالت میں مرے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے تو اکابر قریش چڑھ گئے اور رسول اللہؐ کو ستانے اور ان کی مخالفت کرنے لگے۔ دعا رسول اللہؐ سر آو ہجر الا وثان فاستجاب له أحداث من الرجال و صنفاء من الناس حتی کثر من آمن به و کفار قریش من وجوہا غیر منکرین لما یقول و کان إذا امر علیہم فی مجالسہم لیشیرون إلیہ و لیقولون: غلام بنی عبد المطلب یکتم من السماء، فلم یزالوا کذلک حتی أظہر عیب آلہم و أخبر أن آباءہم ما توالوا علی کفر و ضلال و انہم فی النار فشنفوا و البغض و عادوہ و آذوہ۔

اکابر قریش نے ایک طرف اپنے لڑکوں، غلاموں اور زیر اثر اشخاص کو ڈانٹ ڈپٹ اور زد و کوب کر کے دل کا غبار نکالا اور انہیں رسول اللہؐ سے منہ موڑنے پر مجبور کیا، دوسری طرف البوطالب سے شکایت کی کہ اپنے بھتیجے کو ان کی مورتیوں کی مذمت، ان کے بزرگوں پر لعن طعن اور ان کے ماتحتوں، لڑکوں اور غلاموں کو اپنے مذہب کا پابند بنانے کی کوشش سے



باز رکھیں ورنہ وہ رسول اللہؐ کے خلاف تشدد آمیز کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ابوطالب نے دھیان سے اکابر کی شکایت سنی، ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور اطمینان دلایا کہ رسول اللہؐ کو سمجھا بجھا دیں گے۔ ابوطالب نے اکابر کی شکایت رسول اللہؐ تک پہنچا دی لیکن انہیں نہ طامت کی نہ ان پر دباؤ ڈالا کہ اپنی دعوت بند کرویں۔ ابوطالب نے یہ پیش گوئی سن رکھی تھی کہ رسول اللہؐ عربوں کے بادشاہ اور نبی بنیں گے، وہ اپنے بھتیجے کے اس متوقع عروج کو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ ابوطالب مژدہ تھے لیکن مصلحتاً رسمی طور پر مسلمان ہونا نہیں چاہتے تھے، انہیں معاشرہ میں عبدالمطلب کی طرح اقلیتی عزت حاصل تھی، وہ دو عظیم منصبوں۔ رفادہ اور سقایہ پر بھی فائز تھے، انہیں اندیشہ تھا کہ اگر اکابر قریش کو معلوم ہو گیا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی، ان کے غیر ہاشمی رشتہ دار اور دوسرے قرشی اکابر ان سے ترک موالات کر دیں گے، ان کی وجہاً نیز رفادہ و سقایہ کے عہدے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ رسمی طور پر مسلمان نہ ہونے کے باوجود ابوطالب مع اپنے لڑکوں اور بیشتر بھائیوں کے آخر وقت تک رسول اللہؐ کا ساتھ دیتے رہے۔

قرشی اکابر کی شکایت پر ابوطالب کے پڑھائیت رویہ سے حوصلہ پا کر رسول اللہؐ اپنی تحریک اور زیادہ جرأت سے چلانے لگے، ان کی تحریک میں گنہگار، بے سہارا، معاشرہ کے غیر مطمئن اور شاکی عناصر کے علاوہ قریش کے دوسرے اور تیسرے درجہ کے متعدد معزز و مالدار لوگ بھی داخل ہو گئے مثلاً ابوبکر صدیق، عثمان غنی، ابوعبیدہ بن جراح، عبدالمطلب کے لڑکے جعفر، عبیدہ بن حارث بن مطلب، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن عوف اور رسول اللہؐ کے ہم عصر مشہور موجد زید بن عمرو بن نفیل

کے لڑکے سعید، ان کے مسلمان ہونے سے ایک طرف رسول اللہ کی تحریک کی شان اور ساکھ بڑھی تو دوسری طرف قریشی اکابر کے اشتعال میں اضافہ بھی ہو گیا۔

تین سال درپردہ دعوت دینے کے بعد رسول اللہ نے محسوس کیا کہ مکہ کے باہر بسنے والے عربوں میں اسلام اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک قریش کے سارے خاندان ان کی دعوت نہ مان لیں۔ اس پاس کے اکثر عرب قبیلے قریش کے زیر اثر تھے اور قریشی اکابر کا اشارہ پائے بغیر ان کا اسلام قبول کرنا ناممکن نظر آتا تھا، اس لئے رسول اللہ اور ان کے ساتھی برملا دعوت دینے لگے، برملا دعوت کی ابتدا اس قرآنی آیت سے ہوئی۔ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔ محمدؐ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو برے انجام سے خبردار کر کے کہہ دو کہ اسلام لے آئیں۔ رسول اللہ نے اپنے ہاشمی و مطلبی اقارب کی دعوت کی، یہ چالیس پینتالیس مرد تھے کھانے کے بعد رسول اللہ کے چچا ابوہب نے جو ان کا سمدھی بھی تھا کہا: محمدؐ، تمہارے چچا اور چچا زاد بھائی موجود ہیں، کیا کہنا چاہتے ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا قبیلہ ساری عرب قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا، تمہاری موجودہ سرگرمیوں سے تمہارے خاندان والے ہی تمہیں روک سکتے ہیں، ان کے لئے یہ کام آسان ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ عربوں کی مدد سے قریشی خاندان تم پر حملہ آور ہوں تو اس سے عہدہ برآ ہو سکیں، تمہاری ذات سے جتنا نقصان تمہارے کنبہ کو پہنچا ہے کسی کی ذات سے آج تک نہیں پہنچا۔ رسول اللہ خاموش رہے، نہ کوئی جواب دیا نہ وہ بات کہی جس کے لئے دعوت کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر دعوت کی اور کھانے کے بعد کہا: میں آپ لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ میں نبی ہوں، مجھے خاص طور پر آپ کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مرنے کے بعد آپ پھر زندہ کئے جائیں گے، آپ کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا،



جنت بھی برحق ہے دوزخ بھی۔ ابوطالب نے کہا: ہم بڑی خوشی سے تمہارے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں، تمہاری خیر خواہی کے قصد ان ہیں اور جو کچھ تم کہتے ہو اسے صحیح سمجھتے ہیں، تمہارے چچا اور بھائی موجود ہیں، میں اگرچہ انہی میں سے ایک ہوں تاہم ان سب سے زیادہ تمہاری خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمہارا جوشن ہے اسے پورا کرنے میں لگے رہو، میں ہمیشہ تمہاری مدد کرتا رہوں گا اور ہر خطرہ سے تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ دوسرے عزیزوں نے بھی رسول اللہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور وقت ضرورت انہیں اپنی مدد کا اطمینان دلایا۔ ابولہب کے حسب سابق تیور بدلے ہوئے تھے، اس نے کہا: بھائیو، محمد کی دعوت بُری دعوت ہے، ان کا ہاتھ پکڑ لو قبل اس کے کہ وہ قوم ایسا کرے، اُس وقت اگر تم نے محمد کو عربوں کے حوالہ کر دیا تو یہ ذلت کی بات ہوگی اور اگر لڑائی میں ان کی مدد کی تو مارے جاؤ گے۔ ابوطالب بھائی کا یہ مشورہ سن کر جھلا گئے اور بولے: جب تک دم میں دم ہے ہم محمد کی پشت پناہی کرتے رہیں گے۔

اپنے چچاؤں اور بھائیوں کے اسلام نہ لانے سے رسول اللہ کو ملال ہوا لیکن انہوں نے کسی سے تعلقات نہیں بگاڑے، وہ جانتے تھے کہ ابولہب کے سوا ان کے سارے چچا اور بھائی خاندانی، تجارتی اور سماجی مصلحتوں کے پیش نظر کھلم کھلا اسلام قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں، ان کا خیال تھا کہ اگر قریش کے دوسرے خاندان اسلام لے آئیں تو ان کا ہاشمی و مطلبی کنبہ بھی اسلام قبول کر لے گا۔ کچھ دن بعد رسول اللہ مکہ کے باہر صفانا می پہاڑی پر گئے اور قریش کے سارے خاندانوں کو آواز دیکر بلایا، جب وہ آئے تو رسول اللہ نے کہا کہ میں نے آپ کو اس لئے جمع کیا ہے کہ آپ یہ اقرار کریں کہ لا اِلهَ اِلاَّ اللہ لا شریکَ لہ وَاَنتی رسول اللہ، اس اقرار کے صلہ میں آپ کو جنت دلوانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ مجمع میں ابولہب موجود تھا، اس نے قریش وئی سے کہا: تمہارا براہو، اس کام کے لئے تم نے ہمیں زحمت دی ہے! (تَبَالُکَ، اَلْهٰذَا دَعَوْتُنَا!) ابولہب

عبدالطلب کا لڑکا تھا، رسول اللہ کا سگ بچہ، نام عبدالعزیٰ تھا، دیکھتے ہوئے چہرہ کے باعث اسے ابولہب کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ کی دو لڑکیاں اس کے دو لڑکوں کو بیاہی تھیں، اس کے تعلقات رسول اللہ سے کشیدہ تھے، وہ نہ رسول اللہ کو نبی ماننے کے لئے تیار تھا، نہ مورتیوں کی تعظیم چھوڑنے کے لئے، اس کا خیال تھا کہ محمد اپنی نبوت کے دعوے اور مورتیوں کی مخالفت پر اڑے رہے تو ساری عرب قوم ان کی دشمن ہو جائے گی اور ان سے لڑے گی نیز یہ کہ اگر قریش نے رسول اللہ کا ساتھ دیا تو وہ بھی رسول اللہ کے ساتھ ہائیں گے اور ان کی خوشحالی، تجارت اور عظمت خاک میں مل جائے گی۔ ابولہب کی بہن صفیہؓ: بھیا کیا یہ بات مناسب ہے کہ تم اپنے بھتیجے کی مدد سے ہاتھ اٹھاؤ اور اسے دشمن کے حوالے کر دو؟ جاننے والے کہتے ہیں کہ عبدالطلب کی نسل میں ایک نبی ہوگا اور وہ تمہارا یہی بھتیجہ تو ہے۔ ابولہب: بالکل غلط، یہ محض ایک خوش فہمی ہے، مورتیوں کی پوجا توں سے زیادہ اس کی کوئی اصلیت نہیں، قریش کے سارے خاندان عربوں کے تعاون سے ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے تو ہمارے لئے ان سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

صفا کے مجمع میں ابولہب کی خفگی تَبَالُکْ، اَلْهَذَا دَعْوَتُنَا، رسول اللہ کو بہت ناگوار ہوئی، چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں وحی نازل ہو گئی۔ تَبَّتْ يَدَا اَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا اَغْنٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ، سَيَصْلٰ نَارًا اِذَا تَلَهَّبَ وَاَمْرَاَتُهُ سَمَّالَتَا الْحَطَبِ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ۔ تباہ ہوں ابولہب کے ہاتھ، اس کی دولت اور کمائی کچھ کام نہ آئے گی، پسین نکلتی ہوئی آگ میں جلے گا وہ اور اس کی ایندھن ڈھونڈنے والی بیوی جس کی گردن میں کھجور کے ریشوں کی رسی کا پھندا پڑا ہوگا۔ ابولہب اور اس کی بیوی ام جہیل اپنی بے عزتی سے سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے اپنے دونوں لڑکوں سے کہا کہ محمد



ہے ہماری ہجو کی ہے، تم ان کی لڑکیوں کو طلاق دے دو۔ لڑکے حکم بجالائے۔

ابوطالب، اُن کے بھائیوں اور بھتیجیوں کی طرف سے تعاون، مدد اور حمایت کی ضمانت پاکر رسول اللہؐ نے اپنی دعوت اور زیادہ وسیع، منظم اور تیز کر دی، وہ اور ان کے ساتھی بالخصوص معزز قرشی مسلمان جیسے ابوبکر صدیق، عثمان غنی، حمزہ بن عبدالمطلب، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ اور ابوعبیدہ بن جراح چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر محلوں، بازاروں، مجمعوں اور گھروں میں جاتے، دعوت دیتے، قرآن سناتے، مورتیوں اور ان کی تعظیم کرنے والوں پر لعن طعن کرتے، انہیں کافر کہتے، ان کا ٹھکانا جہنم بتاتے اور مسلمانوں کو جنت کی بشارت دیتے۔ خفیہ دعوت کے زمانہ میں رسول اللہؐ کو اکابر قریش کی طرف سے صحن کعبہ میں صرف صبح کی نماز پڑھنے کی اجازت تھی لیکن اب وہ اور ان کے ساتھی اکابر کی نظروں کے سامنے عصر کی نماز بھی پڑھنے لگے، باواز بلند قرآن کی تلاوت کرتے، کلمہ کھلا دعوت دیتے جس کے اجزاء تھے۔ توحید، مورتیوں سے بیزاری، دو وقتی نماز اور اقرار نبوت۔ دعوت کے وسیع، منظم اور تیز ہونے، نیز معزز مسلمان قرشیوں کے اثر، ترغیب اور دباؤ سے قریش کے اچھے گھرانوں کی ایک جماعت مسلمان ہو گئی اور وہ بے سہارا لوگ۔ غلام، کنیزی، موالی اور حلیف جو خفیہ دعوت کے زمانہ میں مسلمان ہونے کے بعد اکابر کی ڈانٹ ڈپٹ، زد و کوب اور مختلف قسم کی معاشی و مالی دھمکیوں سے اسلام چھوڑ گئے تھے یا اسلام چھپانے، رسول اللہؐ کی مذمت اور مورتیوں کی تعظیم کے بول زبان سے ادا کرنے پر مجبور کئے گئے تھے، اسلام لے آئے، بے سہارا لوگوں کو رسول اللہؐ اور خوشحال قرشی مسلمانوں نے مالی سہارا دیا، غلاموں اور کنیزوں کو ان کے آقاؤں سے خرید کر آزاد کر دیا اور موالی کی اخلاقی و مادی مدد کی۔ ان سب باتوں سے قریشی اکابر کا اشتعال بڑھ گیا۔ ان کا ایک وفد ابوطالب سے ملا اور ان سے شکایت کی کہ محمدؐ ہمارے لڑکوں، غلاموں، موالی اور حلیفوں کو بہلا پھسلا کر گمراہ کرتے ہیں، ہماری مورتیوں کو برا کہتے ہیں، ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو احق، کور باطن، گمراہ اور کافر کہہ کر توہین کرتے ہیں، انہیں روکے ورنہ ہم ان کے

خلاف سخت کارروائی کریں گے۔ شکایت کے وقت رسول اللہؐ موجود تھے، انہوں نے کہا کہ میرا مقصد توحید کی اشاعت ہے، میں چاہتا ہوں کہ مورتیوں کا سہارا چھوڑ کر صرف خدا کی طرف رجوع کیا جائے اور مجھے خدا کا رسول مانا جائے، اگر آپ لوگ یہ دو باتیں مان لیں تو میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو شکایت پیدا ہو بلکہ میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ آپ آخرت میں جنت کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے اور دنیا میں عرب و غیر عرب اقوام پر آپ کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ اکابر اس سودے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور منہ پھلائے چلے گئے۔ انہوں نے اپنے محلوں کے مسلمانوں پر مختلف قسم کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ عزیزوں کو دھمکی دیتے کہ اگر انہوں نے اسلام ترک نہیں کیا تو ان سے قطع تعلق کر لیا جائے گا، اگر وہ تاجر ہوتے تو ان سے خرید و فروخت اور ہر طرح کا لین دین بند کرنے کی دھمکی دیتے، اگر ہم محلہ ہوتے تو انہیں غیرت دلاتے کہ شریف آدمی ہو کر اپنے خاندان کو بنام کرتے ہو، اپنے آباء و اجداد کو کافر کہتے ہو اور ان کے دوزخی ہونے کا اقرار کرتے ہو۔ علیفوں کو دھمکی دیتے کہ ہم تمہارا حلف منسوخ کر دیں گے اور تم معاشرہ میں بے یار و مددگار ہو کر رہ جاؤ گے۔ یہ دھمکیاں جلد حقیقت بن گئیں اور ان کی گرفت بعض مسلمانوں پر اتنی سخت ہوئی کہ وہ گھبرا گئے۔ طے ہوا کہ حالات سازگار ہونے تک یہ لوگ جیشہ چلے جائیں جہاں ایک شریف، نیک طینت عیسائی بادشاہ حکمراں تھا اور جہاں کے تاجروں سے ان میں سے بعض کے اچھے تعلقات تھے۔ قرار داد کے مطابق گیارہ مردوں اور چار عورتوں کی ایک جماعت جیشہ چلی گئی اور وہاں آرام سے دو ماہ گزارے، یہ اعلان نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے

۱۔ انساب الاشراف ۱/ ۱۹۸

۲۔ طبری (تاریخ مصر) ۲/ ۲۳۱

۳۔ ابن سعد ۱/ ۲۰۴



اور حبشہ کی پہلی ہجرت کہلاتا ہے۔ اس ٹولی کے ممتاز اشخاص یہ تھے: عثمان غنی اور ان کی بیوی رقیہ، زبیر بن عوام، مصعب بن زبیر بن ہاشم، عبدالرحمن بن حوف، عبداللہ بن مسعود۔ قریش کی دباؤ ڈال کر ستانے کی مہم جاری رہی اور رسول اللہ کی تحریک آزمائشوں اور مشکلات کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اپنے اپنے ماتحتوں، رشتہ داروں، حلیفوں اور دست نگر مسلمانوں پر دباؤ ڈال کر دل کا غبار نکالنے میں اکابر ایسے مصروف ہوئے کہ ان کی توجہ رسول اللہ کی طرف کم ہو گئی۔ ایک دن صحن کعبہ میں رسول اللہ تنہا بیٹھے تھے۔ ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی۔ کاش کوئی ایسی وحی نہ آجائے کہ اکابر قریش مجھ سے اور زیادہ بھرپور اند محض ہوں۔ لیتہ لا ینزل علی شیء ینفردہ عنی۔ رسول اللہ ان کی تالیف قلب کرنے لگے، جواب میں اکابر قریش بھی نرم پڑ گئے اور رسول اللہ کے ساتھ معالجہ روانہ ہو کر لیا۔ ایک دن رسول اللہ نے جبکہ صحن کعبہ میں اکابر موجود تھے سورہ نجم کی تلاوت کی۔ وَالْجُمُودُ إِذَا هَوَىٰ — أَفْزَأَتْهُمُ اللَّاتُ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ، تِلْكَ غُرَانِيقُ الْعُلَىٰ وَإِنْ شَفَاعَتُهُمْ لَتَرْجَبَىٰ۔ کیا تم نے لات، عزیٰ اور تیسری مورتی مناتہ کے متعلق غور کیا ہے؟ یہ بلند پایہ مستیاں ہیں جن سے لوگوں کو توقع ہوتی ہے کہ وہ خدا سے ان کی سفارش کریں گی۔ اس کے بعد رسول اللہ نے سورت کا باقی حصہ تلاوت کر کے سجدہ کیا، سجدہ میں اکابر قریش بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تِلْكَ غُرَانِيقُ الْعُلَىٰ والی آیت کا ان پر اچھا اثر ہوا، انہوں نے کہا: محم، ہم جانتے ہیں کہ اللہ ہی جلاتا ہے، اللہ ہی مارتا ہے، اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی رزق دیتا ہے لیکن ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ مورتیاں خدا سے ہماری سفارش کرتی ہیں، اب چونکہ تم نے خدا کے دربار میں انہیں با اثر مان لیا ہے، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ رسول اللہ کو ان کی یہ بات کھٹکی، وہ گھر چلے گئے، انہوں نے محسوس کیا کہ

تلك غرائق العلى والى آيت انھیں القا نہیں ہوئی تھی، جلد ہی وحی کے ذریعہ اس آیت کی تردید ہو گئی اور مورتیوں کے بارے میں رسول اللہ کا توقف وہی رہا جو پہلے تھا۔ اکابر قریش کو تردید پر طیش آیا اور پہلے کی طرح وہ پھر رسول اللہ سے بگڑ گئے۔

(باقی)

## اہل علم کے لئے پانچ نادر تحفے

- ۱۔ تفسیر روح المعانی: جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ قیمت مصر وغیرہ کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے۔ آج ہی مبلغ دس سو روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائے۔ اب تک ۲ جلد طبع ہو چکے ہیں باقی دس جلد عنقریب طبع ہو جائیں گی۔
  - ۲۔ تفسیر جلالین شریف مصری: مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) باب النقول فی اسباب النزول للسیوطی (۲) معرفت الناسخ والمنسوخ لابن حجر قیمت مجلد ۲۵/-
  - ۳۔ شرح ابن عقیل: الفیہ بن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے۔ قیمت مجلد ۲۵/-
  - ۴۔ شیخ زادہ: حاشیہ بیضاوی سورہ بقرہ مکمل قیمت ۸۰/-
  - ۵۔ فتح الباری: جو قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ خدا کے فضل سے دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں
- ملنے کا پتہ:

ادارہ مصطفائیہ دیوبند (یو۔ پی)



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تقسیم کے بعد

(۱۲)

از سعید احمد اکبر آبادی

البتہ ڈاکٹر صاحب میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ جس کے وہ دوست ہوتے اور جس پر ان کی نظرِ لطف و کرم ہوتی اسے وہ خوب نوازتے تھے اور یہ امداد کا جذبہ ان میں اتنا شدید تھا کہ اگر اس شخص سے ذاتی طور پر ان کو کبھی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اسے بھی نظر انداز کر دیتے تھے، ظاہر ہے دوست نوازی کا یہ جذبہ ذاتی اور شخصی معاملات میں نہایت محمود اور عالی حوصلگی و بلند نگاہی کی دلیل ہے لیکن جب اس کا ظہور قومی اور ملی امور میں ہو تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور اس سے قومی و ملی مفاد کا نقصان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی (اکتوبر ۱۹۵۶ء کو کرنل بشیر حسین زیدی) میں) والٹس چانسلر مقرر ہوئے، موصوف جانشین منظر نگار کے

خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں، نہایت شریف، بامروت اور و منہ دار انسان ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی ہائی اسکول کے پڑا سٹر اور اس کے بعد ریاست رامپور میں وزیر اعظم رہے ہیں۔ ریاست کے آخری دور میں انتظامی، تعلیمی

اور معاشی اصلاحات اور ترقیاں جو کچھ بھی ہوئیں وہ موصوف کے ہی حسن تدبیر اور حسن انتظام کا نتیجہ تھیں، پھر عادات و خصائل اور طور طریق زندگی کے اعتبار سے بھی ان کی مشرقیت صاف ظاہر اور نمایاں تھی، اگرچہ ان کا شش سالہ عہد وائس چانسلری بیرونی اور اندرونی غفلت کے اعتبار سے یونیورسٹی کا ایک پر آشوب اور صبر آزما دور تھا، لیکن وہ جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ اپنی کشتی اس منجد حار میں سے صحیح سلامت نکال کر لے گئے وہ ان کی بیدار مغزی، اخلاص اور عزم و ہمت کی دلیل ہے۔

قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ راقم الحروف ایک معذرت کا علی گڑھ سے تعلق زیدی صاحب کے عہد میں ہی ہوا تھا اس بنا پر اب یہاں سے لے کر آخر تک جو کچھ لکھا جائے گا وہ راقم الحروف کے ذاتی مشاہدات و تجربات اور احسا و تاثرات کے ماتحت اور ان کی روشنی میں ہوگا۔ اس لئے دو باتوں کی معذرت کر دینا ضروری ہے، ایک اس بات کی کہ آئندہ میں صیغہ واحد متکلم استعمال کروں گا اور ایسے موقع پر ممکن ہے بعض جملوں اور فقروں سے خود ستائی کا پہلو پیدا ہو تو قارئین مجھے معاف فرمائیں اور یقین رکھیں کہ ان کا مقصد اپنی بالا خوانی ہرگز نہیں ہے، بلکہ محض بیان واقعہ ہے جس کی تصدیق علی گڑھ کا ہر واقف حال کر سکتا ہے، واللہ علی ما اقول شہید، اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے میرے بعض فقروں سے کسی کو کوئی ناگواری ہو تو ان کو بھی باور کرنا چاہیے کہ ان کا مقصد ہرگز شخصی طور کسی کی آزر دہ دلی نہیں ہے، برہان کا پورا فائل اس کا گواہ ہے کہ میرا قلم ہمیشہ اس سے بڑی سختی کے ساتھ مجتنب اور محترز رہا ہے، بلکہ اس کا مقصد بھی اظہار واقعات ہی ہے جس کو موجودہ حالات میں یونیورسٹی کی اصل حیثیت اور پوزیشن واضح کرنے کے لئے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

بھائی مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع سے علی گڑھ میں میرے بلانے کی تحریک بلکہ علی گڑھ لانے کے خواہاں اور اس کی فکر میں تھے، چنانچہ



مبین عبدالعزیز صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہاں عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو انہوں نے مجھ کو اس کے بارہ میں لکھا، میں نے جواب دیا کہ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھ کو کلکتہ بھیجا ہے اور میں یہاں صرف ان کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں اس لئے جب تک مولانا خود بطیب خاطر اجازت نہیں دیں گے میں کلکتہ چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ اس خط کے چند ہی دن کے بعد مولانا حفظ الرحمن صاحب کا جواب آیا کہ میں نے مولانا ابوالکلام سے گفتگو کر لی ہے وہ فرماتے ہیں کہ سعید کے کلکتہ بھیجنے سے میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا ہے، یعنی کلکتہ مدرسہ تقسیم کے وقت بالکل ختم ہو گیا تھا اب پھر وہ دوبارہ قائم ہو گیا ہے اور اپنی گزشتہ شان و شوکت کے ساتھ چل رہا ہے، اس لیے سعید اب اگر کہیں اور جانا چاہے تو جاسکتا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اب مدرسہ عالیہ کلکتہ اس پوزیشن میں ہے کہ کوئی بھی اس کا پرنسپل ہوا سے سنبھال سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد مجھے کوئی عذر نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن مجھ کو علی گڑھ کی سیاست اور وہاں کے حالات کا جو علم تھا اس کی بنا پر میں نے بھائی مرحوم کو پھر لکھا کہ ڈاکٹر زاہر حسین صاحب ڈاکٹر عبدالعلیم کو عربی کا پروفیسر بنانے کی ٹھانے ہوئے ہیں اس لئے کوئی اور شخص اس جگہ پر آہی نہیں سکتا، بہتر یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں اور میرا کسی سے تذکرہ بھی نہ کریں، لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اس زمانہ میں وہ کورٹ کے بھی ممبر تھے اور ان کے کونسل کے بھی، آخر انہوں نے ایک دن ڈاکٹر زاہر حسین صاحب سے میرے متعلق کہہ ہی دیا، ڈاکٹر صاحب کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے تھوڑی تھیں جو مولانا کی باتوں میں آ جاتے، فوراً بولے: مولانا! اس میں شبہ نہیں کہ اکبر آبادی اس جگہ کے بہرہ و جوہ مستحق ہیں لیکن مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی تو علی گڑھ کی طرح ہمارا ایک وسیع اور نامور قومی و ملی ادارہ ہے، ہمیں اس کا مفاد بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، یہاں عربی کی پروفیسر شپ کے لئے تو کچھ دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں لیکن کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے لئے اکبر آبادی جیسا کوئی دوسرا پرنسپل نہیں مل سکتا،

اس لئے قومی مفاد کے پیش نظر میری قطعی اور آخری رائے ہے کہ اکبر آبادی کو کلکتہ سے نہ ہٹایا جائے، مولانا ڈاکٹر صاحب کے تیور پہچان گئے اور چپ ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

عجیب بات ہے، ایک وقت تھا جب مولانا حفظ الرحمن صاحب نے علی گڑھ میں محکوم لانے کی تحریک کی اور ناکام رہے اور جب کرنل بشیر حسین زیدی والس چانسٹر ہوئے تو اب انہوں نے خود مولانا حفظ الرحمن صاحب سے درخواست کی کہ وہ محکوم علی گڑھ آنے پر آمادہ کر دیں، زیدی صاحب نے علی گڑھ آتے ہی یونیورسٹی میں اصلاحات کرنے اور اس کو ترقی دینے کا جو وسیع پروگرام بنایا تھا اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی (جو اس وقت کس پرسی کے عالم میں تھی) کو بھی آگے بڑھانے کا پروگرام شامل تھا، اس فیکلٹی کے ماتحت دو شعبے ہیں ایک شعبہ سنی دینیات اور دوسرا شعبہ شیعہ دینیات، اول الذکر کی صدارت کے لئے زیدی صاحب نے میرا انتخاب کیا اور موخر الذکر کی صدارت کے لئے مولانا سید علی نقی النقی کا جو اپنے علم و فضل اور علمی وجاہت کے باعث ایران اور عراق کے علماء میں بھی معروف و مشہور تھے، زیدی صاحب ایک عملی آدمی ہیں۔ جب وہ ایک کام کا ارادہ کرتے ہیں تو دیر نہیں کہتے اور لگ لپٹ کر اسے جلد سے جلد کر گزرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا حفظ الرحمن صاحب سے جب میرے متعلق بات چیت کی اور مولانا نے اس سلسلہ میں ان کی امداد کا وعدہ کر لیا تو انہوں نے مولانا سے کہا کہ خط و کتابت سے کام نہیں چلے گا۔ آپ خود کلکتہ جائیے اور پختہ وعدہ لے کر آئیے، چنانچہ مولانا حفظ الرحمن صاحب کلکتہ آئے اور گفتگو کی، گفتگو میں مولانا نے یہ بھی کہا کہ سنی دینیات کی صدارت کے ساتھ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ڈائریکٹر شپ بھی تم کو دینے کا ارادہ ہے، اس کے متعلق میں نے صاف لفظوں میں کہا انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبد العظیم ہیں اس لئے میں ہرگز اس کو پسند نہیں کروں گا کہ ان کا یہ عہدہ ان سے چھین کر محکوم دیا جائے البتہ ڈاکٹر عبد العظیم خود اپنی خواہش سے کسی سبب سے مستعفی ہو جائیں تو محکوم



اس کی ذمہ داری قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا، اس لئے اب مجھ کو کچھ غور کرنا ہے وہ صرف شعبہ دینیات کے معاملہ پر غور کرنا ہے اور اس کا جواب میں کچھ دنوں کے بعد دوں گا۔

مولانا واپس چلے گئے۔ میں نے یہاں غور کیا تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں کلکتہ میں ایک سرکاری ادارہ کا پرنسپل تھا اور اس حیثیت سے میں وہاں فرسٹ کلاس گورنمنٹ گزٹیڈ آفیسر تھا اور میری تنخواہ اس وقت وہی تھی جو آج کل علی گڑھ میں پروفیسر کی ہوتی ہے، پھر ایک نہایت شاندار کوٹھی مفت بغیر کرایہ کے سرکار کی طرف سے ملی ہوئی تھی، اور اس کے مقابلہ میں علی گڑھ میں جو پوسٹ تھی وہ صرف ریڈر کی تھی، پروفیسر کی پوسٹ ابھی تک دینیات کے لئے منظور نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود محض علی گڑھ یونیورسٹی کی عموماً اور اس کے شعبہ دینیات کی خصوصاً خدمت کے جذبہ سے میں نے علی گڑھ جانے کا ارادہ کر لیا اور بھائی حفظ الرحمن صاحب کو اس کی اطلاع دے دی، لیکن جب بنگال گورنمنٹ کو اس کا علم ہوا تو چیف منسٹر ڈاکٹر بی۔ سی رائے نے شخص طور پر اس میں مداخلت کی اور مجھ کو بلا کر گفتگو کی، یہ گفتگو کئی روز تک چلتی رہی، اتفاق سے انھیں دنوں میں پروفیسر آل احمد سرور میرے ہاں مقیم تھے، جو کچھ ڈاکٹر بی۔ سی رائے سے گفتگو ہوتی تھی میں شام کو گھر آ کر پروفیسر سرور صاحب

سہ میری اس قدر صاف اور صریح گفتگو کے بعد بھی سخت انوس ہے کہ جب میں علی گڑھ پہنچا تو ایک ملکہ میں میری نسبت پروپینڈا بھی کیا گیا کہ میں انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر بننے کی خواہش میں آیا ہوں، مالانکہ زیدی صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جو اس زمانہ میں پرووائس چانسلر تھے یا میرے دوست احباب گواہی دے سکتے ہیں کہ میں نے کسی کے سامنے اس قسم کی خواہش کا کبھی بھولے سے بھی تذکرہ کیا ہو! اس کے لئے درخواست کرنا یا پروپینڈہ کرنا تو بہت بڑی بات ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں میری فطرت اور طبیعت سے بہت بعید ہیں۔

سے اسے نقل کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ میں کلکتہ نہ چھوڑوں۔ میں کلکتہ چھوڑنے کا جو سبب بیان کرتا تھا ڈاکٹر صاحب فوراً اس کا توڑ کر دیتے تھے، آخر جب میرے سب سے بڑے بیکار ہو گئے تو میں نے کہا: ”میں زیدی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور اب وعدہ خلائی کرتے ہوئے شرم آتی ہے اس لئے آپ اگر زیدی صاحب کو خط لکھ کر بجوان سے مانگ لیں اور وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو میری شرم رہ جائے گی اور میں کلکتہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ”میں زیدی صاحب کو جانتا ضرور ہوں، لیکن معاملہ ایسا ہے کہ میں ان کو نہیں لکھ سکتا۔“ بات اس پر ختم ہو گئی اور میں وہاں سے سبکدوش ہو کر ۵۹ء میں علی گڑھ چلا آیا۔

یہاں علی گڑھ میں زیدی صاحب نے میرے ساتھ لطف و کرم اور تعظیم و تکریم کا جو خصوصی معاملہ کیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں دینیات کی کتنی اہمیت اور اس کو ترقی دینے کا کیسا جذبہ اور ولولہ تھا، میرے سب دوست احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لین دین کے معاملہ میں کبھی میری زبان کھلتی ہی نہیں ہے، چنانچہ یہاں بھی میں نے تنخواہ وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا اور نہ اس پر گفتگو کی، لیکن زیدی صاحب نے از خود میرے متعلق اکڑ کٹو کونسل سے تین باتیں ایسی منظور کرائیں جو غالباً پوری یونیورسٹی میں کسی کے لئے بھی نہیں ہوں گی۔ حالانکہ مولانا سید علی نقی النقیوی صاحب شیعوں میں مجتہد اعظم

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو میرے علی گڑھ جانے کی خبر ہوئی تو ازاں شفقت و محبت پٹنے سے مجھے خط لکھا اور اس میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے متعلق اظہار تشویش کرنے کے بعد اپنی سوت کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد یہ شعر تحریر کیا:

آگ ہمارے دودھ بھار پہ سبزہ غالب  
ہم بیاباں میں ہیں ادھر میں بہار آئی ہے



کامرتہ رکھتے ہیں اور زیدی صاحب (جو خود بھی شیعہ ہیں) مولانا کے معتقدوں میں سے ہیں ،  
لیکن ان تین خصوصیات سے وہ بھی محروم تھے ، اور وہ یہ ہیں :  
(۱) بھکوریڈر کی پوسٹ کی انتہائی تنخواہ دی گئی ۔

(۲) میرے لئے آزمائشی ایک سال کی مدت (PROBATION) اڑادی گئی اور پہلے ہی  
دن میں مستقل ہو گیا۔

(۳) ایک بڑی وسیع اور کشادہ کوٹھی بھکوریڈر کے لئے مفت بغیر کرایہ کے دی گئی اور چونکہ  
میں سینئر تھا اس لئے صدر شعبہ سنی دینیات ہونے کے علاوہ فیکلٹی کا ڈین بھی میں ہی مقرر کیا گیا  
اور اس طرح سنی دینیات کے علاوہ شیعہ دینیات کا شعبہ بھی میری نگرانی اور انتظام میں  
آگیا۔ زیدی صاحب کے زمانہ میں اس فیکلٹی نے کیا ترقی کی اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔  
میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں تو اس وقت یہاں اساتذہ میں دو گروہ تھے اور دونوں  
ایک دوسرے سے برسرِ پیکار۔ ایک گروہ اسلام پسند کہلاتا تھا اور دوسرا کونسلٹ یا ترقی پسند  
پہلے گروہ میں دو قسم کے لوگ شامل تھے ایک وہ جو واقعی عملاً بھی مسلمان تھے اور دوسرے وہ  
جن کو عملاً اسلام سے تعلق محض برائے نام ہی تھا۔ عید بقرعید کے سوا مسجد میں ان کی صورت نظر  
نہیں آتی تھی، یہی حال دوسرے طبقہ کا تھا، اس میں چند لوگ تو وہ تھے جو واقعی کونسلٹ  
تھے اور غالباً اس پارٹی کے باقاعدہ ممبر بھی تھے، ان کے علاوہ چند ایسے افراد بھی اس گروہ  
میں شامل تھے جو کونسلٹ برائے بیت ہی تھے۔ ان دونوں گروہوں کی کشمکش کا اثر یونیورسٹی  
کے نظم و نسق پر اس طرح پڑتا تھا کہ کسی پوسٹ (خواہ تعلیمی ہو یا انتظامی) پر تقرر کا جب  
معاملہ پیش آتا تھا تو ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ڈھب کا آدمی ہو۔ اس  
زمانہ میں بعض تقررات ایسے ہو گئے جن پر دونوں گروہوں میں سخت کشمکش اور کشیدگی  
برپا تھی اور یہ تقرر گویا اسلام اور کفر کی جنگ کا باعث ہو گئے تھے، میری افتاد طبع شروع  
سے یہ رہی ہے کہ کالج یا دفتر اور وہاں سے سیدھا گھر! دو ایک نہایت عزیز اور ملی مذاق کے

دوست کبھی کبھار ان کے مکان پر چلا گیا تو چلا گیا اور نہ کبھی کسی کے مکان پر بغرض ملاقات نہیں جاتا۔ پارٹی بازی اور گروہ بندی سے ہمیشہ دور رہا ہوں اور اسی وجہ سے کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا کبھی ممبر تک نہیں ہوا۔ اس بنا پر مذکورہ بالا دو طبقوں میں سے میرا تعلق کسی ایک طبقہ سے بھی نہیں تھا۔ اکاؤنٹ کنسل وغیرہ میں جب کوئی معاملہ آتا تھا تو جوابات میرے نزدیک خدا لگتی اور ایمانداری کی ہوتی تھی وہ کہتا تھا۔ اسلام پسند طبقہ میں مشہور تھا کہ ترقی پسند طبقہ کو زیدی صاحب کی سرپرستی حاصل ہے، لیکن درحقیقت یہ ان پر بالکل غلط الزام تھا، وہ جو فیصلہ کرتے تھے ایمانداری اور جرأت سے کرتے تھے، اس میں نہ گروہ بندی کا شائبہ ہوتا تھا اور نہ حکومت کے ساتھ تعلق اور چالپوسی کا، چنانچہ میرے سامنے کی بات ہے شعبہ معاشیات میں لکچر کی پوسٹ پر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کے تقرر کے سلسلہ میں سلکشن کمیٹی کی سفارشات اکڑ گئیں کنسل میں پیش ہوئیں تو ایک نہایت نامور اور مشہور غیر مسلم ممبر کنسل نے زیدی صاحب کو خطاب کر کے کہا: ”جناب وائس چانسلر صاحب! ان صاحب کے متعلق آپ نے تحقیق بھی کر لی ہے، یہ جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن اور عہدہ دار ہیں۔“ زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا: ”جی ہاں! میرے علم میں ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے عہدہ دار ہیں، لیکن اپنے مضمون میں قابل بھی ایسے ہیں کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی کے جو پروفیسر معاشیات آئے تھے انھوں نے نجات اللہ صدیقی کے انتخاب پر محکوم مبارک باد پیش کی تھی۔“ اس کے بعد زیدی صاحب ان صاحب کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوئے اور بولے: ”مجھے معلوم ہے کہ گورنمنٹ جماعت اسلامی کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن گورنمنٹ کا کوئی آرڈر یا سرکلر اس بارہ میں بالکل نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کے ممبر کو ملازمت میں نہ لیا جائے اس بنا پر محض جماعت کا ممبر ہونے کے باعث ایک لائق اور قابل شخص کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھانا یونیورسٹی کے ساتھ خیر خواہی نہیں بدخواہی ہے اور یہ بدخواہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس زمانہ میں اکڑ گئے کنسل میں اسلام پسند طبقہ کے نمائندہ ایڈیٹر جناب ایم۔ اے خواجہ تھے،



انہوں نے زیدی صاحب کا یہ جرات مندانہ جواب سنا تو خوشی میں سامنے کی میز کو زور سے تھوپ تھوپ کر اس کی داد دی اور اس کے بالمقابل جو صاحب ترقی پسند طبقہ کے نمائندہ تھے، میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ ایک واقعہ میں نے بہ طور مثال لکھا ہے ورنہ مجھے اور بھی متعدد واقعات یاد ہیں جن میں زیدی صاحب نے اکاڈمک کونسل یا اکزکٹو کونسل میں ایسے ہی جرات مندانہ اقدامات کئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے مفاد کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے۔

زیدی صاحب گھر کے رئیس اور نواب تھے اور ایک ریاست کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، اس بنا پر طبیعت میں فیاضی، سیرجشی اور عالی ہمتی تھی۔ ان اوصاف و کمالات کے باعث وہ اساتذہ اور طلباء دونوں میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے کہ ۶۳ء میں یونیورسٹی کے بعض طلباء میں مارپیٹ کے باعث جب شہر میں بہت سنگین ہندو مسلم فساد ہوا ہے اور ہندو نوجوانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے شمشاد مارکیٹ میں آکر لوٹ مار کی اور آگ لگائی تو ایس۔ ایس ہال کے تمام طلباء غصہ میں پھرے ہوئے سب ایک جگہ جمع ہو گئے اور شمشاد مارکیٹ کی طرف بڑھنے لگے تو زیدی صاحب فوراً موقع پر پہنچ گئے اور بڑی ہمت کے ساتھ ان لڑکوں کا راستہ دونوں ہاتھ پھیلا کر روک کر کھڑے ہو گئے، میں اس وقت زیدی صاحب کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا، زیدی صاحب نے ایس۔ ایس ہال کے تمام دروازے مقفل کرادیئے تھے، شمالی دروازہ پر طلباء کا ہجوم تھا، وہ انتقام انتقام اور الشداکبر کے نعرے لگا رہے تھے اور زیدی صاحب ان سب کو روکے ہوئے کہہ رہے تھے کہ میں آپ لوگوں کو ہرگز نہیں جانے دوں گا، آپ لوگ اطمینان رکھیں میں نے پولیس کی ایک بھاری جمیعت کو بلوا کر غنڈوں اور بد معاشوں کو شمشاد مارکیٹ سے بھگولویا ہے اور اب وہاں امن و امان ہے، ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں خبر آئی کہ غنڈوں نے زنانہ کالج میں لڑکیوں کے ہوسٹل پر حملہ کر دیا ہے، یہ سنتے ہی لڑکے آپس سے

باہر ہو گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے: لعنت ہے ہمارے اوپر، اگر ہم اپنی بہنوں کی حفاظت نہ کریں اور غنڈوں سے انتقام نہ لیں۔ زیدی صاحب نے ہر چند کہا اور سمجھایا کہ یہ خبر غلط اور بے بنیاد ہے، مگر لڑکے ماننے والے کہاں تھے، آخر زیدی صاحب نے کہا کہ اچھا چلو! میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں تم کو اجازت دیدوں گا کہ غنڈوں کو ایسا سبق دو جو عمر بھر ان کو یاد رہے، چنانچہ زیدی صاحب آگے آگے اور سینکڑوں طلباء ان کے پیچھے، زنانہ کالج پہنچے تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ خبر غلط اور بے بنیاد تھی، لڑکوں کو اب اطمینان ہو گیا اور زیدی صاحب نے ان سب کو پیرامن طریقہ پر واپس بلا کر انھیں ان کے ہوسٹلوں میں بند کر دیا، یہ تمام واقعات میری نظر سے گزرے ہیں اور میرے دل پر زیدی صاحب کی پھرتی ہستعدی، بیدار مغزی اور ہمت و جرأت کا بڑا اثر ہے، اڈمنسٹریشن ہو تو ایسا ہو، میرے خیال میں بدرالدین طیب جی کو مستثنیٰ کر کے کسی اور والس چانسز کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مشعل طلباء کے اس سیل رواں کے سامنے دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑا ہوتا اور حسن تدبیر سے اس طرح ان کو قابو میں لے آتا۔

زیدی صاحب کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی بڑا لحاظ اور پاس تھا، یونیورسٹی کے ہر فنکشن کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا تھا، مغرب کی نماز کے وقت میٹنگ ملتوی ہو جاتی تھی، رمضان کے شروع میں رجسٹرار آفس سے باقاعدہ ہدایت نکلتی تھی کہ اس ماہ مقدس میں دن کے وقت مبلغ بند رہیں گے اور یونیورسٹی میں کہیں پنچ یا ٹی پارٹی نہیں ہوگی، خود بھی روزہ رکھتے تھے اور ایک روز اپنے ہاں بڑی شاندار افطار پارٹی کرتے تھے جس میں اساتذہ اہل انتظامیہ کے حضرات کثرت سے مدعو ہوتے تھے، اسی قسم کی ایک پارٹی کا لطیفہ ہے کہ ایک بہت طویل میز پر انواع و اقسام کے پھل اور مخصوص قسم کی افطاریاں چنی ہوئی تھیں اور سب حضرات میز کے دونوں طرف کھڑے افطار کے وقت کا انتظار کر رہے تھے، میں زیدی صاحب کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مولانا سید علی نقی النقیوی صاحب ہم دونوں کے سامنے میز کی دوسری جانب



کھڑے تھے، اتنے میں مسجد کا سائرن بجا اور میں نے افطار کے لئے ہاتھ بڑھایا تو زیدی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ مولانا اوبدہ کے بولے: زیدی صاحب! ابھی ہمارا وقت نہیں ہوا ہے۔ زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا: سنئے مولانا! میں نماز پڑھتا ہوں شیعہ مذہب پر، لیکن روزہ افطار کرتا ہوں سنی مذہب کے مطابق۔

زیدی صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہوتا کہ جمعہ کی نماز کا خطبہ اور تلاوت قرآن ہر شخص تک پہنچے لیکن ناظم سنی دینیات مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مرحوم کے نزدیک یہ ناجائز تھا اس لئے وہ اس کے سخت مخالف تھے، جب میں علی گڑھ آیا تو زیدی صاحب نے مجھ سے بھی اس خواہش کا اظہار کیا، میں نے ان کی تائید کی اور دوسرے دن ناظم صاحب مرحوم کو دفتر میں بلا کر میں نے پوچھا کہ آپ لاؤڈ اسپیکر کو کیوں ناجائز سمجھتے ہیں؟ انہوں نے اس کے دلائل پیش کئے، میں نے ان کے جوابات دیے، مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی، میں نے بہر حال مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگانے کا حکم دے دیا، زیدی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور محکوم دعائیں دیں، زیدی صاحب کھلے دماغ سے ہر ایک معاملہ پر غور کرتے تھے اور اس طرح جب وہ ایک فیصلہ کر لیتے تھے، اب ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب ان کی محبوب اور نہایت لائق بیوی قدسینہ بیگم کا انتقال ہوا تو لوگوں میں بڑا چرچا تھا کہ نماز جنازہ سنی مذہب کے مطابق ہوتی ہے یا شیعہ مذہب کے مطابق، لیکن جب جنازہ کو ٹھی سے روانہ ہونے لگا تو زیدی صاحب نے یہ اعلان کر کے تمام چیمے گونیاں ختم کر دیں کہ ”میرن درخواست پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نماز جنازہ پڑھائیں گے۔“

زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپ یونیورسٹی کے آئین مضوابط

ملاحظہ فرمائیے کہ مرحوم پر دفتیر احمد شاہ بخاری کی بہن اور سنی مذہب تھیں۔

کے اندر وہ کونسی طرح باہم دگر برسرِ یکا رہتے اور زیدی صاحب حق و انصاف کی راہ اختیار کرتے تھے، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شعبۂ فارسی کے لئے پروفیسر کا انتخاب ہونا تھا اور اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد جو یہاں پہلے سے ریڈر چلے آ رہے تھے امیدوار تھے۔ ڈاکٹر صاحب فارسی زبان و ادب کے نہایت بلند پایہ فاضل اور محقق ہیں اور ان کی تحقیقات و اکتشافات علمی کی دھوم ایران کی علمی مجلسوں میں بھی ہے، لیکن ساتھ ہی موصوف شکل و صورت، وضع قطع اور عمل و کردار کے اعتبار سے بالکل مولانا بھی ہیں، اس بنا پر ڈاکٹر صاحب ترقی پسند گروپ کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے اور وہ اس فکر میں تھا کہ سلکشن کمیٹی کے لئے بحیثیت اسپرٹ کے ایسے حضرات کا انتخاب کرائے جن سے اس کا مدعا پورا ہو۔ میں ترقی پسند گروپ کی اس کوشش سے واقف تھا، اس لیے جب اکاڈمک کونسل میں فارسی کے پروفیسر کی پوسٹ کے لئے سلکشن کمیٹی بنانے کا آئیم پیش ہوا میں نے فوراً کھڑے ہو کر قاضی عبدالودود کا نام پیش کر دیا، جیسا کہ توقع تھی ترقی پسند گروپ کے سربراہ جو اس وقت غالباً ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس بھی تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر میری مخالفت کی اور کہا کہ قاضی صاحب اردو زبان و ادب کے بلند پایہ محقق ہیں۔ لیکن وہ فارسی کے آدمی نہیں ہیں، میں نے جواب میں کہا کہ قاضی صاحب اردو کی طرح فارسی زبان و ادب کے بھی بڑے فاضل نقاد اور بلند پایہ محقق ہیں اور استدلال میں فارسی زبان و ادب پر موصوف کے پانچ چھ بلند پایہ تحقیقاتی مقالات کا حوالہ دیا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے میری تائید کی اور یہ نام منظور ہو گیا۔ دوسرا نام ڈاکٹر بادی حسن مرحوم کا پیش ہوا اور وہ بھی منظور ہو گیا۔ جب سلکشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو وہ ہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ڈاکٹر بادی حسن صاحب مرحوم نے ایک اور صاحب کے نام کی سفارش کی اور قاضی عبدالودود صاحب نے ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں رائے دی، جب بحث زیادہ طویل ہوئی تو قاضی صاحب کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا اور انھوں نے بہ طور جلیج کے



ڈاکٹر یادی حسن سے کہا کہ آپ کے پسندیدہ امیدوار کی جو تحقیقی کتاب ہے اور جس پر ان کو بڑا ناز ہے اسے خدا منگوائیے، میں نے اس میں چالیس غلطیاں نوٹ کی ہیں، آپ مجھ کو ان کا جواب دے دیجئے، اور اس کے بالقابل ڈاکٹر نذیر احمد کے تحقیقاتی مضامین یہ ہیں، آپ ان میں کوئی غلطی ہو تو اس کی نشاندہی فرما دیجئے اس پر معاملہ ختم ہو گیا اور ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر نذیر احمد بن گئے، یہ سب کچھ زیدی صاحب کی صداقت میں ہوا۔ انہوں نے اکاڈمک کونسل یا سکلش کمیٹی میں کوئی ایسی شے نہیں کہی اور نہ کوئی ایسا کام کیا جس کو دھاندلی یا عصبیت (MENTAL RESERVATION) کہا جائے، مجھے معلوم ہے کہ اسلام پسند گروپ کے لوگوں کے دل میں ان کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جاتا تھا، لیکن میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ وہ گروپ بندی اور جماعتی عصبیت سے بلند و بالا تھے، ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ان میں بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے، لیکن وہ انڈی پنڈنٹ طریق فکر کے آدمی تھے، نہ کسی پارٹی کے آلہ کار تھے اور نہ حکومت کے خوشامدی، انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ کے وقار اور مرتبہ کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں یونیورسٹی میں بڑی ترقی ہوئی، نئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کی وجہ سے ان کو علی گڑھ کا شاہجہاں کہا جاتا تھا، میڈیکل کالج کی تعمیر اور اس کا آغاز انہیں کے عہد میں ہوا۔ وہ سفر کم کرتے تھے، دفتر میں پابندی سے بیٹھنا، فائلوں کو دیکھنا اور سٹینکس میں شریک ہونا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ علی الصباح ٹہلنے کے بڑی سختی سے پابند تھے، لیکن یہ وقت بھی یونیورسٹی کے کام سے فارغ نہیں ہوتا تھا۔ اسی اشار میں یونیورسٹی میں جو عمارتیں زیر تعمیر ہوتی تھیں وہ ان کا معائنہ کرتے اور ضرورت ہوتی تو اس سلسلہ میں کوئی کارروائی کرتے تھے۔ سحر خیزی کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، بعض اوقات یونیورسٹی کے اہم معاملات پر غور و خوض وہ اسی وقت کرتے تھے اور رجسٹرار وغیرہ کو علی الصباح اپنی کوشش پر بلا کر ان امور پر گفتگو کرتے تھے، منہ اندھیرے میں بھی ٹہلنے اور ہوا خوری کا عادی ہوں،

میری اور ان کی ٹیچر ہو جاتی تو بعض اوقات بڑی حسرت سے کہتے کہ "تو لانا! دیکھے کیا عجیب  
سہانا وقت ہے، اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں، لیکن بد قسمتی سے صرف ہم دو مسلمان ہیں جو اس  
سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، باقی یہ سب ہندو ہیں جو آپ کو ہوا خوری کرتے نظر آ رہے ہیں۔  
یہ سب کچھ تو ہے ہی لیکن دستوری اعتبار سے زیدی صاحب نے جو  
ایک عظیم کارنامہ | ایک اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور یونیورسٹی  
کی تاریخ جدید کا کوئی مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسا کہ ہوتا  
آیا ہے تقسیم کے بعد سے اس غریب یونیورسٹی کو کبھی چین نصیب نہیں ہوا، اس پر ہمیشہ  
اعتراضات اور خوردہ گیری کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور وقت کی چٹم فٹم سار کوئی نہ کوئی  
فتنہ جگاتی رہی ہے، غالب نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکی آسماں کیوں ہو

یونیورسٹی کی نسبت پبلک میں کچھ نہ کچھ چہ می گوئیاں ہوتی رہتی تھیں، زیدی صاحب کے  
زمانہ میں (غالباً ۵۸ء میں) ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں یونیورسٹی پر بڑی لے دے ہوئی اور  
اس سلسلہ میں وزیر تعلیم ڈاکٹر شریالی نے زیدی صاحب سے کچھ سوالات بھی کئے جن کے  
مناسب جوابات بھجودے گئے۔ لیکن کہنے والوں کی زبانیں پھر بھی بند نہ ہوئیں تو آخر  
زیدی صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ایما پر یونیورسٹی کی اکڑ کٹو کونسل کی طرف سے  
ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی، اس کمیٹی کے صدر مشہور ماہر تعلیم پروفیسر جی، سی چٹرجی تھے اور  
سکریٹری مسٹر آئی۔ پی۔ ناٹک آئی، سی، ایس جو انٹرنٹ سکریٹری وزارت تعلیم تھے، بقیہ ارکان کمیٹی  
مندرجہ ذیل اصحاب تھے:

(۱) پروفیسر واڈیا۔ (۲) شری کوتار سنگھ ٹھوٹرا۔ (۳) مسٹر پی، این، سپرو۔ (۴) مسٹر  
ایم۔ اے شاہ میری، باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ یہ پوری کمیٹی ان حضرات پر مشتمل تھی جو



تعلیم کے نامور اور مشہور ماہر سمجھے جاتے ہیں اور اس بنا پر حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور کمیٹی نہیں ہو سکتی تھی، اب یہ بھی سن لیجئے کہ یونیورسٹی پر جو اعتراضات شد و مد سے کئے جاتے تھے ان کے بیت الغزل حسب ذیل تین اعتراضات تھے:

(۱) یونیورسٹی فرقہ پرستی کا گڑھ ہے۔ اس کے طلباء اور اساتذہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دماغ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہیں، اور اس بنا پر یونیورسٹی کے داخلوں میں، امتحانات میں اور تقررات میں غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک رواج رکھا جاتا ہے۔

(۲) یونیورسٹی میں اقربا نوازی (NEPOTISM) عام ہے، چند خاندان ہیں جو یونیورسٹی پر چھائے ہوئے اور اس کے دروبست کے مالک ہیں۔

(۳) یونیورسٹی کا مالیاتی انتظام نہایت خراب اور فاسد (CORRUPT) ہے اور اس میں لاکھوں روپیہ کا ایر پھیر ہے۔

ظاہر ہے ایک مرکزی یونیورسٹی کی عزت و شہرت کو خاک میں ملانے کے لئے ان تین باتوں سے زیادہ کوئی اور بات مہلک اور خطرناک نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اعتراضات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں زیدی صاحب نے رجسٹروں، فائلوں، حسابات کے رجسٹروں، دستاویزات اور حقائق و واقعات کی روشنی میں یونیورسٹی کی طرف سے جو جوابات فراہم کئے اور ان کے لئے جو مواد پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی، چستی اور لیاقت و قابلیت کا شاہکار ہے، کوئی امر خواہ کیسا ہی بے غل و غش ہو، لیکن اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بڑے سے بڑا نکتہ چین بھی قائل ہو جائے اس کے لئے بھی تو حسن سلیقہ اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیت درکار ہے۔

# لیبیا میں سرقہ و حرابہ کے حدود

از مولانا حبیب ریحان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ - البیضار (لیبیا)

لیبیا ایک ایسا عربی اسلامی ملک ہے جہاں اسلامی لیبیا شریعت کے احیا کے لئے ایک زرخیز سرزمین اقدار کا تحفظ بحمد اللہ بڑی حد تک محفوظ ہے، اور لوگوں میں اسلام سے محبت پائی جاتی ہے، اور رسوم و نظریات اور آراء کو سامراجی سازشوں سے عالم اسلامی کے تمام نوجوانوں اور تعلیم یافتہ حضرات میں کسی نہ کسی شکل اور مقدار میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں ان کی مقدار بہت کم ہے، اور اسلامی شریعت کے تجربہ کے لئے یہ بڑی زرخیز زمین ثابت ہو سکتی ہے، یہاں کے معاشرہ میں فطری خوبیاں بہت ہیں، روزوں کا اہتمام یہاں کا خاص شعار ہے، لوگوں میں سادگی ہے، چوری کی وارداتیں بہت کم ہیں، قتل و غارت، فساد اور ہنگامے شاذ و نادر ہی واقع ہوتے ہیں، الغرض دلوں میں اسلامی وقار قائم ہے اور شریعت اسلامیہ کو ملک کا قانون بنانے کی مانگ یہاں کے صالح عوام کی فطری و دینی مانگ بھی تھی، جسے لیبیا کی انقلابی حکومت نے پورا کیا، اور پہلے دن سے شریعت اسلامیہ کے مطابق قانون بنانے کی جو خوشخبری دی تھی اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں اور شریعت اسلامیہ کو تمام قوانین لیبیہ کا اصل ماخذ بنانے کی تاریخی قرارداد نکالی، شراب بندی کا قانون نکالا، زکوٰۃ کے اجراء کا قانون نافذ کیا، صندوق الجہاد کھولا، جمعیت الدعوة الاسلامیہ کھولی، شریعت اسلامیہ کی کانفرنس بلائی، علمائے شریعت و قانون سرعت کے ساتھ مکمل شرعی قوانین بنانے میں



مصرف ہیں، اور اگر مکمل اسلامی قانون بلا کسی رکاوٹ اور تعویق کے انشاء اللہ نافذ ہو گیا تو یہ لیبیا کے لئے افتخار و اعزاز کی بات ہوگی خدائے پاک پر یا اسلام پر کوئی احسان نہیں ہوگا، کیونکہ یہ تو بہت بڑے شرف اور شکر کا مقام ہے کہ کسی فرد یا ملک کی قسمت میں یہ سعادت آئے کہ وہ اسلامی شریعت کا احیاء کرے اور اپنے فطری عمل کو شروع کرے۔

۴ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو لیبین انقلابی لیبین قیادت کا کارنامہ | کونسل نے سرقہ اور حرابہ کی اسلامی حدود کا قانون نکالا ہے جو شریعت اسلامیہ سے ماخوذ ہے، اس وقت اسلامی قانون کی تطبیق کی جو کوششیں لیبیا میں ہو رہی ہیں ان میں سب سے زیادہ مومنانہ اور حرأت مندانہ اقدام کہا جاسکتا ہے، اس پر عالم اسلامی لیبیا کو مبارکباد دینے میں جس قدر بھی فیاضی اور مبالغہ سے کام لے صحیح ہے۔

سرقہ اور حرابہ دو اسلامی حدیں ہیں، سرقہ چوری کو کہتے ہیں، اور حرابہ سینہ زوری کو، یعنی حرابہ کے اندر ڈکیتی، قافلہ لوٹنا، راستہ روکنا اور قتل و غارت سب آجاتا ہے، فقہی اصطلاح میں حرابہ کو قطع طریق اور سرقہ کبریٰ بھی کہتے ہیں، ان دونوں حدود کی تعریف، شرعی کیفیت اور تفصیل انشاء اللہ راقم بعد کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے گا، راقم ایک تفصیلی مضمون لکھ رہا ہے جس کا عنوان ہے ”سرقہ اور حرابہ کی حد اسلامی شریعت کی روشنی میں“ جس میں حدود الہیہ کی حکمت، حدود کا مفہوم، تعریفات، پھر سرقہ اور حرابہ کی مکمل تفصیل قرآن و سنت، مذاہب فقہ اور علمائے امت کے اقوال کی روشنی میں کرے گا۔

یہ کام تفصیل طلب ہے اور اس کے لئے کچھ وقت بھی ابھی درکار ہے، اس لئے وقت کی ضرورت اور تقاضہ کے پیش نظر تاخیر کے بغیر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لیبیا میں سرقہ اور حرابہ کا جو قانون نکلا ہے اس کا ترجمہ قارئین کے لئے پیش کروں، قانونی الفاظ اور فقہی عبارتوں میں ترجمہ کے لئے انتہائی تفصیل درکار ہوتی ہے، راقم نے علمی امانت کی وجہ سے ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا ہے لیکن جہاں مختصر تشریح کی ضرورت پڑی ہے اسے قوسین (برکیٹ) میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ مقنن کے الفاظ نہیں بلکہ میرے الفاظ ہیں، بعض جگہ حاشیہ میں تفصیل بیان کی گئی ہے، لیکن یہ سب تفصیلات و تشوہات انتہائی مختصر اور لادبی ہیں، یہ قانون علماء و مفکرین قانون کی کوششوں کا نتیجہ ہے، امام مالک کے اقوال کو اصولی طور پر اپنا یا گیا ہے کہ شمال افریقہ میں مالکی ہی رہتے ہیں لیکن کلی طور پر فقہ کے مذاہب اربعہ کی پوری مدد لی گئی ہے، دوسرے چند احکام دوسرے فقہاء اور علماء سے بھی اخذ کئے گئے ہیں جو مذاہب اربعہ میں سے نہیں ہیں، ان کی مکمل تفصیل اور ان پر مکمل تبصرہ بعد کو کروں گا، یہ تفصیلی مقالہ اس طرح ہوگا۔

۱۔ سب سے پہلے قانون سرقہ و حرابہ کا ترجمہ۔

۲۔ پھر آئندہ مذکورہ توضیحیہ (یعنی حکومت کی نکال ہوئی قانون سے متعلق توضیحی یادداشت یا رپورٹ) کا ترجمہ، اس یادداشت میں قانون سے متعلق بہت سی تفصیلات و توضیحات بیان کی گئی ہیں، اور بعض احکام جن میں فقہی مذاہب کے سوا کسی دوسرے عالم کی رائے لی گئی ہے ان کے ماخذ اور تاویلات بتائی گئی ہیں۔

۳۔ توضیحی یادداشت کے بعد جو مسائل توضیح طلب رہ گئے ہیں ان کی توضیح اور فقہی اختلافات وغیرہ کی تفصیل، اس کا عنوان یوں رکھا جاسکے گا ”سرقہ و حرابہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں۔“

اب آئیے قانون کا ترجمہ پڑھئے :

قانون سرقہ و حرابہ کا ترجمہ

”عوام کے نام سے، انقلابی کونسل کی طرف سے،“

(۱) قانون کے شروع میں ”عوام کے نام سے“ کی عبارت دیکھ کر یہ شبہ نہ ہو کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے نام سے نہیں، جیسا کہ عام طور پر لادینی اور وضعی قوانین کا شعار ہے کہ وہ انسانوں کی سیادت اور تقصیر پر قائم ہوتے ہیں، بلکہ صرف اس امر کا اظہار ہے کہ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے (بقیہ صفحہ ۱۹۲)



شرعیات اسلامیہ کے احکام کی تابعداری میں، اور جمہوریہ عربیہ لیبیا کے مسلمان عرب عوام کی رغبات و خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے، اور اس بات کی تاکید کرنے کے لئے جو جمہوریات عربیہ (لیبیا، مصر اور سوڈیا) کے دستور کا فیصلہ ہے،

اور انقلابی کونسل کے دستوری اعلان نمبر مجریہ ۲ شوال ۱۳۸۹ م مطابق ۱۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور عوام کی مرضی کے مطابق جو شرعیات پر چلنے کے لئے بے چین ہیں "یہ قانون نکالا جاتا ہے، کیونکہ لیبیا عوامی جمہوری حکومت ہے، شخصی بادشاہت نہیں، اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ مقنن نے ایک سطر بعد لکھا ہے کہ "شرعیات مطہرہ کے احکام کی تابعداری میں" اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ شرعیات اسلامیہ کی تابعداری خدا کی مرضی اور نام کے بغیر ممکن نہیں کہ خدا ہی شرعیات کو نازل کرنے والے ہیں، اور لیبیا ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں سارے قوانین کتاب و سنت اور اقدار اسلامی کی روشنی میں بنائے جا رہے ہیں، اس لئے ایک فیصلہ بھی لادینی قوانین کی اتباع کا شبہ اس جملہ میں نہیں ہو سکتا۔ دراصل یہ حقیقت ہے کہ اسلام میں حاکم یا حکومت جس طرح خدا کے سامنے جواب دہ ہے اسی طرح مخلوق خدا اور عوام کے سامنے بھی اپنے ہر استنباطی اور اجتہادی عمل میں جواب دہ ہے، اس لئے عوام کی طرف سے انتخاب، ان کی نمائندگی، ان کی مرضی اور مشورہ شرعاً واجب ہے اور انہیں کی رعایت سے یہ جملہ لکھا گیا ہے، یعنی کسی فرد واحد، مطلق العنان بادشاہ یا ظالم و جابر حاکم کی اپنی ذاتی خواہش، من مانی لہجہ اور شخصی تفکیر پر اس قانون کی بنیاد نہیں ڈالی جا رہی بلکہ شرعیات کے احکام کی رو سے اور لیبیا کے مسلم عوام کی خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے ان کے نمائندوں کی طرف سے یہ احکام صادر کیے جا رہے ہیں۔ اس لئے مقنن کے ضمیر میں اور قانون کے ہر سطر جملہ میں، شرعیات کی اتباع اور حدود جیسے قوانین کے نفاذ میں اللہ کا نام اور عظمت اور قانون الہی کا احیاء موجود ہے جو اس بات کی مکمل ضمانت ہے کہ یہی مقنن نے قلب و نظر سے تحت الشوریٰ اور تحت السطور میں بسم اللہ کا اقرار و اعتراف ضرور کیا ہے اور اس کا اظہار قانون کی دوسری سطریں موجود ہے۔

کے موافق،

اور انقلابی کونسل کی اس قرارداد کے ماتحت جو ۹ رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو صادر ہوئی، جس میں ان کمیٹیوں کی تشکیل کا اعلان تھا جو موجودہ قوانین کی مراجعت کریں اور اسلامی شریعت کے اساسی (بنیادی) اصولوں کے مطابق اس کی تعدیل (ترمیم اور تبدیلی) کریں، اور عقوبات و جنائی اجرائیات (PENAL CODE - CRIMINAL LAW) کے دونوں قانونوں سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد جو ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۵۲ء میں صادر ہوئے،

اور اس اعلیٰ کمیٹی کے اعمال نہایت (آخری کاموں اور رپورٹوں) کی روشنی میں جو قوانین کے مراجعہ کے لئے انقلابی کونسل کی طرف سے ۹ رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو بنائی گئی تھی،

اور وزیر عدل (انصاف) کے پیش کرنے اور مجلس وزراء کے پاس کرنے کے بعد،  
..... یہ قانون صادر کیا جاتا ہے۔

## باب اول

### حد سرقہ سے متعلق احکام

دفعہ ۱

وہ ضروری شرطیں جن کا پورا ہونا اس سرقہ کے لئے ضروری ہے جس پر حد نافذ ہوگی۔  
مادہ نمبر ۳ کے احکام کی مراعات کے ساتھ، یہ شرطیں اس سرقہ کے لئے ضروری ہیں جس پر حد نافذ ہوگی،  
۱۔ یہ کہ مجرم عاقل ہو، کامل ۸ سال ہجری اس کی عمر ہو، مختار ہو، محتاج یا مضطر<sup>(۱)</sup> نہ ہو

(۱) مضطر و محتاج فقہی لفظ ہے جو ضرورت و حاجت کے فرق کو واضح کرتے ہیں، اضطار اس مجبوری اور بھوک کی حالت کو کہتے ہیں جس میں سوا اور حرام اشیاء تک کھانی جائز ہو جاتی ہیں۔ ایسی (باقی اگلے صفحہ)



- ۲۔ مجرم مال حاصل کرے چھپ کر، اپنی ملکیت بنانے کے قصد سے۔  
 ۳۔ یہ کہ مسروقہ مال منقول ہو، متمول<sup>(۱)</sup> ہو (مالیت رکھتا ہو)، محترم<sup>(۲)</sup> ہو، کسی دوسرے کی ملک ہو، حرز<sup>(۳)</sup> (محفوظ جگہ یا حفاظت) میں ہو، اس کی قیمت چوری کے وقت دس دینار

(بقیہ ماشیہ صغیر گذشتہ) صورت میں حد کا قیام ہمارے نہیں ہوگا، حاجت ضرورت اور اضطرار سے کم ہے لیکن سخت حاجت کی صورت میں بھی قطع نہ ہوگا کہ حدود و شبہات سے ختم ہو جاتی ہیں، اس سلسلے میں مقنن نے آسان قول لیا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ اسلام میں کسی بھی محتاج شخص کی حاجت پوری کرنا حکومت پر، پھر اقربا پر پھر پڑوسیوں پر اور پھر ساری سوسائٹی کے افراد پر واجب ہے، اس موضوع کی مزید تفصیل بعد کو کی جائے گی۔

(۱ و ۲) امام مالک کے مذہب میں مال مسروقہ میں نصاب کے بعد تین بنیادی شرطیں اور ہیں، قرطبی نے لکھا ہے (۱۶۸-۷) ”مما یتمول ویتملک ویحل بیعہ“ حاشیہ العدوی میں ہے (۲-۳۰۵-۳۰۶) ”مما ینتفع بہ محترما“ متمول سے مراد یہ ہے کہ مالیت رکھتا ہو بعض چیزیں شرعاً مالیت نہیں رکھتیں، اور بعض کی مالیت کے بارے میں اختلاف ہے، جیسے سور، شراب، اس کے برتن، گمانے بجانے کے آلے وغیرہ۔ بعض چیزیں مالیت رکھتی ہیں لیکن نفع نہیں پہنچا سکتیں جیسے وہ گدھا جو عالم نزع میں ہو، یا وہ حقیر و تافہ چیزیں جو دارالاسلام میں سب کے لئے حلال ہوں، یتملک سے مراد یہ ہے کہ اس کو اپنی ملکیت بنانا مسلمان کے لئے جائز ہو، محترم کے معنی ہیں کہ مسلمان کے لئے اس کا فروخت کرنا جائز ہو۔ بعض چیزیں وہ ہیں کہ مالیت بھی رکھتی ہیں، ملکیت بھی جائز ہے، حلال ہیں لیکن فروخت کرنا جائز نہیں جیسے قسربانی کا گوشت، اس سلسلے کے بڑی فقہی مسائل تفصیلی مضمون میں بیان کروں گا۔

(۳) حرز کے معنی ہیں محفوظ ہونا یا محفوظ جگہ میں ہونا، کیونکہ حرز کی دو قسمیں ہیں ۱۔ حرز بالکان یا حرز بنفسہ ۲۔ حرز بالفاظ، ان کی تعریفات، اور ائمہ فقہ کے نزدیک حدیں اور باریکیاں فقہی طور پر، بہت ہیں جو سرقہ و حرابہ سے متعلق تفصیلی مضمون ہی میں پیش کی جائیں گی۔

یہی سے کم نہ ہوگا (۴۱)

دفعہ ۲

سرقہ کی حد

اگر وہ ساری شرطیں جو دفعہ نمبر میں بیان ہوئی ہیں پوری ہوں تو سارق پر حد نافذ ہوگی اور اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔

دفعہ ۳

وہ صورتیں جن میں حد سرقہ نافذ نہ ہوگی۔  
حد سرقہ کی تطبیق ان صورتوں میں نہ ہوگی جن میں مجرم کے لیے کوئی شبہ موجود ہو، جیسے  
حسب ذیل اشیاء:

۱۔ اگر چوری عام جگہوں (دفتروں، کارخانوں، دکانوں وغیرہ) میں سے کام کے دوران ہوئی ہے، یا کسی بھی ایسی جگہ سے جہاں مجرم کو داخل ہونے کی اجازت ہے اور مال مسروقہ محرز محفوظ جگہ یا حفاظت میں نہیں ہے۔

۲۔ اگر چوری اصول (باپ دادا) یا فروع (بیٹا پوتا) کے درمیاں یا میاں بیوی یا محارم کے درمیان ہوئی ہے، یا قریبی رشتہ دار جیسے چچا، خالہ وغیرہ، یہ بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔  
۳۔ اگر مسروقہ مال کا مالک مجہول (غیر معلوم) ہے

۴۔ اگر مسروقہ مال کا مالک مجرم کا مقرض ہو، اور ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو یا انکار کرتا ہو اور ادائیگی قرض کا وقت نکل چکا ہو، سرقہ سے قبل، اور مجرم نے جس مال پر قبضہ

---

(۴۲) یہ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول ہے، توضیحی یادداشت میں اس کا مافذ، وضاحت امدتاً دیل پیش کی گئی ہے، اور مزید اس کی تشریح و توضیح راقم تبصرہ والے مضمون میں پیش کرے گا، کیونکہ یہ ائمہ اربعہ کے قول سے محارم ہے اور نصاب سرقہ سے متعلق دوسرے ائمہ فقہ و علمائے امت کے اقوال بھی تفصیل کے ساتھ پیش کرے گا۔



کیا ہو وہ اس کے حق کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو لیکن یہ زائد مال اس کے گمان میں نصاب تک نہ پہنچتا ہو<sup>(۱)</sup>۔

۵۔ اگر مسروقہ چیز درخت پر موجود پھل ہوں یا اس کے مشابہ زرعی چیزیں جو کٹی ہوئی نہ ہوں، اور ان میں سے مجرم نے کھا لیا ہو، لیکن ساتھ لے کر نہ گیا ہو۔

۶۔ اگر مجرم سرقہ کے جرم میں شریک ہو دوسروں سے اتفاق، ابھارنے اور مساعدت کی حد تک، جب تک کہ اس کی مساعدت اور مدد اس حد تک نہ پہنچے کہ وہ براہ راست مجرم کے دائرہ میں آجائے۔

۷۔ اگر مجرم مال مسروقہ کا مالک بن جائے سرقہ کے بعد<sup>(۲)</sup>، اور دعوے میں آخری فیصلہ صادر ہونے سے قبل۔

۸۔ اگر مجرم کئی ہوں کسی ایسے سرقہ میں جو ان سب کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہو، اور ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں (مال مسروقہ میں سے) نصاب سے کم رقم آئی ہو۔

۹۔ اگر کسی ایسی جگہ سے سرقہ ہوا جہاں سارق کی ملکیت کا شبہ ہوتا ہے، جیسے کسی مشترکہ کپنی سے یا کسی وقف میں سے اپنے مستحق حق کا، یا جیسے بیت المال یا مال غنیمت میں سے<sup>(۳)</sup>۔

(۱) راقم قانون کی اہم اور مخصوص دفعات پر حاشیہ لگا رہا ہے، ورنہ ہر موضوع پر فقہی اقوال موجود ہیں، اس مسئلہ اور اس جیسے تمام جزوی اختلافات والے مسائل کو ترتیب وار تبصرہ والے آخری مضمون میں بیان کیا جائے گا

(۲) کسی بھی طریقہ سے مال مسروقہ اس کی ملکیت بن جائے جیسے یہ مال اس کو ہدیہ کر دیا جائے یا ہبہ کر دیا جائے یا فروخت کر دیا جائے یہ قول صرف امام ابوحنیفہ کا ہے، اور اکثر اقوال کی طرح ایسی مقنن نے یہ قول بھی امام صاحب کے قول سے اخذ کیا ہے۔

(۳) یہ قول بھی حنفی فقہ سے اخذ کیا گیا ہے، مالکی مذہب میں بیت المال کی چوری پر (باقی صفحہ پر)

یہ تمام احوال جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، (لیبی،) قانون عقوبات یا کسی قانونی چارہ جوئی کو معطل نہیں کر سکتے اور نہ خلل ڈال سکتے یعنی قطع نہ ہونے کی صورت میں موجودہ کریمنل لا کے مطابق تعزیری سزائیں باقی رہیں گی، شبہ کی صورت میں بالکل معافی نہیں ہو جائے گی، اور قانون عقوبات نافذ رہے گا۔

## باب دوم حد حرابہ سے متعلق احکام

دفعہ ۳

حرابہ کا جرم اور وہ واجب شرطیں جن کی موجودگی میں حد نافذ ہوگی۔

۱۔ حرابہ کا جرم حسب ذیل دو صورتوں میں پیدا ہوگا،  
(الف) کسی دوسرے کے مال پر مغالبتہ (زبردستی، غلبہ اور قوت کے ساتھ) قبضہ کرنا<sup>(۱)</sup>  
(ب) عام لوگوں پر قطع طریق کرنا (قافلہ لوٹنا) اور لوگوں کو چلنے سے روکنا ڈرانے اور دھمکانے کے قصد سے۔

۲۔ ان دونوں صورتوں میں یہ شرط ہے کہ ہتھیار استعمال کئے گئے ہوں یا کوئی ایسی چیز جو جسمانی اذیت اور ڈرانے دھمکانے کے قابل ہو۔

۳۔ اگر حرابہ آبادی میں ہو تو غوث (مدد) پہنچ سکنے کا امکان بھی ایک شرط ہوگی۔

۴۔ یہ ضروری ہے کہ مجرم عاقل ہو، اٹھارہ سال، ہجری پورے کر لیے ہوں، مختار ہو مضطرب

(بقیہ طغیہ صفحہ گذشتہ) باتفاق قطع ہوگا، مال غنیمت میں شے کا بن قاسم کے قول کے مطابق ہر حصہ ہوگا، عبدالملک کے نزدیک اپنے حق سے تین درہم زیادہ لینے کی صورت میں، لیکن<sup>(۱)</sup> ہی نہیں ہے تو پھر مالکی مذہب میں باتفاق قطع ہوگا۔

(۱) حرابہ کی فقہی تعریفات اور تفصیلات مفصل مضمون میں پیش کی جائے گی۔



نہ ہو۔

دفعہ ۵

حد حرابہ

محارب پر حد حسب ذیل طریقے سے نافذ ہوگی۔

(الف) قتل کیا جائے گا اگر اس نے قتل کیا، مال پر قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

(ب) دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا اگر صرف مال پر قبضہ کیا ہے اور قتل نہیں کیا ہے۔

(ج) جیل دی جائے گی اگر اس نے راستے میں ڈرایا اور دھمکا پایا ہے!!

دفعہ ۶

(۱) حد حرابہ توبہ سے ساقط ہو جائے گی، اگر مجرم اس پر قبضہ حاصل ہونے (پکڑے جانے)

سے پہلے توبہ کر لے، اور یہ ان دونوں حسب ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

(الف) اگر مجرم اپنا جرم مسئولین (حکومت اور پولیس وغیرہ) کے علم میں آنے سے قبل ہی چھوڑ

دے اور اپنے اس فعل کی اطلاع توبہ کے اعلان کے ساتھ کسی طرح بھی نیاہتہ عامہ

(PUBLIC PROSECUTOR) تک پہنچا دے۔

(۱) آیت حرابہ میں لفظ ”او“ کی تفسیر و تشریح میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا اس میں امام کو اختیار

دیا گیا ہے کہ بیان کردہ منراؤں میں جو چاہے دے یا اس لفظ میں جرم کی تنویح مقصود ہے، یعنی جرم کی

مختلف صورتیں ہیں اور ان میں مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں اور یہی احناف کا قول ہے، مقنن نے

تینوں شکلیں تحدید کے ساتھ اسی طرح لی ہیں، اور ”نفی“ بھی احناف کے قول سے اخذ کی گئی ہے جس کے معنی

شہر بدر یا جلا وطن کرنے کے لغوی معنی کے بجائے مجازی اور اصطلاح شرع میں حبس اور قید کے معنی

لیے گئے ہیں، چوتھی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ چوری بھی کی اور قتل بھی کیا مقنن نے اسے (الف) میں بیان

کیا ہے، اس کی اور اس موضوع کی تفصیل بعد کو بیان کی جائے گی۔

(ب) اگر وہ خود اختیاری طور پر اطاعت کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس یا نیا بہ عامہ کے حوالے کر دے، اس پر قابو پائے جانے (گرفتاری) سے پہلے۔

(۲) توبہ کے ذریعہ حد خرابہ ساقط ہو جانے سے جن پر زیادتیاں ہوئی ہیں ان کے حقوق معاف نہیں ہو سکتے، جیسے قصاص، دیت وغیرہ، اسی طرح وہ سزائیں اور تعزیرات بھی جو قانون عقوبات (لیبیہ) میں موجود ہیں ان جرائم سے متعلق جن کی سزا موجود ہے۔

دفعہ ۷

توبہ جو حد خرابہ کو ساقط کرے گی اس کی تحقیق کے طریقے

۱۔ اگر مجرم نے دفعہ بالا کی رو سے اپنی توبہ کا اعلان کیا تو نیا بہ عامہ اس واقعہ کی تحقیق کرے گی، اور ان شرطوں کی چھان بین بھی جو ساقط کرتی ہیں۔

۲۔ اگر تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ مجرم ایسے جرموں کا مرتکب ہے جن پر قانونی طور سے وہ سزا کا مستحق ہے، یا اس پر ایسے حقوق واجب ہوتے ہیں جو جن پر زیادتی ہوئی ان کا حق ہیں جیسے قصاص، دیت یا مال کا ضمان، یا ان میں سے کسی چیز کے بارے میں شک پیدا ہوا تو نیا بہ عامہ ان اوراق کو ان معاملات سے متعلق عدالت میں پیش کرے گی تاکہ ان پر فیصلہ صادر ہو۔

۳۔ لیکن اگر تحقیق کے بعد ان مذکورہ بالا چیزوں میں سے کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی تو پھر نیا بہ عامہ یہ فیصلہ کرے گی کہ وہ مجرم جس نے گرفتاری سے قبل توبہ کر لی ہے اس کے خلاف دعویٰ پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

باب سوم

مشترک احکام (یعنی سرقہ اور حرابہ سے متعلق مشترک احکام جو اس قانون میں بیان

ہو رہے ہیں)

دفعہ ۸

اس مجرم کی سزا جس کی عمر اٹھارہ سال سے



کم ہو۔

وہ استثناء جو دفعہ نمبر ۴۴ میں وارد ہے جس کی رو سے مجرم پر دونوں جرموں میں اگر اٹھارہ سال ہجری سے کم عمر ہے تو اس پر حد نافذ نہیں ہوگی اور اس کی تعزیر حسب ذیل طریقوں سے ہوگی

(۱) سرقہ اور حرابہ دونوں حدود میں متقن نے حد نافذ ہونے کی عمر کامل اٹھارہ سال ہجری رکھی ہے، ان دونوں موقعوں پر راقم نے حاشیہ نہیں لگایا تھا کیونکہ اس جگہ یہ مناسب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تکالیف شرعیہ کا مکلف بالغ ہونے کے بعد ہوتا ہے، یعنی اوامر الہیہ کی اتباع پر ثواب، تو اہی کے ارتکاب پر گناہ، اسی طرح حدود و قصاص وغیرہ جیسی قانونی چارہ جوئیاں بھی اسی وقت ہوتی ہیں لیکن بلوغ سے قبل بھی تعزیر و تادیب کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس طرح بچپن ہی سے شعور اور لاشعور دونوں میں اوامر الہیہ کی اتباع کا جذبہ اور شریعت مطہرہ پر عمل پیرا ہونے کی عادت پیدا ہو جائے، نماز جو ان ہونے کے بعد فرض ہے لیکن سات برس کی عمر میں اس کا حکم دینا اور دس سال کی عمر میں تنبیہ و تادیب کرنا اسی لئے ضروری ہے کہ نماز اس کی عادت ثانیہ بن جائے، اسی طرح بلوغ سے پہلے کیے گئے جرم جیسے چوری، ڈاکہ اور قتل وغیرہ پر حدود و قصاص تو نافذ نہیں ہوگا کیونکہ شرعی و عقلی طور پر مجرم ابھی مکلف نہیں ہوا ہے لیکن اس کی تادیب و تنبیہ و تعزیر از حد ضروری ہے کیونکہ مکلف ہو جانے کے بعد خدا نخواستہ یہ جرائم اس کی فطرت و عادت ثانیہ نہ بن جائیں۔

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ تکالیف شرعیہ بالغ ہونے کے بعد شروع ہوتی ہیں اور بلوغ کی اصلی علامت مرد کے لئے انزال و احتلام اور عورت کے لئے حیض ہے، لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ایک طرف تو ان کا علم دوسروں کو ممکن نہیں، مجرم اس سے انکار کر سکتا ہے، دوسری بات یہ کہ جس کے بلوغ کا علم نہ ہو یا مقررہ متعدد فقہی علامتوں میں سے کوئی اس میں نہ پائی جائے تو کیا وہ کسی عمر میں بھی تکالیف شرعیہ کا مکلف نہ ہوگا؟ اس سلسلے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

۱۔ اگر اس نے سات سال پورے کر لئے ہیں لیکن پندرہ سال مکمل نہیں ہوئے ہیں تو تغزیر، توجیہ، نصیحت اور سخت کلامی کے ذریعہ کی جائے گی، اور اگر وہ دس سال سے زیادہ ہے تو اس کی تغزیر ضرب سے بھی کی جاسکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہاں اختصار کے ساتھ اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی صورت میں امام ابو یوسف و محمد، امام شافعی و احمد وغیرہ نے مرد و عورت دونوں کے لئے مکمل پندرہ سال کی عمر رکھی ہے، ایک روایت میں امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول نقل ہوا ہے، مفسر قرطبی مالکی نے امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سترہ سال کی عمر ہے، اس سلسلے میں جو حنفی مراجع راقم نے دیکھے ان میں مجھے یہ قول نہیں ملا لیکن میں نے استقصاء نہیں کیا ہے اس لئے نفی کی پوزیشن میں نہیں ہوں، ہاں امام اعظم کا قول ایسی بڑکی کے سلسلے میں جس کے بلوغ کی دوسری علامتیں ظاہر نہ ہوئی ہوں سترہ سال ہے، لیکن لڑکے کے سلسلے میں یہ قول راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ قرطبی نے امام مالک کا سترہ سال والا قول اور یہ قول کہ جب اس کی آواز بھاری ہو جائے نقل کیا ہے اور اٹھارہ سال والے قول کی طرف اشارہ نہیں کیا، لیکن امام ابو حنیفہ کے دو قول اور نقل کیے ہیں، انیس سال اور اسے مشہور بتایا ہے، دوسرا اٹھارہ سال، فقہ حنفی کے عظیم مرجع شمس الائمہ ابو بکر السرخسی نے بھی لڑکے کے سلسلے میں دو قول نقل کیے ہیں اور انیس سال والی روایت کو اصح لکھا ہے، لیکن فقہ حنفی کے دوسرے مراجع اور ابحات کی رو سے امام صاحب کا مشہور قول اٹھارہ سال ہی ہے، اس کی تاویل بعض حضرات نے یہ کی کہ انیسواں سال شروع ہو جائے لیکن فی الحقیقت یہ تاویل صحیح نہیں، بلکہ یہ دو مختلف روایتیں امام صاحب سے منقول ہیں، کیونکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ بھی موجود ہے کہ تا انکہ انیس سال پورے ہو جائیں۔ قرطبی نے امام مالک کا اٹھارہ سال والا قول نقل نہیں کیا لیکن فقہ مالکی میں بھی یہی قول مشہور و معتبر ہے، بلغه السالك لا قرب المسالك الى مذاهب الامام مالك میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)



۲۔ اگر اس نے پندرہ سال پورے کر لیے ہیں تو سرقہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب (مارپیٹ) کے ذریعہ ہوگی اور حرابہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب سے بھی ہو سکتی ہے، اور قانونی اصلاحیہ (تربیت و اصلاح کے لئے بنائی گئی سرکاری تربیت گاہ یا جیل) میں رکھ کر بھی کی جاسکتی ہے۔

۳۔ جو دو صورتیں مذکورہ بالا دو بندوں میں پیش کی گئی ہیں۔ ان سے متعلق اگر اٹھارہ سال سے کم عمر والے مجرم سے (جرم دوبارہ صادر ہو تو مجرم پر ایسی ضرب کا حکم لگایا جائے گا جو اس کی عمر کے مناسب ہو، اور اگر وہ دس سال سے اوپر ہے تو اس کو اصلاحی جیل میں رکھے جانے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

۴۔ اور دونوں مخصوص حدیں (سرقہ و حرابہ) تکرار کی صورت میں اس قانون میں ایک ہی حکم رکھتی ہیں۔

۵۔ اس دفعہ میں جو تعزیرات (سزائیں) بیان کی گئی ہیں وہ محض تادیبی کاروائیاں ہیں۔

دفعہ ۹

سرقہ اور حرابہ کے جرم کی نوعیت

سرقہ اور حرابہ کے دونوں جرم جن پر حد نافذ ہوگی وہ اس قانون کے احکام کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلوغ کی پانچ علامتیں باب الحج کے آخر میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے ”عمر کا اٹھارہ سال ہونا“۔ مزید اس موضوع کی تفصیل، اقوال اور دلائل انشاء اللہ تفصیلی مضمون میں بیان ہوں گے۔ ایسی مقنن نے امام مالک و امام ابو حنیفہ کے مشہور قول کے مطابق اور احتیاط کی خاطر اٹھارہ سال مقرر کیے ہیں، اور تکلیف قانونی کی عمر اکثر قوانین جدیدہ میں بھی یہی رکھی جاتی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی شریعت قمری سال سے حساب لگاتی ہے اور منی قوانین شمسی سال سے۔

مطابق ثابت ہوں گے۔

دفعہ ۱۰

ثبوت

۱۔ اس قانون کی دفعہ نمبر ۳ میں بیان کئے ہوئے دونوں جرم عدالت کے سامنے ایک دفعہ اعتراف سے ثابت ہو جائیں گے یا دو شخصوں<sup>(۱)</sup> کی گواہی سے، لیکن مجنی علیہ (جس پر زیادتی کی گئی) کا شمار گواہوں میں نہیں کیا جائے گا، حراہ میں وہ گواہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے کے حق میں گواہ ہو۔

۲۔ مجرم اپنے اعتراف سے انکار کر سکتا ہے، آخر فیصلے کے صادر ہونے سے قبل، اس صورت میں حد ساقط ہو جائے گی اگر اس کا ثبوت صرف مجرم کے اقرار سے ہوا ہے<sup>(۲)</sup>۔

(۱) دو شخصوں سے مراد دو مرد ہیں، کیونکہ ائمہ اربعہ کے اتفاق سے عورت کی گواہی حدود میں مقبول نہیں ہے، ایسی تقنین نے اس کی طرف اشارہ تو ضیحی یادداشت میں کیا ہے، اور اس کی فقہی و عقلی حکمت اور گواہوں کی شروط تفصیلی مقالے میں بیان کروں گا۔

(۲) کیونکہ اقرار و اعتراف کی صورت میں کوئی گواہی سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور مجرم کے انکار کے بعد جرم کے اثبات کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے، فقہ کا یہ واضح مسئلہ ہے کہ انکار اور اعتراف سے جمع حدود کے بارے میں صحیح اور مقبول ہوگا مال کے بارے میں نہیں، یعنی مال کا ضمان دینا پڑے گا، لیکن حد کیونکہ چھوٹے سے شبہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہے اس لیے ایسے بڑے شبہ سے یعنی جرم کے ثبوت ہی نہ ٹھننے کی صورت میں کیسے ساقط نہ ہوگی، یا کس طرح شبہ کی موجودگی میں نافذ ہو سکتی ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی.... یہ دھوئی کر سکتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے مجرم پر ظلم و تشدد کیا ہے اور اسے قانونی سہولتیں پوری مہیا نہیں کی ہیں کیونکہ اعتراف ظلم و ستم کے ذریعے یا جھوٹ بھی پولیس کی طرف سے گڑھا جاسکتا ہے۔



اور حد کے ساقط ہونے سے وہ تعزیرات ساقط نہ ہوں گی جو اس دفعہ کے بند نمبر ۳ میں آگے آرہی ہیں۔

۳۔ اور ان قانونی تعزیرات (سزاؤں) کی تطبیق ہوگی جو عقوبات کے قانون میں منصوص<sup>(۱)</sup> ہیں، ایسے شخص کے لئے جس کے بارے میں اس دفعہ میں بیان کی گئی شرعی دلیل ثابت نہ ہو، یا اس مجرم کے حق میں جس نے اپنے اعتراف سے انکار کیا ہو، اور یہ اس صورت میں جبکہ جج جرم کے ثبوت پر کسی بھی دوسری دلیل یا قرینے سے قانع ہو۔

دفعہ ۱۱

ابتدا دجرم کی ابتدا اور اس کو شروع کرنے کی سزا، یعنی جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں،  
۱۔ (لیبی) قانون عقوبات کے احکام اس جرم کے شروع کرنے کے بارے میں ساری المفعول ہوں گے جن میں حد نافذ ہوگی<sup>(۲)</sup>۔

۲۔ ابتدا کرنے کی سزا دونوں جرموں میں اس قانون کے مطابق طے کی جائے گی جو قانون عقوبات (لیبی) کی دفعہ نمبر ۶۰ و ۶۱ میں وارد ہے اور یہ اس طرح کہ اس جرم پر جو سزا

(۱) ایسی مقنن نے جج کو یہ آزادی دی ہے کہ اس پر جرم کی حقیقت مجرم کے اعتراف کے بعد کیے گئے انکار کے بعد اگر کسی طرح بھی واضح ہو جائے تو وہ اس کو دوسری سزائیں قانونی طور پر دے سکتا ہے، یہ اسی قاعدہ کے ماتحت کہ حدود تو ساقط ہو جائیں گی لیکن ضمان مالی یا دوسری تعزیرات ثبوت کے کسی قرینے کی رو سے بھی باقی رہ سکتی ہیں، قانون عقوبات لیبیہ میں ایسی صورتوں میں بیان کی ہوئی جن سزاؤں کی طرف مقنن نے اشارہ کیا ہے، راقم تفصیل مضمون میں ان کو قانون عقوبات سے نقل کرے گا۔

(۲) راقم قانون عقوبات لیبیہ کی دفعہ ۶۰ و ۶۱ کا ترجمہ بھی انشا اللہ تفصیلی تبصرہ میں کرے گا۔

قانون مشارالیه میں مقرر ہے وہی نافذ ہوگی<sup>(۱)</sup>۔

دفعہ ۱۲

جرائم اور سزائیں متعدد ہونے کی صورت میں

۱۔ اگر مجرم کے جرم ایک دوسرے سے مربوط ہوں یا کئی ہوں ایسے جن پر حد نافذ ہوتی ہو تو اس طرح سزا دی جائے گی۔

الف) اگر سزائیں ایک ہی جنس کی ہیں اور مقدار میں بھی برابر ہیں تو ایک ہی سزا دی جائے گی۔  
ب) اگر سزائیں تو متعدد الجنس ہیں لیکن مقدار میں تفاوت ہے تو ان میں سے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

ج) اگر سزائیں مختلف الجنس ہیں تو سب کی سب دی جائیں گی۔

۲۔ اگر مجرم کی طرف منسوب جرموں میں بعض ایسے دوسرے جرائم بھی ہیں جن کی سزا قانون عقوبات (لیبیہ) میں یا کسی اور قانون کے ماتحت موجود ہے تو حدود سابقہ بند کے ماتحت نافذ ہوں گی، لیکن دوسرے جرائم پر دی گئی سزائیں بھی معاف نہیں ہوں گی۔

۳۔ قتل کی سزا (موت کی سزا) چاہے وہ حد کی وجہ سے ہو یا قصاص کی صورت میں یا تعزیر کی شکل میں ساری دوسری سزاؤں کو ختم کر دے گی<sup>(۲)</sup>۔

(۱) یعنی حد اس وقت نافذ ہوگی جب اس کے نفاذ کی تمام شرطیں پوری ہوں لیکن شروع کرنے اور جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں شرعاً حد نافذ نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی فقہی تفصیل فقہی مضمون میں ”حرز“ سے متعلق بحث میں کروں گا۔ ایسی صورت میں مجرم کو بالکل معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ قانون عقوبات لیبیہ کے ماتحت سزا دی جائے گی۔

(۲) سزا کی ان بیان کردہ قانونی شکلوں میں سے بعض اکثر فقہاء میں متفق ہیں اور بعض میں معمولی اختلاف ہے جن کی تفصیل اس مختصر مقالہ میں چنداں ضروری نہیں، تفصیلی مضمون ہی اس کا محل ہو سکے گا۔



دفعہ ۱۳

## دوبارہ جرم کی صورت میں

۱۔ اگر مجرم نے ایسا جرم دوبارہ کیا جس پر اسے ایک بار عد ہو چکی ہے، سرقہ یا حرابہ کی شکل میں تو قتل کے جرم کے سوا، اس کو سزا جیل کی دی جائے گی<sup>(۱)</sup> اور عقوبت کی مدت ختم ہونے سے پہلے اسے رہا بھی کیا جاسکتا ہے اگر اس کی توبہ ظاہر ہو، آگے آنے والی دفعہ (نمبر ۱۲) کے احکام کی روشنی میں۔

۲۔ پھر اگر (تیسری بار) جرم کا اعادہ ہو تو اس کی سزا مؤبد (تاحیات)

(۱) حرابہ کے سلسلے میں تکرار جرم کی صورت میں تو فقہائے کرام کے نزدیک دوبارہ قطع نہ کیے جانے پر اتفاق ہے، لیکن دوبارہ چوری کرنے کی صورت میں مذاہب اربعہ میں دوبارہ بھی قطع ہے، ایسی مفسن نے مالکی عالم و فقیہ ابن عربی کے بیان کردہ اور تفسیر قرطبی میں بھی ابن عربی ہی کے حوالہ سے منقول، تابعی حضرت عطار کا قول یہ نقل کیا ہے اور اسی کو آسانی کی خاطر قبول کیا ہے، مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ آسان قول مذاہب اربعہ میں احناف و حنابلہ کا ہے، یعنی دوسری بار بایاں پیر کاٹا جائے گا لیکن تیسری بار قطع نہ ہوگا، اس کی شرعی دلیل مضمون میں دی جائے گی، استنباط و قیاس کے طور پر حرابہ میں ایک پیر اور ایک ہاتھ کٹنے کے بعد پھر قطع نہ ہونا بھی ایک نظیر یا عقلی دلیل کا کام دے سکتا ہے، دوسرے مذاہب میں تیسری بار چور کا بایاں ہاتھ اور چوتھی بار دایاں پیر کاٹا جائے گا، اور بھی اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں، اس مسئلہ کی مکمل تفصیل اور ائمہ فقہ کے دلائل کتاب و سنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں تبصرہ میں پیش کروں گا، کیونکہ یہ مسئلہ بھی مسئلہ نصاب کی طرح مذاہب اربعہ سے اخذ نہیں کیا گیا ہے۔

(باقی)

(۱) احناف کے نزدیک جب تیسری دفعہ قلع نہیں ہے تو سجن مؤبد ہے، لیکن اس کے ساتھ بھی توبہ کی شرط موجود ہے، شرح فتح القدر میں ہے، ”نان سوق ثالثاً لا یقطع بل یغور ویخلد فی السجن حتی یتوب او یموت“ (۴ - ۲۴۸) ایسی مقنن نے توبہ کی یہ شرائط فقہ حنفی کی رو سے دوسری بار کے جرم میں لی ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اور تیسری بار کی صورت میں سجن مؤبد کی شکل اختیار کی ہے، اور توبہ یعنی دنیاوی معافی اور جیل سے رہائی کی شرط ساقط کر دی ہے تاکہ چوبہ کے لئے دوسری بار چوری کرنے میں عدم قلع کی جو آسانی فراہم کی گئی تھی اس کا وہ ناجائز فائدہ نہ اٹھائے خدا کے دربار میں معافی تو ہر وقت ممکن ہے، مقنن نے اس طرح مزید چوری کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔

## اخبار التنزیل

قرآن اور حدیث کی پیشین گوئیاں

تالیف: مولانا الحاج محمد اسماعیل صاحب سنبھلی

اس کتاب میں قرآن پاک اور فرمودات نبوی کی پیشین گوئیاں پر اثر انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔ قرآن مجید اخبار غیب کا حامل ہے اس کی یہی خصوصیت اس کے کلام الہی ہونے کے دلائل میں ایک روشن دلیل بلکہ برہان قاطع ہے۔ ان کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی، پختگی اور قرآن کے کلام الہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں یقین و اذعان بختہ ہوگا۔ تقطیع متوسط ۱۸x۲۲ صفحات ۱۴۴

قیمت بلا جلد ۵/- مجلد ۶/-

ڈپٹی لائپتہ: ندوۃ المصنفین اسدو بانہ ارد جامع مسجد دہلی



# خلافت

از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب

زیر نظر مقالے میں مسئلہ خلافت پر جدید انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ  
بھکار مشہور سائنسٹ میں اہل تاریخی حالات اور واقعات کو سائنسی تجربے  
پر ہی پرکھتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے مسئلہ کا جس ڈھنگ سے تجزیہ کیا  
ہے اُس کی تفصیلات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ تاہم مضمون مختصر  
ہونے کے باوجود جامع بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ توقع ہے قارئین  
برہان مضمون کی اصل روح کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

(ع)

خلیفہ کے لغوی معنی پیچھے رہ جانے والا جانشین، وارث اور اولاد کے ہیں۔ اصطلاحی  
معنی جانشین اور نائب کے لئے جاتے ہیں۔ خدا نے جب فرشتوں سے فرمایا :  
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (میں زمین پر خلیفہ بنانیوالا ہوں)  
تو فرشتوں نے یقینی طور سے دونوں معنی سمجھے کیونکہ اُن سے پہلے جو خلیفہ تھے۔ انھوں نے  
زمین پر اپنی پوری ذمہ داری ادا نہیں کی تھی اور ناحق خون بہایا تھا۔ فرشتوں نے اس نئے  
خلیفہ کے بارے میں بھی یہی سمجھا۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ خلیفہ زیادہ صلاحیتوں کا مالک  
ہوگا۔ (فَلَمَّا اَنۡبَاہُمۡ بِاَسْمٰئِہُمۡ) تو ان کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس واضح ثبوت کے باوجود  
زیادہ تر لوگ خلیفہ کے معنی محض نائب کے لیتے ہیں۔ صرف چند لوگ آدم علیہ السلام کو

جن کا جانشین مانتے ہیں جو امرائلی علوم کے نفوذ کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں اس کا کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس خلیفہ کے معنی جانشین کے آتے ہیں۔ اس میں ایک زوال پذیر قوم کی جگہ ایک ترقی پسند قوم کو خلافت دے جانے کا تذکرہ آتا ہے۔

(۱) - ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ

(۴۱ ک یونس سورہ ۱۰)

(۲) - وَجَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ وَأَعْرَضْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (۴۳ ک یونس سورہ ۱۰)

(۳) - وَادْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (۶۵ ک الاعراف سورہ ۷)

انسانی وجود سے پہلے زمین کی آب و ہوا یعنی موسم سرما و گرما وغیرہ میں بہت کم اختلاف تھا۔ اور اس کے نتیجہ میں زندگی کے مسائل بھی پیچیدہ نہیں تھے۔ لہذا انسان سے کمتر مخلوق زمین پر خلافت کر سکتی تھی۔ مثال کے طور پر کسی ترقی یافتہ ملک کا ایک کم صلاحیت کا آدمی ایک غیر ترقی یافتہ ملک میں سفیر کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اور وہاں پر اپنے ملک کی نیابت بہت اطمینان سے انجام دے سکتا ہے۔ مگر ایک ترقی یافتہ ملک میں زیادہ صلاحیت کا ہی آدمی سفیر ہو سکتا ہے۔ تاکہ وہاں پر اطمینان سے اپنے ملک کی نیابت کر سکے۔ لیکن ایک ایسا ملک جو ترقی کی راہ پر گامزن ہو وہاں پر کسی سفیر کو زیادہ دنوں تک رکھنا اچھا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس ملک کی ترقی کے ساتھ ساتھ سفارت کے جانشین کو بدلتا پڑے گا۔ تاکہ جس ملک کا سفیر ہے اس کی صحیح نیابت ہو سکے۔ اس سے پہلے (برہان اگست ۱۹۷۷ء) یہ تذکرہ آچکا ہے۔ کہ جب حضرت انسان *Homo Sapiens* نے تمام دوسری انواع *Species* کو مات دیدی۔ تو اس وقت بھی ان کا میدان عمل محدود نہ ہوا۔ بلکہ آپس میں ہی سبقت لے جانے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ ان میں وہ گروہ یا قوم خلافت کی مستحق ہوئی۔ جس نے زمانہ سے بلند ہو کر علمی،



فوجی اور تہذیبی میدان میں نئی نئی ایجادات کیں۔ انہوں نے ان پر حکومت کی جو اپنے قدیم سنہرے دور پر فخر کرتے رہے اور اس کی ہر چیز سے چمٹے رہے۔  
 علمی، فوجی اور تہذیبی میدان میں انقلاب برپا کرنے کا ایک فطری تدریجی مہل ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ ہر انقلاب کے برپا ہونے سے پہلے اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب کوئی تہذیب عروج پر پہنچتی ہے۔ تو اس کی تمام خرابیاں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ اور اس وقت اسکی اصلاح کے لئے ایک نیا فلسفہ یا نظریہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے نیا فلسفہ اپنا مقام حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور زیادہ لوگ اس کو قبول کرنے لگتے ہیں۔ جیسے جیسے نئے فلسفہ کی مقبولیت بڑھتی ہے حکومت وقت اسے کچلنے کی کوشش کرتی ہے اگر نیا فلسفہ زیادہ جاندار ہوتا ہے اور اسے اس دور کے بہترین طرزِ بیان میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کو زیادہ اچھے کردار کے لوگ قبول کرتے ہیں۔ اور بہت وقت اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے دبا نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جو نئے فلسفہ کے پیرو ہوتے ہیں۔ حکومت کی پوری مشنری نئے فلسفہ کی روشنی میں رتب ہوتی ہے۔ اور ایک نئی تہذیب جنم لیتی ہے۔

اگر ہم تاریخِ عالم پر نظر ڈالیں تو مذکورہ بالا اصول کی حقانیت واضح ہو جاتی ہے یورپ میں جب جاگیرداری اور شہنشاہیت پر مبنی تہذیب اپنے عروج پر پہنچی تو اس کی اصلاح کے لئے روسو وغیرہ نے جمہوریت کا فلسفہ پیش کیا۔ یہ کچھ ہی دلوں میں اس قدر طاقت ور ہو گیا کہ اس نے سب سے پہلے فرانس میں نظامِ کہن کو خیر و بُن سے اکھاڑ پھینکا۔ جمہوریت، آزادی اور مساوات پر مبنی اس نظریہ نے یورپ اور شمالی امریکہ پر اپنے گہرے اثرات ڈالے۔ اور وہاں کے نظامِ حکومت کو یکسر

ہی بدل دیا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایشیا و افریقہ بھی بالآخر اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نوآبادیاتی نظام کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔  
ٹھیک اسی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جمہوریت پر مبنی بورژوا نظام جب تیز رفتار صنعتی ترقی کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور اس نے معاشی و سماجی عدم مساوات کو انتہا پر پہنچا دیا تو انجیلز نما کس وغیرہ نے ایک اور فلسفہ کو جنم دیا جسے ہم آج سوشلزم یا کمیونزم کے نام سے جانتے ہیں۔ اس فلسفہ نے تاریخِ عالم کا رخ کس طرح موٹا اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج اشتراکی ملکوں میں ایک نئی تہذیب کا دور دورہ ہے جس کی بنیادی اقدار سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی اقدار سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ نہ ہی یہ لکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔ اور اشتراکی ممالک میں اس سے انحراف کا رجحان اب ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انقلاب لانے کے لئے پہلے قابل قبول نظریہ ہونا چاہئے۔ دوسرے اُسے زمانہ کے مقبول ترین طرز میں پیش کیا جانا چاہئے یہی نہیں بلکہ خلافت بدلنے کے لئے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور دونوں میں سے کسی ایک پر زور دینا اور دوسرے کو قطعی طور پر نظر انداز کرنا ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف ہے جو احمائی تحریکوں کی عام خصوصیت ہے۔

قدیم زمانہ میں جب تبلیغ و اشاعت کے ذرائع بہت محدود ہونے کے ساتھ ساتھ نئے فلسفہ کی اشاعت پر کڑی پابندی ہوتی تھی تو نئے فلسفہ کا قدیم فلسفہ پر غلبہ میدانِ جنگ کے فیصلہ پر مبنی ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونانی فلسفہ کی مقبولیت سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد ہوئی اور اسلام کا پھیلاؤ مسلم سپہ سالاروں کی جنگی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہوا۔ ماضی قریب میں کمیونزم کی ترویج بھی سرخ فوج



کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ ہوئی۔

مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم نظریاتی حیثیت سے زیادہ مضبوط ہو لیکن فوجی حیثیت سے زیادہ طاقتور تو وہ زیادہ دلوں تک اپنی فوجی برتری کی بنا پر اپنا نظریہ نہیں منوا سکتی ہے۔ نازی ازم اور فاشزم کا حشر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے فوجی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے مضبوط نظریہ کو اپنانا پڑتا ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ منگول یا مغل جنہیں عام طور سے تاتاری کہا جاتا ہے وہ ایک آندھی کی طرح وسطی اور مغربی ایشیا پر بھاگے۔ انہوں نے بغداد کی اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تاتاریوں نے مسلمان کو شکست ضرور دیدی لیکن انہیں جلد ہی اس کا احساس ہو گیا کہ اپنی فوجی برتری کو برقرار رکھنے کے لئے زمانہ و علاقہ کے بہترین نظریہ کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے اسلام کو لبیک کہا۔

موجودہ زمانے میں جانشینی کی طرانی جسمانی کے بجائے زیادہ تر ذہنی ہو گئی ہے اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ اب بڑی حد تک میدان جنگ کے بجائے جمہوری الیوانوں میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں حقیقی جنگ الیکشن میں لڑی جاتی ہے۔ اور ہمیں کامیابی پر حکومت کی باگ و دوڑ کسی نظریاتی تحریک کے ہاتھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن جس طرح تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں فتیابی اور کامیابی اُسی کو نصیب ہوئی جو جدید آلات حرب سے مسلح تھا۔ اسی طرح الیکشن میں کامیابی جدید تکنیک کے اختیار کرنے پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ پھر حکومت کی پوری دشمنی بدلی جاسکتی ہے۔ اور اس تبدیلی سے ایک نیا طریق عمل وجود میں آ سکتا ہے۔ اور نئی تہذیب جنم پا سکتی ہے۔ اس کے پھلنے پھولنے کے مواقع نئے جانشین فراہم کر سکتے ہیں۔

## تبصرے

صوت الجامعہ (اردو) | تقطیع کلاں - صفحات ۸۲ کتابت و طباعت بہتر

سالانہ چندہ - ۶/۰ پتہ : دارالترجمہ والتالیف مرکزی دارالعلوم بنارس -

مرکزی دارالعلوم بنارس ابھی بالکل ایک نو عمر مدرسہ ہے۔ لیکن اس نہایت مختصر مدت میں بھی اس نے ہندوستان اور اس سے باہر عربی ممالک میں بھی خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کا باعث مدرسہ کے اساتذہ کی اعلیٰ لیاقت و قابلیت، تحقیق و جستجو کا ذوق، محنت اور خلوص ہے۔ چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ مدرسہ میں ایک دارالترجمہ والتالیف بھی قائم ہے جو محض برائے نام نہیں بلکہ ایک فعال ادارہ ہے اور مفید اور بلند کتابیں شائع کر رہا ہے، زیر تبصرہ مجلہ اس ادارہ کا ہی ترجمان ہے اس مجلہ کے عربی ایڈیشن کا تذکرہ برہان کی کسی اشاعت میں (غالباً) ہو چکا ہے یہ اس کا اردو ایڈیشن ہے اور اب تک ہمیں اس کے دو نمبر وصول ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ مجلہ اپنی اسی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا تو کوئی شبہ نہیں انڈیا پاک کے بلند پایہ اسلامی و تحقیقی مجلات و رسائل کی برادری میں اس سے ایک بڑا وقیع اور قابل قدر اضافہ ہوگا۔ مضامین سب کے سب سنجیدہ - متین اور بلند پایہ علمی و تحقیقی ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ سب لائق اساتذہ کے قلم سے ہیں۔ البتہ نمبر ۲ کا مضمون "تقلید کی فسوں کا ریاں" عصر حاضر کا ایک علمی اور تحقیقی مجلہ کے مرتبہ و مقام سے فروتر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مقالہ ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے لیکن یہ کیا



ضروری ہے کہ ہر مضمون کو شائستہ اعتنا سمجھا ہی جائے۔ آخر قرآن مجید کے حکم: "اذا مروا باللغو مروا کراماً" کے کیا معنی ہیں۔!! بہر حال ارباب ذوق کو ٹوٹا اور مدارس عربیہ کے طلباء اور اساتذہ کو خصوصاً اس مجلہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

(۱)۔ اسلام اور عصر جدید (انگریزی) تقطیع متوسط، ضخامت ایک سو آٹھ صفحات

کاغذ اور ٹائپ اعلیٰ سالانہ قیمت 30/-

(۲)۔ اسلام اور عصر جدید (اردو) تقطیع متوسط، ضخامت ایک سو آٹھ صفحات

کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ سالانہ قیمت 15/-

اسلام اور ماڈرن ایج سوسائٹی نئی دہلی کی طرف سے ملک کے مشہور اور بلند پایہ مصنف اور اہل قلم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی ادارت میں یہ دونوں سہ ماہی رسالے بڑی کامیابی سے کئی برس سے نکل رہے ہیں۔ جیسا کہ سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد اسلام کے ان مسائل و مباحث سے متعلق بحث و گفتگو کرنا ہے جن کو نہایت حاضر نے پیدا کر دیا ہے۔ یہ مسائل و مباحث قانونی اور فقہی بھی ہیں۔ کلامی بھی ہیں اور اقتصادی و سماجی بھی، اگرچہ یہ مسائل سیاسی بھی ہیں لیکن یہ سوسائٹی کے مقاصد سے خارج ہیں۔ اور حقیقت یہ بھی ہے کہ جن کو ہم سیاسی مسائل بھی کہتے ہیں۔ ایک بڑی حد تک ان کا تعلق اسلام کے قانونی، سماجی اور اقتصادی نظام سے ہی ہے۔ بہر حال یہ مسائل عالم اسلام کے عام مسائل ہیں اور ان پر عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں میں کثرت سے کتابیں اور مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان مسائل پر غور و خوض کا انداز اور طریق فکر ایک نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ علم الکلام اور فقہ کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ اس بناء پر ان مسائل نے عالم اسلام میں مختلف تحریکوں اور متعدد مکاتب فکر کو جنم دیا ہے۔ اسلام اور عصر جدید کے اردو اور انگریزی دونوں ایڈیشنوں میں کوشش کی جاتی ہے۔ کہ قارئین کو اسلام کے مسائل اور ان پر بحث کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے واقف کیا جائے

مضامین کا لب و لہجہ سنجیدہ اور متین اور علمی ہوتا ہے۔ خود فاضل مدیر کے مقالات اور آواؤ خاصہ کی چیز ہوتے ہیں۔ جن میں روشن خیالی اور بیدار مغزی کے ساتھ اعتدال پسندی کی جھلک ہوتی ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے سال دو سال میں بڑے پیمانہ پر مذہب اور اس کے متعلقات کے کسی موضوع پر آل انڈیا سیمینار بھی ہوتا ہے اور سیمینار کے منتخب مقالات بھی ان رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ غرض کہ یہ رسالے اپنے مقصد میں بڑے کامیاب ہیں۔ ارباب ذوق ان کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

**تحریر | تقطیع خورد ضخامت صفحات ۱۰۸۔ کتابت و طباعت بہتر۔ سالانہ قیمت ۱۵/- پتہ :- علمی مجلس ۱۲۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی ۶۔**

یہ رسالہ جناب مالک رام صاحب کی ادارت میں کئی برس سے نکل رہا ہے۔ اس کے سب مضامین اردو زبان و ادب سے متعلق بڑے بلند پایہ تحقیقی اور علمی مضامین ہوتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تنقید نگاری کی اس گرم بازاری کے دور میں یہ مجلہ محققین کا علم بلند کئے ہوئے ہے۔ اور نوجوانوں میں ادب کے مسائل پر سنجیدہ غور و فکر اور تلاش و تفحص کا ذوق پیدا کر رہا ہے۔ مضامین کے علاوہ خود لائق مدیر کے وفيات بڑے کام کے اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ جن سے موجودہ تاریخ ادب کے مصنف کو اب اور جیب بڑی مدد ملے گی۔

**مرتبہ جناب اعجاز صدیقی تقطیع کلاں ضخامت ۸۰ صفحات - شاعر کا سالنامہ | کتابت و طباعت اعلیٰ - قیمت پانچ روپیہ - سالانہ چنڈہ ۱۵/-**

**پتہ : شاعر قہر لادب بمبئی - ۸ بی - سی**

شاعر اردو زبان و ادب کا غالباً سب سے زیادہ معمر، وقیع اور بلند پایہ ماہر ہے۔ اس کا خاص نمبر خیر درخند خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نمبر بھی اپنی درمیانہ روایات اور خصوصیات کا آئینہ بردار ہے۔ اس میں نظموں، کہانیوں، غزلوں، طنز و مزاح



اور ملاموں اور باقیات کے ابواب کے ماتحت جو کچھ ہے مجبوری اعتبار سے ادبِ عالیہ کی فہرست میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ علاوہ ازیں بڑی بات یہ ہے کہ مقالات کا حصہ بھی بہت وسیع اور قابلِ قدر ہے۔ اس حصہ کے سب ہی مقالات اردو زبان کے نامور اہل قلم اور محققین کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور فکر انگیز معلومات افزا ہیں۔ تاہم جو مقالات ہمیں سب سے زیادہ پسند آئے وہ یہ ہیں۔ (۱)۔ جمالیات۔ فن کار اور قاری سید احتشام حسین۔ (۲)۔ اردو شاعری میں ہولی کارنگ، گیان چند، (۳)۔ مفروضہ ادبی اسکول، علی جواد زیدی (۴)۔ ہندوستانی موسیقی میں خیال کی اہمیت، عظمت حسین خاں میکش۔ (۵)۔ امیر گوٹروی کی شاعری، سلام سندیلوی (۶)۔ جدید شاعری میں وزن و آہنگ کے مسائل، کرامت حسین کرامت، اردو زبان کے اس دورِ ابتلا میں شاعر کی یہ وضع داری اور آندھیوں میں اپنے چراغ کی لوکھ نہ ہونے دینے کی ہمت اور حوصلہ بہت زیادہ لائق تحسین و آفرین ہے۔ درآنحالیکہ یہ مجلہ کسی انجمن یا ادارہ کا نہیں بلکہ تنہا ایک مشیتِ استخوان کی سعیِ سیہم اور جہدِ مسلسل کا مرثیہ احسان ہے۔

تبدائے ملت کا خاص نمبر | اخباری سائز، ضخامت ۶۶ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت ۱/۱۵، پتہ: دفتر ندائے ملت، لکھنؤ۔

ندائے ملت مسلمانوں کا ایک مقبول اور پسندیدہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ یہ اس کا خاص نمبر ہے۔ جو بڑے سلیقہ اور خوش اسلوبی سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مختلف مضامین میں ہندوستان میں کانگریس گورنمنٹ کے حالیہ عہد کا جائزہ زیادہ تر مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اور بعض مضامین میں ملک و قوم کے تمام نقطہ نظر سے لیا گیا ہے۔ جو کچھ لکھا، سنجیدگی سے اور اعداد و شمار کی روشنی میں لکھا ہے۔ اسلئے وہ ٹھوس بھی ہے اور موثر بھی، نظموں کا حصہ بھی خاصا طویل ہے۔ بعض مقالات بڑے فکر انگیز ہیں۔ مثلاً پروفیسر تیواری کا مضمون سوویت خارجہ پالیسی کا مطمح نظر کانگریسی قیادت کی پہلی، از مسٹر سہگل، یا تپنوں کا جہان از اندر مہسوترہ۔ امید ہے کہ قارئین اس کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

# برہان

جلد ۷ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۴

- ۱۔ نظرات  
مقالات  
۲۱۸ سعید احمد اکبر آبادی
- ۲۔ رسول اللہؐ کی ولادت  
(اعلان نبوت)  
۲۲۱ جناب ڈاکٹر خورشید احمد فائق صاحب  
پروفیسر عربی و ملی یونیورسٹی دہلی
- ۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی  
تقسیم کے بعد  
۲۲۴ سعید احمد اکبر آبادی
- ۴۔ پروفیسر آل احمد سرور کا ایک خط اور جواب  
۲۵۳ " " "
- ۵۔ مولانا آزاد لائبریری  
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ  
۲۵۴ مولانا محمد عبدالشامی خاں شروانی  
اسسٹنٹ لائبریری شعبہ مخطوطات  
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## نظرات

افسوس ہے گذشتہ ماہ کی ۲۵ تاریخ کو پروفیسر عبدالعید خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ مرحوم برصغیر کے اساتذہ عربی و اسلامیات میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، انہوں نے پہلے قاہرہ میں کئی برس مقیم رہ کر وہاں سے ڈی ہل کی ڈگری لی اور پھر کیمبرج سے پی ایچ ڈی کیا۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہوئے تو ایسے کہ ماری زندگی یہیں بیت دی، ابھی دو تین برس ہوئے وہ صدر شعبہ عربی کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے، ۳۵ برس سے اسلامیات کے مشہور اور بلند پایہ عالمی رسالہ ”اسلامک کلچر“ کے ایڈیٹر اور بارہ برس سے دائرۃ المعارف کے ناظم تھے، اس درمیان میں امریکہ اور یورپ کے جامعات میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، بیرونی ممالک کے بعض سفروں میں راقم الحروف اور وہ دونوں ہم سفر تھے، اخلاق و عادات کے اعتبار سے بہت سادہ اور منکسر المزاج تھے، اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی خرابی صحت کا شکار تھے اور اسی سبب سے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق عمر بھر مجروح رہے، لیکن جو کچھ لکھا ہے بہت خوب لکھا ہے، عمر ۶۶ برس کے لگ بھگ ہوگی، عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

کسی ایک ملک میں امن و امان اور حسن انتظام اور خصوصاً ہندوستان ایسے عظیم الشان ملک میں محض طاقت و قوت اور پولیس یا فوج کے بل بوتہ پر قائم نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس کے لئے شرط اولین یہ ہے کہ باشندگان ملک کے دلوں میں حکومت کا وقار، عزت و احترام اور اس پر پورا بھروسہ اور اعتماد ہو اور جس طرح نفرت اور محبت انسان کی نفسی کیفیات ہیں جو کسی خارجی دباؤ کے زیر اثر نہیں، بلکہ ایک شخص کے ذاتی اور اندرونی احساسات و تاثرات کا ایک طبعی ثمرہ اور نتیجہ

ہوتی ہیں، ٹھیک اسی طرح لوگوں کے دل میں حکومت کا وقار اور اس پر بھروسہ اور اعتماد خود بخود پیدا ہوتا ہے اس کو جبر و تشدد، طاقت و قوت کی نالائش، اور بار بار کے آزمائے ہوئے چکنے چوڑے وعدوں کے ذریعہ دل میں تہ نشین نہیں بنایا جاسکتا!

ایک حکومت کو وقار اور لوگوں کا اعتماد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں مندرجہ ذیل اوصاف کا فقدان نہ ہو:

- (۱) مخلص ہو، ایماندار ہو اور اس کا کیرکڑ اخلاقی عیوب و نقائص سے پاک ہو۔
- (۲) عزم پختہ اور ارادہ مضبوط ہو۔ جو ایک مرتبہ کہہ دیا اس سے پیچھے ہٹنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ جو وعدہ کر لیا اس کا پورا ہونا لازمی اور یقینی ہو۔
- (۳) جس کسی معاملہ پر غور کرے، کھلے دماغ سے کسی اپنے نفع اور نقصان کے اندیشہ کے بغیر کرے، مگر جب ایک بات کا فیصلہ کرے تو اب اس کے لئے اس سے پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو۔ بدقسمتی سے موجودہ گورنمنٹ اڈمنسٹریشن کے ان اوصاف و لوازم سے محروم ہے، اس بنا پر اندرونی خلفشار، ہیمان و اضطراب اور زبون حالی و ابتری کے باعث ملک کی جو حالت آج ہے، وہ کبھی نہیں ہوئی، ہر وہ شخص جو ناجائز ذرائع آمدنی نہیں رکھتا وہ محسوس کرتا ہے کہ اب زندگی اس کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، اور اگر اسے بوجھ کو ہٹا کر نا ہے تو اس کی صورت بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ بھی وہی کچھ کرے جو حکومت کے عامل و کارکنان، ساہوکار و کاندار، تاجر، صنعت کار، بنیہ بقال اور باقی سب کر رہے ہیں۔ یہ احساس اگر عام ہو جائے تو پھر امن و امان کی حفاظت اور قانون و ضابطہ کی پابندی نہ پولس کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور نہ فوج کے ذریعہ۔ نہ حکومت کی دھکیاں کارگر ہو سکتی ہیں اور نہ بعض خاص افراد کے حق میں جبر و تشدد کی نالائش ایسی وہ حالات ہیں جو ملک میں انارکی اور طوائف الملوک کے پیدا ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

لیکن ایک جہد یہ میں یہ حالات پیدا ہو جائیں تو اصلاً اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟



حکومت پر یا عوام پر؟ جمہوریت میں عوام جس طرح حکومت بناتے ہیں، اسی طرح وہ حکومت کو الگ بھی کر سکتے ہیں، گویا اصل طاقت عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن وہ اپنی طاقت کا بروقت اور صحیح استعمال اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں، انہیں معلوم ہو کہ دنیا میں دوسری قومیں کس طرح رہتی اور زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کی حکومتیں ان کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ نہیں کرتیں! برطانوی حکومت کے دو وزیروں سے جنسی بے راہ روی کا فعل صادر ہوا اور پبلک میں ان کا راز فاش ہوا تو دونوں کو وزارت سے استعفا دینا پڑا۔ اسی طرح فرانس میں آئے دن حکومتیں بدلتی رہی ہیں۔ امریکہ میں وائٹ گریٹ کا معاملہ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ برطانیہ میں ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کی حکومتیں برابر قائم ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں علامت ہیں اس بات کی کہ ان ملکوں کے عوام تعلیم یافتہ ہیں، بیدار مغز اور روشن خیال ہیں، وہ اپنے مسائل کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ حکومت کو دیسی یا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا نہیں کرتے، بلکہ اس کی حیثیت ان کی نگاہ میں ایک نمائندہ کی ہوتی ہے، اس لئے وہ حکومت کے رحم و کرم کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ خود حکومت کی نگاہ ان کی جنبش چشم و لب پر ہوتی ہے، آج کل ہمارے ملک میں جو حالات ہیں مثلاً اشیاء کی ہوش ربا گرانی، ضروریات زندگی کی نایابی، اشیاء اور ادویہ میں ملاوٹ، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے حوادث، انجینروں کی اسٹرائک، رشوت کی وہ گرم بازاری کہ اب اس کے بغیر قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں، امن و امان کا فقدان، دن و رات لٹ مار اور قتل، انفران حکومت میں جنسی بے راہ روی کے عام واقعات، طلباء میں ایک عام اور شدید قسم کی بے چینی! یہ سب حالات اس درجہ سنگین ہیں کہ اگر ان میں سے ایک واقعہ بھی دنیا کے کسی جمہوری ملک میں رونما ہوتا تو وہ وہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یا حکومت صورت حال کی اصلاح کرتی اور یا اسے مستعفی ہونا پڑتا مگر داد دیجئے یہاں کے عوام کو اور مبارک باد پیش کیجئے گورنمنٹ کو کہ ملک زخموں سے چھوڑا رہا ہے تو داغ بنا ہوا ہے، لیکن نہ حکومت استعفا دیتی ہے اور نہ حالات کی اصلاح ہوتی ہے، یہ صورت حال اس ملک کی تو ہین ہے، یہاں کے عوام کی تو ہین ہے اور پوری قوم کی پیشانی پر ایک سخت بدنامی ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی  
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلتے کا

# رسول اللہؐ کی ولادت

(اعلان نبوت)

(۳)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

جَلْبَشہ کے مہاجر مسلمانوں کو خبر پہنچی کہ اکابر قریش رسول اللہؐ سے مصالحت کر کے مسلمان ہو گئے ہیں نیز یہ کہ قرآن میں مورتیوں کو خدا کا مقرب اور اس کے دربار میں سفارشی مان لیا گیا ہے، وہ دو ماہ قیام کے بعد خوش خوش اپنے وطن مکہ روانہ ہو گئے، راستہ میں انہیں معلوم ہوا کہ اکابر کی رسول اللہؐ سے مصالحت ختم ہو گئی ہے، رسول اللہؐ نے پھر مورتیوں کی مذمت شروع کر دی ہے اور قرآن میں مورتیوں کے دربار خداوندی میں مقرب ہونے کی تردید کر دی گئی ہے، وہ جَلْبَشہ واپس نہیں ہوئے اور تحقیق حال کے لئے مکہ کا سفر جاری رکھا۔ مکہ پہنچ کر یہ لوگ اکابر قریش کے خاندانی، سماجی اور کاروباری شکنجہ میں کس گئے اور پہلے سے زیادہ سخت، انہیں جَلْبَشہ کی زندگی یاد آنے لگی، انہوں نے دوسرے مسلمانوں سے وہاں کی پُر آرام، بے آزار اور بے خطر زندگی کا ذکر کیا تو وہ بھی جَلْبَشہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس بائیں ہجرت کرنے والوں کی تعداد بچوں کو چھوڑ کر سو سے زیادہ تھی، ترائی مرد، ۱۱ مکہ کی قریشی اور سات باہر کی عورتیں، ان میں قریش کے ماتحت اور دست بگر لوگوں جیسے موالی اور علیفوں کا



تناسب کافی تھا۔ اکابر قریش پہلی ہجرت حبشہ کے بعد چکنا ہو گئے تھے اور جب دوسری ہجرت ہوئی تو انھوں نے بعض مہاجرین کو روکا، مارا پیٹا اور ان کا تعاقب کیا، پھر بھی وہ نکل ہی گئے۔ ان میں سے لگ بھگ نصف مہاجر چھ سات برس حبشہ میں رہے اور رسول اللہ کی مدینہ ہجرت کے بعد لوٹ آئے اور باقی نصف تقریباً پندرہ سولہ سال حبشہ میں مقیم رہے اور مکہ میں فتح خیبر کے موقع پر واپس ہوئے، حبشہ میں تجارت اور کاروبار ان کا خاص ذریعہ معاش تھا۔ اکابر قریش کو یہ بات ناگوار ہوئی تھی کہ نجاشی کی حکومت نے مہاجرین کی پہلی جماعت کو اپنے ملک میں پناہ دے کر ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تھا دوسری ہجرت کے بعد انھوں نے دو کار گزار قریشیوں عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کی قیادت میں نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا، یہ دونوں قریشی بارہا حبشہ کا سفر کر چکے تھے اور وہاں کے تاجروں سے ان کے مراسم تھے، وہ جب حبشہ جاتے تو نجاشی اور اس کے وزیروں کے لئے تحفے تحائف لے جایا کرتے تھے۔ اکابر قریش نے نجاشی اور اس کے وزیروں کے لئے ایک گرانقدر تحفہ بھیجا جس میں حجاز کے اعلیٰ چمڑے کا ایسا سامان بھی داخل تھا جس کی حبشہ میں بڑی مانگ اور قدر تھی۔ دوسری طرف ابو طالب نے قریش کے زعمیم اعلیٰ کی حیثیت سے نجاشی کو ایک منظوم خط ارسال کیا جس میں اس کی مدح سرائی کر کے مسلمانوں کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آنے کی درخواست کی تھی۔ عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی نے نجاشی کے وزیروں کی معرفت بادشاہ سے کہلایا کہ آپ کے ملک میں ہماری قوم کے بہت سے سر پھرے آگئے جنھوں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب اختیار کر لیا ہے جو آپ کے مذہب سے بھی مختلف ہے، یہ لوگ ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ بتاتے ہیں اور ہماری سورتیوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اگر انھیں ان کے عقائد سے نہ روکا گیا تو اندیشہ ہے کہ وہ آپ کا مذہب بدلنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری قوم کے اکابر چاہتے ہیں کہ آپ انھیں اپنے ملک سے نکال کر ان کے حوالہ کر دیں۔ نجاشی نے تحقیق حال کے لئے مہاجر مسلمانوں کے نمائندوں سے گفتگو کی، انھوں نے اس خوش اسلوبی سے رسول اللہ اور اسلام

کی حمایت و وکالت کی کہ نجاشی کے دل میں دونوں کا احترام پیدا ہو گیا، اس نے قریشی وفد کے لیڈر عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو سخت وسعت کہہ کر مسلمانوں کو ملک بدر کرنے سے انکار کر دیا۔

حبشہ میں اپنی ناکامی، مہاجر مسلمانوں کی سرخروئی اور نجاشی کے پُر حمایت موقف اور کہ میں رسول اللہؐ نیز ان کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی سے اکابر قریش کا اشتعال بڑھ گیا، ایک اور واقعہ نے اس اشتعال کو ہوا دی، یہ تھا عمر فاروق کا قبولِ اسلام، ان کا تعلق قریش کے ایک باعزت فلاندان سے تھا، اس وقت ان کی عمر چھبیس سال کی تھی، دہنگ اور جوشیلے آدمی تھے، ان کے لمبے چوڑے جسم، لال آنکھوں اور لمبی گھنی مونچھوں نے انہیں بڑا رعب دار بنا دیا تھا، وہ اب تک رسول اللہؐ اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے تھے، مسلمان ہو کر ان کی طبیعت کے جوش و خروش نے سمت بدل دی، پہلے وہ مسلمانوں اور مسلمان ہونے کا ارادہ کرنے والوں کو ڈانٹتے پھٹکارے تھے، ستاتے اور دھکیاں دیتے تھے۔ اب وہ ان لوگوں سے الجھتے، لڑتے اور جھگڑتے جو مسلمانوں کو صحنِ کعبہ یا اپنے گھروں کے باہر ناز پڑھنے یا آوازِ قرآن کی تلاوت کرنے یا کلمہ کھلا دعوت دیے سے روکتے تھے۔ عمر فاروقؓ کے اسلام سے رسول اللہؐ اور ان کی دعوت کو بڑی تقویت پہنچی۔

اکابر قریش ابوطالب سے پھر ملے اور کہا کہ ہم آخری بار آپ کے بھتیجے کے خلاف احتجاج کرنے آئے ہیں، ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، ہم پہلے بھی کئی بار آپ سے شکایت کر چکے ہیں کہ اپنے بھتیجے کو ہمارے آباؤ اجداد کی مذمت، ہماری مورتیوں پر لعن طعن، ہمارے بچوں، جوانوں، غلاموں اور موالیٰ کو گمراہ کرنے سے روکے، لیکن آپ نے اب تک ہماری درخواست درخور اعتناء نہیں سمجھی، اب ہم آخری بار آپ سے شکایت کرنے آئے ہیں، اگر آپ نے محمدؐ



کو ان کی سخت نامناسب سرگرمیوں سے باز نہیں رکھا تو ہم انہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ ابو طالب نے اکابر کی شکایت کا رسول اللہؐ سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیا جائے تب بھی میں اپنی دعوت نہیں چھوڑ سکتا اور اس کی خاطر جان دینے کو تیار ہوں۔ ابو طالب نے ان کا عزم دیکھ کر کہا: اطمینان رکھو میں تمہیں کبھی مخالفوں کے حوالہ نہیں کروں گا۔

قریش نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنی دعوت میں پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ ابو طالب نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی، وہ ابو طالب اور ان کے سارے خاندان سے سخت آزرده ہو گئے، ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور عہد کیا کہ جب بھی موقع ملے گا رسول اللہؐ کو قتل کر دیں گے۔ ابو طالب، ان کے بھائیوں اور بیٹوں نے دیکھا کہ قریش کے تیور بہت بدلے ہوئے ہیں اور وہ انہیں چلین سے مکہ میں نہیں رہنے دیں گے تو وہ اپنے سارے کنبہ کو لے کر شہر سے باہر شعب ابی طالب نامی گھاٹی میں منتقل ہو گئے، ایک اطلاع یہ ہے کہ اکابر قریش نے انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ انہوں نے ایک تحریر لکھوائی کہ ہاشمی جب تک محمد کو ہمارے حوالے نہیں کر دیں گے ہم ان سے بات چیت، میل جول، لین دین، شادی بیاہ سب بند رکھیں گے۔ انہوں نے ہاشمیوں کے پاس خور و نوش کا سامان لے جانے پر پابندی لگا دی۔ اعلان نبوت کے ساتویں سال سے دسویں سال تک تقریباً تین سال اور بقول بعض دو سال رسول اللہؐ نے شعب ابی طالب میں گزارے، اس اثنائے میں ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، مکہ کے غیر ہاشمی ممتاز مسلمانوں سے اُن کا رابطہ قائم رہا۔ مکہ کے مسلمان چھپا چوری اسلامی دعوت دیتے اور اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے۔ زبیر بن عبدالمطلب

۱۔ انساب الاشراف ۱/ ۲۲۹-۲۳۰

۲۔ انساب الاشراف ۱/ ۲۳۴، ابن سعد ۲/ ۲۰۸-۲۰۹، ابن ہشام ص ۲۳۰

کے بعد ابو طالب پر فادہ و سقایہ کے اداروں کے نگران اٹلی ہو گئے تھے، وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان تین سالوں میں انھوں نے یہ فرائض انجام دے یا نہیں، اس اثنائے میں وہ، اُن کے بھائی اور بیٹے صرف حج کے موقع پر مکہ میں نظر آتے ہیں۔ حج کے ایام میں رسول اللہ کی تبلیغی سرگرمیاں بڑھ جاتیں، وہ مقربوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان تہذیبوں کے سرداروں سے ملتے جلتے جوج کرنے آتے، انھیں اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن سناتے۔ ان سرداروں کو جب معلوم ہوتا کہ خود رسول اللہ کے قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا ہے تو وہ بھی اسلام لانے سے انکار کر دیتے۔

ہاشمی و مطلبی خاندان خوب مالدار تھے، وہ اپنا راس المال اور خور و نوش کا بہت سا ذخیرہ گھاٹی میں لے آئے تھے، آس پاس سے غلہ، دودھ، پھل، پانی اور دوسری ضروری اشیاء انھیں مل جاتی تھیں، ان کے بعض رشتہ دار بھی مکہ سے چھپا چوری ضرورت کی چیزیں بھیجتے رہتے تھے، فدیہ کے بھتیجے حکیم بن خزام بن خویلد گاہے گاہے اونٹ پر آٹا لاد کر گھاٹی کی طرف چھوڑ دیتے تھے، اس کے باوجود تین سال کے آخری ایام میں گھاٹی میں روپے پیسہ اور غلہ کا ایسا توڑ پڑ گیا کہ قانون تک نوبت پہنچ گئی۔ ہاشمیوں کی متعدد لڑکیاں خیر ہاشمی اکابر کے ہاں بیامی تھیں، انھیں اپنے ہاشمی عزیزوں کی تکلیف اور مسائل خور و نوش کی تنگی کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے شوہروں، لڑکوں اور رشتہ داروں پر دباؤ ڈالا کہ ہاشمیوں کو گھاٹی سے باہر نکال لائیں، کچھ سہارہ اور باہمت لوگ اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے۔ وہ مسلح ہو کر گھاٹی میں گئے اور ہاشمیوں و مطلبیوں کو نکال لانے پھر صحن کعبہ میں جو اکابر قریش کا اڈا تھا جا کر انھیں خبردار کر دیا کہ اگر انھوں نے ہاشمیوں کو شہر میں رہنے سے روکا تو وہ مع اپنے سارے کنبہ کے اعلان جنگ کر دیں گے۔ اپنے کیمپ میں پھوٹ پڑنے سے اکابر قریش کے ہاتھ کمزور ہو گئے اور انھیں بولنا خواہش ہوئی کہ



برداشت کئی پڑی۔ گھاٹی سے نکلنے کے کچھ عرصہ بعد پہلے ابوطالب اور پھر خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا، ان دونوں سے رسول اللہؐ کو بڑی تقویت تھی، ابوطالب ہر خطرہ میں رسول اللہؐ کی مضبوط ڈھال تھے اور خدیجہ آرام اور معاشی بے فکری کا سرچشمہ تھیں۔

اکابر قریش کی ختم نہ ہونے والی مخالفت اور قتل کے منصوبہ کے پیش نظر رسول اللہؐ کئی برس سے کسی طاقتور قبیلہ کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ وہ حج کے لئے آنے والے قبائلی سرداروں سے ملتے اور اسلام پیش کر کے ان کی حمایت طلب کرتے لیکن یہ سردار نہ اسلام قبول کرتے، نہ ان کی حمایت کے لئے تیار ہوتے۔ ابوطالب کے انتقال پر انہیں ایک طاقتور قبیلہ کی پشت پناہی اور زیادہ ضروری نظر آنے لگی۔ قریش کے بعد حجاز میں ثقیف سب سے زیادہ مالدار اور تمدن قبیلہ تھا، اس کی بود و باش طائف کے پہاڑی شہر میں تھی۔ قریش کی طرح ثقیف کا پیشہ بھی تجارت تھا، طائف میں چمڑا صاف کرنے کے کارخانے اور انگور کے باغ تھے، ثقیف کے تاجر اعلیٰ قسم کا چرمی سامان بناتے تھے اور بڑے پیمانے پر کشتش برآمد کرتے تھے۔ ابوطالب کی وفات کے چند دن بعد رسول اللہؐ طائف جا کر ثقیف کے اکابر سے ملے، انہیں بتایا کہ میں بنی ہون، میرا مقصد اسلام پھیلانا ہے، آپ لوگ مجھے اپنی حمایت میں لے لیجئے تاکہ میں سب عربوں تک اپنی دعوت پہنچا دوں، اس بات کا آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میں مذہب بدلنے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ اکابر بڑے روکھے پن سے پیش آئے اور بولے جب تمہارے قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا اور تمہیں پناہ نہیں دی تو تمہیں ہم سے اس کی توقع کیوں ہے۔ اکابر

۱۔ ابن سعد ۲/۱، انساب الاشراف ۲۳۶/۱

۲۔ طبری ۲/۲۲۹

۳۔ انساب الاشراف ۲۳۷/۱

کا اشارہ پا کر شہر کے کچھ جاہلوں نے رسول اللہؐ سے یہودہ باتیں کیں اور ان پر تہر مچیلے۔ رسول اللہؐ شہر سے باہر افسردہ و آزرده ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور کہا: مالک، اپنی بے بسی، بے چارگی اور لوگوں میں اپنی ناقدری کا تجھ سے شاکی ہوں، اے سب سے بڑے رحیم، بے سہارا کے مددگار تو مجھے کس کی حفاظت میں دے گا! طائف کا سفر رسول اللہؐ نے مخفی رکھا تھا تاکہ وہ اپنے آزار اکابر قریش کو علم نہ ہو اور اپنے لیے پالک زید بن عارضہ کے سوا کسی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ واپسی پر جب مکہ کے قریب پہنچے تو انھیں قریش کے خوف سے شہر میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی، وہ رک گئے اور زید کو ایک با اثر غیر ہاشمی چچا مطہم بن عدی بن نوفل کے پاس بھیجا کہ اپنی امان میں لے کر انھیں گھر پہنچا دیں، مطہم نے ہاشمیوں کو گھائی سے نکالنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مطہم، ان کے بھائی اور لڑکے مسلح ہو کر آگئے اور رسول اللہؐ کو اپنی حفاظت میں گھر پہنچا دیا۔

طائف کا سفر اعلان نبوت کے دسویں سال ماہ ذی قعدہ میں واقع ہوا، حج کا موسم شروع ہو چکا تھا، ہر طرف سے حاجی آرہے تھے، مجتہد، عکاظ اور ذومجاز میں ہاٹ لگے ہوئے تھے رسول اللہؐ مقررین کی ایک جماعت کے ساتھ ان ہاٹوں اور حاجیوں کے خیموں میں جلتے، مترب ان کا تعارف کراتے کہ یہ محمد بن عبد اللہ ہیں، قریش کے اس اعلیٰ خاندان سے جو حاجیوں کو کھانا اور پانی دیتا ہے، ان پر وحی آتی ہے۔ خدائے انھیں پیغمبر متوب کیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ دعوت اسلام دیتے، قرآن کی تلاوت کرتے اور کہتے کہ اگر توحید خالص نیز میری نبوت مان لو گے تو عرب اور مجسم پر تمھاری سیادت قائم ہو جائے گی اور آخرت میں جنت سے بہرہ ور ہو گے۔ پھر طائف و رقبیلوں کے اکابر سے ملے اور کہتے کہ مجھے اپنا مال



میں لے لو تا کہ میں خدا کا پیغام پہنچا دوں، اس کے بدلہ میں جنت اور دنیوی سر بلندی کا وعدہ کرتا ہوں، یہ اکابر نہ اسلام قبول کرتے نہ رسول اللہؐ کو اپنی حفاظت میں لینے کی حامی بھرتے، کوئی معذرت کے لہجے میں دونوں مطالبے رد کر دیتا، کوئی روکھے پن سے (نقیہ و محدث زہری) ان (نودس) سالوں میں رسول اللہؐ حج کے لئے آنے والے عرب قبیلوں میں گشت کیا کرتے قبائلی شرفار اور اکابر سے گفتگو کرتے اور کہتے مجھے اپنی پناہ میں لے لو اور میری حفاظت کرو، میں تمہیں ترک مذہب کے لئے مجبور نہیں کرتا، جو چاہے خوشی سے اسلام قبول کر لے، جو نہ چاہے میں اسے مجبور نہیں کروں گا، میں چاہتا ہوں کہ (اکابر قریش کی طرف سے) مجھے قتل کی جو دھمکی دی گئی ہے اس سے مجھے اپنی امان میں لے کر میری حفاظت کر و حتی کہ میں خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ فکان رسول اللہؐ فی تلک السنین یعرض نفسه علی قبائل العرب فی کل موسم ویکلم کل شریف قوم لایسألہم مع ذلک إلا ان یؤدوہ ویمنعوہ ویقول: لا اکوہ أحدًا منکم علی شئی، من راضی منکم بالذی ادعوہ الیہ فذلک ومن کزوہ لہم اکسوہ، انا اؤید ان تمخرونی فیما یدادنی من القتل حتی ابلغ رسالتیؐ۔

اعلان نبوت کے گیارہویں سال ایام حج میں رسول اللہؐ کی ملاقات مدینہ کے چھ سات زعمیوں سے ہوئی۔ مدینہ میں ایک دادا کی اولاد میں یمن کے دو قبیلے آباد تھے۔ اوس اور خزرج، ان میں کبھی کبھی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، پچھلے سال اوس کا ایک وفد مکہ آیا تھا، اس کا مقصد خزرج کے خلاف قریش سے معاہدہ کرنا تھا، رسول اللہؐ کو معلوم ہوا تو وہ وفد سے ملنے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ وفد نے کہا ہم قریش سے معاہدہ کرنے آئے ہیں مذہب بدلنے نہیں آئے۔ رسول اللہؐ ناکام واپس چلے گئے۔ وفد کا قریش سے معاہدہ

۱۔ ابن سعد ۲۲۲/۱ ۲۔ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ، مصر) ۳/۱۳۸

۳۔ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ، مصر) ۳/۱۳۸، انساب الاشراف ۱/۳۸۸

نہ ہوسکا۔ وفد کی مدینہ واپسی پر اوس کی خزر ج سے وہ جنگ ہوئی جو بعاث کے نام سے مشہور ہے جس میں طرفین کے متعدد بڑے لیڈر مارے گئے، اوس کو شکست ہوئی اور دونوں قبیلوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ اوس و خزر ج کے پڑوس میں کئی یہودی قبیلے آباد تھے۔ قینقاع، نصیر اور قرظہ جن سے ان کے ازدواجی و اقتصادی روابط نیز باہمی مدد کے معاہدے تھے۔ خزر ج کا جب ان سے لڑائی جگڑا ہوتا تو یہودی غصہ میں آکر کہتے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، اس کی قیادت میں ہم تمہاری اچھی طرح خبر لیں گے اور عادیارم کی طرح تمہیں نیست و نابود کر دیں گے۔ رسول اللہؐ نے خزر جی اکابر کو اسلام کی دعوت دی، قرآن پڑھکر سنایا، پناہ طلب کی اور اس کے عوض جنت کا وعدہ کیا۔ خزر جی اکابر نے اسلام سے دلچسپی ظاہر کی، ان میں دو حنفی موجد بھی تھے۔ اسعد بن ذرارہ اور ابوہشیم بن تیہان۔ اکابر کو یہودیوں کی پیش گوئی یاد تھی کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، انہوں نے کہا کہ ہمیں محمدؐ کو نبی مان لینا چاہئے ورنہ یہودی سبقت کر کے ان کی قیادت میں ہمارا صفایا کر دیں گے، وہ مسلمان ہو گئے، ان کا خیال تھا کہ اگر خزر ج اور اوس دونوں نے اسلام قبول کر لیا تو ان کی خانہ جنگی ختم ہو جائیں گی اور وہ رسول اللہؐ کی زیر قیادت متحد ہو جائیں گے، انہوں نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ہم آپ کو بخوشی اپنی امان میں لینے کو تیار ہیں لیکن اس وقت ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، پچھلے سال ہماری اوس سے لڑائی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ہمارے تعلقات بری طرح خراب ہو گئے ہیں۔ اگر اس وقت ہم آپ کو مدینہ لے جاتے ہیں تو امکان ہے کہ اوس کے اکابر مسلمان نہ ہوں اور آپ کو دونوں قبیلوں کا تعاون حاصل نہ ہو سکے، اس لئے ہم آپ سے معاہدہ کئے بغیر مدینہ جاتے ہیں، وہاں اوس و خزر ج میں آپ کی نبوت کا چرچا کریں گے اور اسلام کی دعوت دیں گے، امید ہے کہ دونوں قبیلے مسلمان ہو کر آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیں گے، اگلے سال حج کے موقع



پر آکر ہم آپ سے حمایت و حفاظت کا معاہدہ کر لیں گے۔ اکابر نے قبول اسلام کے بعد ان الفاظ میں بیعت کی : خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، ایک دوسرے پر جھوٹا الزام نہیں لگائیں گے، بھلے کاموں میں رسول اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کریں گے۔ ان شرائط کی پابندی کرنے والوں کے لئے رسول اللہ نے جنت کا ذمہ لیا۔ اسلام کی اشاعت اور قرآن کی تلاوت کے لئے رسول اللہ نے اپنے رشتہ کے ایک چچا زاد بھائی مصعب بن عمیر عہدہ کو خزرجی اکابر کے ساتھ کر دیا۔

مدینہ پہنچ کر خزرجی اعیان نے یہ چرچا شروع کر دیا کہ مکہ کے سب مشریف خاندان میں ایک نبی مبعوث ہوا ہے اور یہ وہی نبی ہے جس کی پیش گوئی پڑوس کے یہودی کیا کرتے تھے، انھوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بتایا کہ ہم نے اس قریشی نبی پر ایمان لا کر اسلام قبول کر لیا ہے، ہماری خواہش ہے کہ اوس و خزرج کے دونوں برادر قبیلے بھی اسے نبی تسلیم کر لیں تاکہ اس کی قیادت میں ہمارے لڑائی جھگڑے ختم ہو جائیں اور ہم اتفاق و اتحاد کی زندگی سے ہم کنار ہو سکیں۔ بہت سے اوسی و خزرجی ارباب خرد ایک عربی نبی کے مبعوث ہونے اور اس کی رہنمائی میں اپنی قبائلی عداوتیں، جھگڑے اور خون خرابے بند ہونے کے تصور سے خوش ہوئے اور اسلام لانے کو تیار ہو گئے۔ رسول اللہ کے فرستادہ مصعب بن عمیر مکہ میں رسول اللہ کی بیعت کرنے والے خزرجی اعیان کے ساتھ گھروں، جمعوں اور گلی کوچوں میں گشت کر کے لوگوں میں اسلام سے دلچسپی پیدا کرتے رہے، اگلا موسم حج آتے آتے مدینہ کے بہت سے اوسی و خزرجی عربستان ہو چکے تھے، کوئی گھرا لیا نہیں بچا جس کے ایک دو آدمی اسلام نہ لے آئے ہوں، البتہ چند قبائلی شافعیں ابھی متذنب تھیں اور اپنے مصلحت اندیش لیڈروں کے اذن کی منتظر

ان کے علاوہ بوڑھوں کی ایک جماعت جس نے عیسائی یا یہودی مذاہب کا مطالعہ کیا تھا یا ان سے متاثر تھی اپنے مذہب پر جمی رہی۔ حج کا وقت قریب آیا تو اوس و خزرج کے مشرؤہ دار مسلمان مکہ روانہ ہوئے، ان کے علاوہ دونوں قبیلوں کے پانچ سو غیر مسلم حاجی بھی تھے۔ مکہ کے باہر ان کے خیمے ڈیرے لگ گئے۔ رسول اللہؐ ان مشرؤہ داروں سے ملے اور انہیں ہدایت کی کہ کسی ممتاز قرشی سے ملاقات نہ کریں اور مناسک حج سے فارغ ہو کر رات کو عقبہ کی گھاٹی کے پاس بیعت کے لئے جمع ہو جائیں۔ قرارداد کے مطابق رسول اللہؐ عقبہ پہنچ گئے، ان کے ساتھ صرف ان کے چچا عباس بن عبد المطلب تھے جو خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے لیکن مصلوٰۃ اپنے اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ گفتگو کی ابتداء عباس نے کی، مدینہ کے مشرؤہ دار اعیان کو مخاطب کر کے انہوں نے کہا: آپ لوگوں نے محمدؐ کو اپنی حفاظت میں لینے کی پیشکش کی ہے، مکہ میں محمدؐ کا سارا (ہاشمی و مطلبی) خاندان اُن کا محافظ اور نگہبان ہے، خاندان کے وہ لوگ بھی ان کے محافظ ہیں جنہوں نے ان کا مسلک اختیار نہیں کیا ہے اور وہ لوگ بھی خونی رشتے اور بمقتضائے شرافت ان کی حمایت کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر نہیں ہیں، محمدؐ نے سوائے آپ کے اور کسی کی حفاظت میں رہنا پسند نہیں کیا ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ میں اتنی طاقت ہے، شجاعت ہے، جنگی بصیرت اور سارے عربوں کے مقابلہ میں محمدؐ کی حفاظت کا بل بوتہا ہے تو آپس میں مشورہ کر کے متفقہ فیصلہ کیجئے۔ اسی و خزرجی اعیان نے جن میں سے انسؓ خزرج کے تھے اور گیارہ اوس کے عہد کیا کہ ہم مدینہ میں رسول اللہؐ کی ان کے دشمن سے اسی طرح حفاظت و حمایت کریں گے اور ان کے لئے اسی طرح خون بہائیں گے جس طرح اپنے بال بچوں کے لئے۔ بیعت ہو گئی۔ رسول اللہؐ نے ستر اعیان سے بارہ نقیب (لیڈ) منتخب کئے، نو خزرج سے اور تین اوس سے، ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو

۱۔ ابن سعد ۱/۲۲۲-۲۲۳، انساب الاشراف ۱/۲۵۴

۲۔ ابن ہشام ص ۳۰۶



سب سے پہلے رسول اللہؐ پر ایمان لائے تھے، ہر نقیب اپنے زیر اثر فاندانوں کو رسول اللہؐ کا ناطہ رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ بقیوں کے انتخاب کے بعد بیعت کرنے والے اپنے اپنے خیموں و بیڑوں کو لوٹ گئے اور رسول اللہؐ اپنے گھر چلے آئے۔

بیعت سے متعلق ساری کارروائی اسے صیغہ راز میں رکھنے کے لئے پوری احتیاط کے ساتھ حاجیوں کے پٹاؤ سے دور عقبہ میں ایک تنہائی رات گزرنے کے بعد کی گئی تھی، اس کے باوجود قریش کو اس کی خبر ہو گئی، صبح کو ان کے کئی نمایندے بیعت کرنے والوں سے ان کے خیموں و بیڑوں میں جا کھلے اور احتجاج کیا کہ تم نے محمدؐ کو پناہ دی ہے اور ہم سے لڑائی کے لئے ان کی بیعت لی ہے جبکہ ہم کسی حالت میں تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔ بیعت کرنے والے خاموش رہے، ان کے کچھ دوسرے غیر مسلم ہم قوموں نے جو جج کے لئے آئے تھے اور عقبہ میں بیعت کی کارروائی سے ناواقف تھے بیعت کی تردید کی، قرشی اکابر عبداللہ بن ابی بن سلول سے ملے، یہ وہ شخص ہے جو ہجرت کے بعد رأس النافقین کہلایا، عبداللہ خنجر جی لیڈر تھا، سن رسیدہ، پختہ کار، بردبار اور صلح جو، وہ اپنی قوم کو بھلے مشورے دیتا تھا اور جنگ و قتال نیز بد عہدی و غداری سے روکتا تھا، اس کی قوم کا جوان، جوشیلا اور ابھرنے کا آرزو مند طبقہ اپنے عارضی مفاد اور شخصی مصالح کی خاطر جب چاہتا اس کا مشورہ نظر انداز کر دیا کرتا تھا، دو سال پہلے اس طبقہ کی ضد اور شخصی مفاد پرستی کے باعث جنگ باعث روکنے کے لئے عبداللہ کی ساری کوششیں ناکام ہوئی تھیں، اس کے باوجود عبداللہ مدینہ کا ایک بار سوخ لیڈر تھا جس کی عزت اس کی قوم کے لوگ ہی نہیں پڑوس کے یہودی بھی کرتے تھے، اس کے متبعین کا دائرہ کافی وسیع تھا، غالباً مدینہ کے ایک تنہائی باشندے بے چون و چرا اس کا حکم مانتے تھے، وہ اور اس کے پیروں نے اس بات کے حق میں

تھے کہ رسول اللہ مدینہ آکر رہیں اور نہ اس بات کے کہ اوس و خزرج انھیں اپنی پناہ میں لے کر ان کے دشمنوں سے لڑائی کا معاہدہ کریں۔ وہ اور اس کے قبعین کی خاصی بڑی جماعت حج میں شریک ہوئی تھی لیکن ان میں سے کسی کو اوس و خزرجی اکابر نے ہونے والی بیعت یا اس کے مضمون سے مطلع نہیں کیا تھا۔ قرشی اکابر نے عبداللہ سے پوچھا: کیا بیعت ہم سے لڑنے کے لئے کی گئی ہے تو اس نے جواب دیا: یہ بڑا سنگین معاملہ ہے، ایسے معاملہ میں میری قوم ضرور مجھ سے مشورہ کرتی، میرے علم میں اس طرح کی کوئی بیعت نہیں ہوئی ہے۔ **إِنْ هَذَا الْأَمْرُ جَسِيمٌ وَمَا كَانَ قَوْمِي لِيَفْتَا تَوْاعِلِيٍّ بِمِثْلِ هَذَا وَمَا عَلِمْتُهٗ**۔ ابن سعد ۲۲۳/۱ — **هَذَا أَبَاطِلٌ وَمَا كَانَ هَذَا وَمَا كَانَ قَوْمِي لِيَفْتَا تَوْاعِلِيٍّ بِمِثْلِ هَذَا، وَلَوْ كُنْتُ بِيَثْرَبَ مَا صَنَعَ هَذَا قَوْمِي حَتَّى يُؤَامِرُونِي**۔ رسول اللہ کو عقبہ کی بیعت سے بڑا اطمینان ہوا، کیونکہ انھیں اپنی پشت پناہی کے لئے ایک بہادر، لڑائی میں مشاق اور مسلم قبیلہ مل گیا۔

عقبہ میں بیعت کرنے والے اوس و خزرج کے ستر زعمیوں نے مدینہ واپس آکر اپنی قوم کو بیعت اور اس کے مضمون سے مطلع کیا اور بڑے پیمانہ پر مسلمان بنانے کی ہم چلا دی، ہم پھلتے پھولنے لگی، چند سفوتوں میں سینکڑوں اوس و خزرجی مسلمان ہو گئے۔ اس زمانہ میں عبداللہ بن ابی اوس کے قبعین بھی اسلام لے آئے، خوشی سے نہیں عقبہ میں بیعت کرنے والوں کے دباؤ میں اور اس خوف سے کہ اگر انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تو مدینہ کی مسلمان اکثریت ان کا سماجی بائیکاٹ کر دے گی اور ان کے لئے چین سے جینا مشکل ہو جائے گا۔ عبداللہ کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر وہ مسلمان نہیں ہوا تو دونوں قبیلوں کے ابھرنے کے آرزو مند دوسرے اور غیرے درجے کے لیڈر مخالفانہ رویہ اختیار کریں گے اور اس کے قبائلی رسوم کو کاری ضرب لگے گی۔

(باقی)



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

## تقسیم کے بعد

(۱۳)

از سعید احمد اکبر آبادی

یہ رپورٹ جو باریک ٹائپ کے ایک سو چوالیس مطبوعہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے چٹرجی کمیٹی کی رپورٹ بہت مفصل اور مبسوط ہے اور اس میں یونیورسٹی کے ہر شعبہ افسر کے ہر کام کا جائزہ بڑی تحقیق و تدقیق اور جزئیاتی استیعاب و استقصاء کے ساتھ لیا گیا ہے اور اعتراضات کھجے کم و کاست بیان کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کی روشنی میں ایک ایک اعتراض سے متعلق اپنے رائے پیش کی گئی ہے، اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو اہم فیصلے کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

بڑے حدود کے ساتھ اعتراض کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی میں لاکھوں روپیہ کا غبن اور خیانت ہے۔

مالیات | انجینئرنگ کالج کی لاکھوں روپیہ کی مشنری پاکستان منتقل کر دی گئی ہے، معمولی جائیدادیں بھاری قیمت دے کر خرید لی گئی ہیں، کمیٹی نے بتایا ہے کہ حسابات کی جانچ پڑتال اور رجسٹروں اور دو چروں کی حفاظت ان کے باقاعدہ اور اپ ٹو ڈیٹ رکھنے اور آڈٹ کے اعتراضات کا بروقت جواب دینے میں غفلت ضرور ہوئی ہے جس کا ایک سبب تقسیم بھی ہے جس نے یونیورسٹی کا پورا نظام فنانسنگ ہی درہم برہم کر دیا اور ایک اخراجات کی کیفیت پیدا کر دی تھی، لیکن آخر میں کمیٹی کہتی ہے:

”ہم یہ ضرور کہیں گے کہ شروع میں ہم یونیورسٹی کے حساب کتاب کے معاملہ میں عدد درجہ غیر مطمئن اور مشکوک تھے، لیکن جب آڈٹ کے اعتراضات ہم نے یونیورسٹی کے ذمہ دار اصحاب کے سامنے پیش کئے اور ان سے جواب طلب کیا تو انہوں نے بڑی جدوجہد اور تلاش کے بعد وہ مطلوبہ رکارڈ فراہم کر لئے جن کے متعلق خیال یہ تھا کہ گم ہو گئے ہیں اور چند ہفتوں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اتر پردیش کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے جو اعتراضات ۱۹۶۶ء کے ماہ ستمبر تک تھے تقریباً ان سب کا تشفی بخش جواب مل گیا ہے اور ہم نے دیکھا کہ رکارڈ صحیح اور حوں کے توں ہیں۔“ (ص ۲۸)

اقربانوازی اور فرقہ پرستی کے اعتراضات جن کو پارلیمنٹ میں اور فرقہ پرست اخباروں میں بڑے زور شور سے اچھالا گیا تھا۔ کمیٹی نے ان کی بھی تردید کی ہے اور وہاں غیر مسلم طلباء اور اساتذہ کے ساتھ یونیورسٹی برادری کا جو معاملہ ہوتا ہے اس کی بڑی تعریف کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ”طلباء کا داخلہ“ کے زیر عنوان باب ہشتم میں کمیٹی نے یونیورسٹی کی تاریخ اس کے اغراض و مقاصد اور اس کے طریق کار پر بڑی سیر حاصل اور جامع گفتگو کی ہے اور جو کچھ کہا ہے بڑی صفائی سے اور کھلے دل سے کہا ہے، چونکہ یہ باب بہت اہم ہے اور یونیورسٹی کے دستور کے لئے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے ہم جستہ جستہ اس کے بعض حصوں کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کرتے ہیں:

”اب ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کا جو اصل مقصد تھا اس سے بحث کرتے ہیں، تاریخ | کہ یہ کچھ طلباء کے داخلہ کا براہ راست تعلق اسی مقصد سے ہی ہے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جب کبھی طلباء کے داخلہ کا سوال پیدا ہوگا اس پر غور کرتے وقت یونیورسٹی کی تاریخ اور اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر دینا ممکن نہ ہوگا۔ یہ یونیورسٹی عالم جو میں کیسے آئی؟ یہ سب کو معلوم ہے، ۱۹۵۴ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت



ہو گئی تھی، عظیم مصلح اور مفکر سرسید نے ان حالات کا جائزہ لینے اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلمان مغربی تعلیم کے بغیر اس قومیت و پستی سے باہر نہیں آ سکیں گے جس میں حالات نے انہیں گرا دیا ہے، ساتھ ہی سرسید کے عقیدہ میں اسلام ایک عظیم ترقی پسند طاقت تھا، اس بنا پر سرسید نے منصوبہ بنالیا کہ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں کے مسلمان طلباء کو اسلامی مذہب اور اس کے روایات کی بھی تعلیم دی جائے، اس مقصد کے لئے (مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد) انہوں نے ایک اسکول قائم کیا جس کے افتتاح کی رسم ۲۳ مئی ۱۸۶۵ء کو منائی گئی۔ ۸ جنوری ۱۸۶۷ء کو وائسرائے لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں ورود کیا اور کالج کا سنگ بنیاد رکھا، یہ وہی کالج ہے جس کے مقدر میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کا مرکز ہونا لکھا تھا، ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال سے پیشتر ہی ہندوستان کے تعلیمی نظام میں اس کالج نے اپنا ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک شروع ہوئی، اس سلسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی، اور آخر ۱۹۲۰ء میں مرکزی حکومت کی مجلس قانون ساز نے ایک ایکٹ پاس کر کے اس کالج کو یونیورسٹی ہونا منظور کر لیا، یہ کالج جو اب یونیورسٹی بن گیا تھا تمام تر پبلک کے چندوں اور ان کے عطیات سے چلتا رہا تھا اور ان عطیات کے دینے والوں میں غیر مسلم بھی شریک تھے۔

آپ نے دیکھا! کمیٹی نے کس صفائی اور جرأت سے اصل حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ (۱) یہ کالج مسلمانوں کے لئے قائم کیا گیا تھا (۲) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ مذہب اسلام اور اسلامی روایات کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا تھا (۳) یہ کالج مسلمانوں کے روپیہ سے بنا تھا گو بعض غیر مسلم بھی ان کے ساتھ شریک تھے (۴) پھر جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنی تو وہ کوئی نئی چیز نہ تھی، بلکہ یہی کالج تھا جس کو اب اس کی اپنی روایات اور خصوصیات کے ساتھ یونیورسٹی کا مرتبہ و مقام دے دیا گیا تھا (۵) چنانچہ جس ایکٹ کی رو سے یہ کالج یونیورسٹی بنا یعنی ۱۹۲۰ء کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ اس میں اغراض و مقاصد کے زیر عنوان ان سب

حقائق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایکٹ کا منظور کرنا یا اس میں کسی قسم کی ترمیم و تسیخ کرنا پارلیمنٹ کے واسطہ سے حکومت کے اختیار میں ہے، لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اس بنا پر ایکٹ میں کوئی رد و بدل ان کی رضامندی کے بغیر اخلاقاً تو درست ہوگا ہی نہیں، دستور میں اقلیتوں کے تحفظات کی جو دفعہ ہے اس کی رو سے قانوناً بھی معتبر نہیں ہوگا۔

شعہ کے ایکٹ کے بعد جو ملک کے حالات بدلے تو شعہ کا ایکٹ بنا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ایکٹ مسلمانوں کی مرضی سے بنا۔ کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت وزیر تعلیم تھے اور اس ایکٹ کو جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ اور دوسرے مسلم اداروں نے تسلیم کر لیا، اس کے خلاف نہ کوئی تحریک چلی، نہ احتجاج ہوا، اور نہ کوئی ایجنسی ٹیشن مہم۔ اکاؤنٹ کسی اخبار نے کچھ لکھا ہو یا کسی نے کچھ کہا ہو تو اس کی حیثیت شخصی اور ذاتی رائے کی ہے، اس کو مسلمانوں کی رائے عامہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔

ایکٹ شعہ کی نسبت | لیکن سوال یہ ہے کہ شعہ کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار کیٹی کی رائے | بدایا نہیں؟ اس کے جواب میں کمیٹی نے صاف کہا ہے کہ نہیں بدلا، چنانچہ کمیٹی کہتی ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ ان چند اہم ترمیمات کے باوجود جو شعہ کے ایکٹ میں کی گئی ہیں شعہ کے ایکٹ سے یونیورسٹی کا اقلیتی کردار قانوناً نہیں بدلا۔ اور حکومت کی روز افزوں مالی امداد سے بھی اس کردار پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیرالا ایجوکیشن بل کے سلسلہ میں سپریم کورٹ نے جو فیصلہ کیا تھا اس نے قطعی طور پر اس معاملہ کو طے کر دیا ہے، فاضل ججوں نے کہا ہے: کوئی تعلیمی ادارہ عملی طور پر گورنمنٹ کی مالی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا، اور اگر امداد کی شرط یہ قرار دی جائے کہ اس تعلیمی ادارہ کو اپنے حقوق سے دست بردار



ہونا پڑے گا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دفعہ (۱) 35 کے ماتحت دستور نے اس ادارہ کے لوگوں کو جو حقوق دئے ہیں وہ سلب کئے جا رہے ہیں“ اس کے بعد فاضل ججوں نے اس پر بحث کی ہے کہ اگر کسی خاص فرقہ کی تعلیم گاہ میں کسی دوسرے فرقہ کے طلباء کا داخلہ ممنوع نہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اب یہ تعلیم گاہ خاص اس فرقہ کی نہیں رہی طلباء کے داخلہ کے معاملہ میں ایک یونیورسٹی کس درجہ مختار ہے ؟ اس سلسلہ میں فاضل ججوں نے مسٹر جسٹس فرنیگرٹر (Mr. Justice Frankfurter) نے امریکہ کے ایک اسی قسم کے معاملہ میں جو فیصلہ دیا تھا اس کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ : ”یونیورسٹی کے لئے چار چیزوں کی مکمل آزادی ضروری ہے (۱) ایک یہ کہ کون پڑھائے گا (۲) دوسرے یہ کہ کیا پڑھایا جائے گا (۳) تیسرے یہ کہ کس طرح پڑھایا جائے گا (۴) چوتھے یہ کہ کس کو پڑھایا جائے گا۔ یہ چار قسم کی آزادی ہر یونیورسٹی کا بنیادی اور ضروری حق ہے اور ریاست کا فرض ہے کہ ان کا احترام کرے“ یہ عبارت نقل کرنے کے بعد جج جی کیٹی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رائج الوقت داخلہ کی پالیسی پر بحث کی ہے اور پھر اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”بیشک یونیورسٹی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے ہال کے فرسٹ ڈویژن اور سکنڈ ڈویژن جن کے نمبر 55 ہوں ان کو دوسری جگہوں کے امیدواروں کے مقابلہ میں داخلہ کے معاملہ میں ترجیح دے ، علاوہ ازیں جب ایک طالب علم ایک یونیورسٹی میں داخل ہو جائے گا تو اب وہ یونیورسٹی کے گروہ کا ایک مستقل ممبر ہو جائے گا اور اس بنا پر اب اعلیٰ کلاسوں میں داخلہ کے لئے اس کو از سر نو جدوجہد نہ کرنی ہوگی۔ جس وقت یہ رپورٹ لکھی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی میں غیر مسلم طلباء کی تعداد 35٪ تھی اور اس کو کمیٹی نے بہت معقول تعداد قرار دیا ہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی میں مستقل طور پر مسلم اور غیر مسلم طلباء کی تعداد کا تناسب بھی مقرر کر دیا جائے تو کسی شخص کو سکولرزم اور جمہوریت کی آڑ لے کر اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہونا چاہئے ، لیکن ساتھ ہی جیسا کہ کمیٹی نے کہا ہے۔ اگر یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز

نہیں ہو سکتا کہ اس میں ایرے غیرے نہ تو خیرے ہر مسلمان کو داخلہ مل سکتا ہے، بلکہ یونیورسٹی کی عظمت اور اس کے بلند مقاصد کا تقاضا ہے کہ اس میں داخلہ کی شرط کو سخت کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ اس میں داخلہ کے لئے فرسٹ ڈویژن یا سکند ڈویژن، پچپن فیصدی نمبروں کے ساتھ کی شرط رکھی گئی ہے۔

کیٹی نے بہر حال یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس یونیورسٹی میں مسلمان طلباء کثرت سے داخلہ لیں گے۔ کیونکہ یہاں مسلمان طالب علموں کے لئے تعلیم، رہائش اور اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق تربیت کی جو سہولتیں اور آسانیاں میسر ہیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں، کیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ: ہمارے سامنے جن حضرات نے اپنے بیانات دئے ہیں ان میں متعدد لوگوں کی زبان سے یہ معلوم ہوا کہ دوسری یونیورسٹیوں میں مسلمان طلباء کو داخلہ بہت کم ملتا ہے۔ کیٹی نے اس پر اپنے دل دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے اور گورنمنٹ سے سفارش کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں فوری ضروری اقدام کرے۔

اساتذہ کے تقرر کے ذیل میں کیٹی نے یونیورسٹی کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ مضمون کی لیاقت و قابلیت اور درس کی صلاحیت میں برابر ہونے کے باوجود یونیورسٹی ایک ایسے شخص کا انتخاب کرے جو علی گڑھ کے ماحول، کلچر اور اس کی روایات سے مانوس ہو۔

کیٹی نے اس امر پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ فرقہ پرست اخبارات مسلم یونیورسٹی پر بے بنیاد الزامات عائد کر کے اکثریت کے ذہن کو اس کی طرف سے مسموم کر رہے ہیں۔ غرض کہ چٹرجی کیٹی کی یہ رپورٹ آزادی اور تقسیم کے بعد مسلم یونیورسٹی کی قانونی حیثیت کو متعین کرنے کی راہ میں ایک مینارۂ روشنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کا مقام تاریخی دستاویز کا ہے، وزیر تعلیم ڈاکٹر فریالی جس ڈھب کے آدمی تھے اس کی وجہ سے اسے منظور کرنے کے حق میں نہیں تھے، لیکن گورنمنٹ نے اسے منظور کر لیا۔ یہ اہم دستاویز چونکہ زیدی صاحب



کے عہد میں تیار ہوئی ہے اور یونیورسٹی پر جو اعتراضات کئے جاتے تھے یونیورسٹی کی طرف سے ان کے معقول اور حقیقت افروز جوابات کے بہم پہنچانے کا کام انہیں کی ان تھک سامی، بیدار مغزی اور حس انتظام و تدبیر کامرہون احسان ہے۔ اس بنا پر اس کا کریڈٹ زیدی صاحب کو ملنا چاہئے۔

سر سید نے کالج کے مقصد تعلیمی اعتبار سے دو بتائے تھے (۱) انگریزی نیکلٹ آف تھیالوجی کی ترقی اور علوم جدیدہ کی تعلیم (۲) اسلامی دینیات کی تعلیم، اور درحقیقت دنیا کی تعلیم ہی اس کالج کی نمایاں اور امتیازی خصوصیت تھی، کیونکہ انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم تو ہر کالج میں ہوتی ہی ہے اور وہ اسی مقصد کے لئے قائم کئے جاتے ہیں، اسی طرح عربی فارسی کی تعلیم بھی ہر کالج میں ہوتی، لیکن دینیات کی تعلیم کسی بھی کالج میں نہیں ہوتی، لیکن مسلمانوں کے ذہنی انحطاط اور مذہب کے متعلق ان کے محدود اور تنگ نظریہ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مقصد اول میں کالج خوب پھلا پھولا یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کی ایک نئی اور عظیم نسل پیدا کی، لیکن مقصد ثانی کے متعلق سر سید کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ سر سید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا حالی، مولوی طفیل احمد منگلوری اور محمد اکرام ندوی، سب اس پر افسوس کرتے رہے ہیں کہ کالج اور پھر یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کبھی خاطر خواہ اور یونیورسٹی کے نمایاں شان نہیں ہوا۔ یہاں اس مضمون کو نظر بد سے بچنے کے تعویذ سے زیادہ کبھی کوئی اہمیت نہیں ہوئی، اس مضمون کا درس دینے والوں کا احترام ہوتا تھا! لیکن ٹھیک ٹھیک وہ احترام جو ایک گلکٹر کمشنر یا بیرسٹر بیٹا اپنے بوڑھے، جاہل اجڑ اور دیہاتی باپ یا چچا کا کرتا ہے، اس کا نصاب ”راہِ نجات“ اور ہستی زیور کے مسئلے مسائل سے آگے نہیں بڑھا۔ اس مضمون کے امتحان میں کامیابی کا معیار اس سے زیادہ نہیں تھا کہ طالب علم نے سورہ فاتحہ یا کوئی اور سورت جو عام طور پر نماز میں پڑھی جاتی ہے زبانی سنائی

ہے۔

زیدی صاحب کے عہد کو اس حیثیت سے عہد آفریں کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا یہ خواب یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ اس عہد میں اپنی تکمیل کی منزل کی طرف بڑھنا اور سرسبز و شاداب ہونا شروع ہوا اور بارہ برس کی مدت میں وہ یونیورسٹی کے چمن کا ایک شجر بار آور بن گیا۔

لیکن جو کچھ ہوا بے سبب نہیں ہوا، اس کی جڑیں بہت گہری اور دوسری دنیا کا تصور ہیں اور اس کا دار و مدار صرف اس ایک بات پر ہے کہ دنیا کی اصل تصور اور اس کی تعریف کیا ہے؟ قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں پہلے دنیا کی اصل تصور اور اس کی حقیقت معلوم کر لیجئے، بدقسمتی سے عام مسلمانوں کا کیا ذکر! اچھے خاصے لکھے پڑھے اور بہت سے علماء تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اسلام نام ہے چند عبادات اور چند اخلاقی تعلیمات اور چند خاص معتقدات کا، بس یہی چند چیزیں ہیں جو ایمان و کفر کے درمیان ایک حد فاصل ہیں اور ان پر عمل کر لینا انسان کو جنت کا حقدار بنا دیتا ہے اس بنا پر جو چاہے کیجئے، مگر نماز روزہ کی پابندی کرتے رہئے، خیر خیرات کیجئے، تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو جائیے، کسی ایک بزرگ کا مرید بن کر سب کچھ ان کی خدمت کے لئے وقف کر دیجئے، اور بزرگوں کے نزاعات پر جو عوس ہوتا ہے اس میں شریک ہو جئے، سیرت کے جلسے بلکہ کانفرنسیں بڑی دھوم دھام سے منعقد کرائیے، اور واعظین کو رام کو گراں قدر نذرانے پیش کر دیجئے، اگر آپ دولت مند ہیں تو اس سے بحث نہیں کہ دولت کس طرح کمائی ہے وہ جائز ہے یا ناجائز، بہر حال سال میں کم از کم ایک عمدہ اور ہر برس ممکن نہ ہو تو دوسرے تیسرے برس ایک حج ضرور کرتے رہئے، بس یہ چند اعمال و افعال ہیں ان کی وجہ سے آپ دنیا میں بھی سرخو رہیں گے اور

دیکھئے پروفیسر حمید الدین مرحوم کا معنون مجلہ علوم و ادب، ج ۱، نمبر ۱۱



آخرت میں بھی ! یہی اسلام ہے اور یہی دین ! اب اگر کروڑوں انسان بھوک پیاس سے مر رہے ہیں، جہالت و نادانی کا شکار ہیں، دنیا کے کروڑوں غریبوں کا خون سرمایہ داری کی جونک چوس رہی ہے، تہذیبِ فرنگ نے انسان کو برہنہ کر دیا ہے اور وہ عریانی و فحاشی کے چور ہے پر کھڑا نگاناچ ناچ رہا ہے۔ آمرانہ ذہنیت نے جمہوریت کے دعاوی کے باوجود رنگ و نسل اور مذہب و قومیت کے امتیاز کے بغیر کروڑوں بندگانِ خدا کو اپنی سیاست کے شکنجہ میں جکڑ کر زندگی کی ان آسائشوں سے محروم کر دیا ہے جو پروردگارِ عالم نے ان کے لئے پیدا کی تھی تو یہ سب کچھ ہوا کرے، اگر آج غلط طرزِ فکر، غلط اقدار کی پرستش اور صحیح اقدارِ حیات سے روگردانی کے باعث انسان کے سر پر قیامتیں اور ہلاکتیں منڈلا رہی ہیں تو ہوں ! ایک مسلمان کو ان سے کیا واسطہ ! یہ سب تو سیاسی اور دنیوی مشغلے ہیں۔ صلاح و تقویٰ اور طہارتِ نفس کو ان چیزوں سے کیسا تعلق ! مانا کہ قرآن میں خدا کو ربِّ العلین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت اللعالمین فرمایا گیا ہے، مگر اس کے یہ معنی کہاں ہیں کہ ہمارے لئے مسلمان ہونے کے ناطے دنیا کے تمام انسانوں کی جسمانی اور باطنی، مادی اور روحانی، دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کے لئے وہ تمام کام کرنے ضروری ہیں جو اللہ کی ربِّ العالمین اور آنحضرت صلی اللہ کے رحمت کو نین ہونے کے طبعی مظاہر ہیں، ہم ہر نماز کے بعد اپنی فتح و نصرت اور ظالموں کی تباہی و بربادی کے لئے دعا تو کر لیتے ہیں ! تو کیا یہ کافی نہیں ہے، اور کیا اس سے ہمارے خیرِ ائم اور امت وسطاً ہونے کا مقصد پورا نہیں ہوتا ؟ ظاہر ہے جب اسلام کا تصور یہ ہو تو اس کی دینیات کا نصاب بھی اسی ذہن کا آئینہ دار ہوگا۔ اس میں نہ وسعت ہوگی اور نہ علمیت، وہ نہ اپنوں کو مطمئن کر سکے گا اور نہ غیروں کو، یہ اسلام دعا و درود، سلام اور منقبت اور تعویذ گندے تک محدود ہوگا۔ اور اس میں نہ حرکت کا نشان ہوگا اور نہ علمیت کا۔ اس کا چراغ علم و فن کی آندھیوں میں روشن نہیں دے سکے گا اور اس کی کشتی افکار و آرائے جدیدہ کے طوفان

سے صحیح سلامت نہ گذر سکے گی۔

لیکن درحقیقت اسلام کا صحیح تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کا عظیم ترین اور سخت انقلاب آفرین مذہب ہے، اس نے تاریخ کو ایک نہایت اہم موڑ دیا ہے، اس نے انسان کو زندگی اور کائنات کے معاملات و مسائل پر سوچنے اور غور کرنے کا ایک نیا ڈھنگ اور نیا آہنگ دیا ہے، زندگی محدود تھی، اسلام نے اس کو لامحدود بنا دیا۔ کائنات بد و صنع اور بے رونق تھی اس نے اسے لالہ زار کر دیا، انسان ڈر اور خوف، مایوسی و ناکامی اور احساس پیمیزی کا صید بول تھا۔ اسلام نے اس کی ہمت باندھی، اسے حوصلہ بخشا، اسے جرأت و جبارت عطا کی اور اس کے سر پر کائنات ارض و سما پر حکمرانی و فرمان روائی کا تاج زرفشاں رکھا، وہ جامد نہیں ابدی الحکمت ہے، اس کا کوئی ایک میدان نہیں بلکہ انسان کے فکر و عمل کے ہر میدان میں وہ رواں دواں ہے، مذاہب عالم، علوم و فنون، فکر و نظر، شعر و ادب، سماجیات و معاشیات سیاست اور حتیٰ کہ فنون لطیفہ اور فلسفہ و حکمت، ان میں سے وہ کونسی چیز ہے جس پر اسلام نے اپنی چھاپ نہ لگائی ہو اور جس کے نقش و نگار میں اپنا رنگ نہ بھرا ہو، یہ اس کے علمی کارنامے تھے، ساتھ ہی اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے رنگ و نسل، وطنیت و قومیت اور امیری اور غریبی کی تمام حد بندیوں کو ختم کر کے سب کو ایک رشتہ و وحدت انسانی سے منسلک کر دیا اور جو لوگ اسلام کی سچائی پر یقین و اعتقاد رکھتے ہیں اور جن کا اصطلاحی نام مسلمان ہے ان کو دنیا کے تمام انسانوں کا محافظ اور نگران مقرر کر کے ان کا یہ فرض قرار دیا کہ دنیا میں کہیں اور کسی جگہ بھی اگر کوئی ایک انسان یا ایک پوری آبادی ظلم اور نا انصافی کا شکار ہے، قحط اور وبا میں مبتلا ہے، اخلاقی اغطاط اور فکری و اعتقادی گمراہی میں گرفتار ہے بہر حال مسلمان کو ان سب کی مدد کرنی چاہئے، گویا ایک مسلمان کی زندگی یہ ہونی چاہئے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتا ہے اپنا دل

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے



اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے یہ ہمہ گیر انقلاب کیونکر پیدا کر دیا؟ جواب یہ ہے کہ اپنے نظام فکر و عمل سے! پس جس کو ہم دینیات کہتے ہیں وہ اسی نظام فکر و عمل کا نام ہے اور چونکہ وہ ہمہ گیر اور نہایت وسیع ہے (جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا) اس بنا پر دینیات بھی اپنے مفہوم میں ایک نہایت وسیع مضمون ہوگا۔ اور بنیادی طور پر وہ مندرجہ ذیل دو قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہوگا۔

(۱) وہ علوم جن کا تعلق براہ راست دینیات سے ہے اور جو اس کے لئے اصل مآخذ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان علوم میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ مع اپنی تمام شاخوں اور لوازم و لوازم کے شامل ہیں۔

(۲) وہ علوم و فنون جن کا تعلق بالواسطہ دینیات سے ہے، اس سے مراد وہ علوم ہیں جو (۱) اسلام کے نظام فکر و عمل کو کلاً یا جزئاً متاثر کرتے ہیں (۲) یا وہ علوم جن کے ذریعہ اسلام اپنے نظام فکر و عمل کو باختلاف زمان و مکان لوگوں کے ذہن میں زیادہ راسخ اور موثر طریقہ پر ذہن نشین کر سکتا ہے، علاوہ ازیں اس ذیل میں وہ علوم و فنون بھی آتے ہیں جو اسلام کے نظام فکر و عمل کی کارگزاریوں اور انسان اور اس کے مختلف اداروں پر اس کے اثرات کا مرتع پیش کرتے ہیں، اس بنا پر قسم ثانی میں مندرجہ ذیل علوم و فنون شامل ہوں گے: تاریخ، فلسفہ، تاریخ، منطق و فلسفہ، معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور سائنس۔ مذکورہ بالا دونوں قسموں میں پہلی قسم کے علوم اور ساتھ ہی علوم آلیہ جیسے عربی زبان اور اس کے متعلقات، دینیات کے ہر طالب علم کے لئے لازمی ہوں گے اور قسم دوم کے علوم و فنون کو مختلف گروپ میں تقسیم کر کے ایک طالب علم کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ قسم اول کے علوم کے ساتھ قسم دوم کا جو گروپ چاہے اختیار کر لے۔

۱۰ میں نے یہی خیالات اپنے انگریزی مضمون "How to teach Religion" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ دھکی چھپی حقیقت نہیں ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے نظام فکر و عمل کے سرمایہ میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے، لیکن اس کے باوجود یورپ اور امریکہ میں کسی یونیورسٹی کے دینیات کالج (College of Divinity) کو ملاحظہ فرمائیے! آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کا نصاب مذہبی علوم و فنون کے علاوہ سیکولر علوم و فنون پر اور اس کے مطابق کالج کی لائبریری ہر علم و فن کی کتابوں پر مشتمل ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں ظاہر کئے ہیں۔ کئی سال ہوئے پنجابی یونیورسٹی کے شعبہ مذاہب کے زیر انتظام ٹیپالہ میں ایک سیمینار ”مذہب کا مطالعہ کس نقطہ نظر سے ہونا چاہئے“ کے عنوان پر ہوا تھا، اور میں نے یہ مقالہ اسی سیمینار میں پڑھا۔ اب سیمینار کے دوسرے مقالات کے ساتھ یہ مقالہ بھی کتاب کی شکل میں یونیورسٹی سے شائع ہو گیا ہے۔

۱۰ میں نے بھی اپنے زمانہ میں نیکلٹی آف تھیالوجی کی لائبریری کو مختلف علوم و فنون جدیدہ پر بہترین کتابوں سے پُر کر دیا تھا، یہاں تک کہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ تعجب کرتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ ایک ناگوار واقعہ بھی پیش آیا جس کا مجھ کو اب تک افسوس ہے، ہوا یہ کہ ایک مرتبہ جناب بشیرالہین صاحب لائبریرین مولانا آزاد لائبریری نے لائبریری میں مختلف شعبہ جات کے صدر صاحبان کی ایک میٹنگ بلوائی اور اس میں بہ طور شکایت کہا کہ بعض شعبوں کے صدر ڈپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے بالاسی بالاکتابیں خرید لیتے ہیں اور اس کا بل لائبریرین کے پاس ادائیگی کے لئے بھیجتے ہیں، یہ خلاف قاعدہ بات ہے، آپ حضرات کے آرڈر لائبریرین کے واسطے سے جانے چاہئے، اسی سلسلے میں انھوں نے مزید کہا کہ بعض حضرات اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری کے لئے ایسی کتابیں خریدتے ہیں جو ان کے مضمون کی نہیں ہوتیں، یہ کہہ کر انھوں نے مزید فرمایا: مثلاً نیکلٹی آف تھیالوجی کے ڈین نے برٹنڈرسل کی خودنوشت سوانح عمری خریدی ہے، بھلا دینیات کو اس سے کیا تعلق؟ یہ سنتے ہی میں فوراً کھڑا ہوا اور ناراضگی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)



بہر حال میں علی گڑھ دینیات کے اسی وسیع تصور کو لے کر آیا تھا اور اسی کے مطابق کام

کرنا تھا۔ میں نے جب یہاں اپنے شعبہ کا چارج لیا تو اس کی حالت یہ تھی کہ :

(۱) شعبہ میں صرف دو لکچرر تھے، ان میں سے ایک صاحب ناظم دینیات کا کام کرتے تھے اور ان کا دفتر مسجد کے احاطہ کے اندر ایک کمرہ میں تھا۔

(۲) صدر شعبہ کوئی نہیں تھا، کیونکہ صدر ریڈر عہدہ کم نہیں ہوتا۔

(۳) شعبہ کا اور فیکلٹی کا کوئی دفتر نہیں تھا

(۴) اس کا کلرک نہیں تھا۔

(۵) ریڈر اور پروفیسر کی عدم موجودگی میں حسب قاعدہ و ضابطہ پروفیسر چانسلر ڈین

آف فیکلٹی ہوتا تھا، لیکن پروفیسر چانسلر کے ڈین ہونے سے فیکلٹی کو کیا فائدہ

پہنچ سکتا ہے ؟ ظاہر ہے۔

اس دفتری خستہ حالی اور کس پرسی کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ دینیات کے مضمون

کی طلباء میں اور اساتذہ میں کوئی وقعت نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نقصان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے کرخت لہجہ میں کہا: آپ کو یہ فیصلہ کرنے کا حق کس نے دیا ہے کہ یہ کتاب دینیات

کے دائرہ میں نہیں آتی، برٹنڈرسل عصر حاضر کا عظیم مفکر، فلسفی اور سائنٹسٹ ہے لیکن ساتھ ہی خدا اور

مذہب کا منکر ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ دینیات کے اساتذہ اور طلباء اس کتاب کو

پڑھیں اور رسل نے خدا اور مذہب کے انکار کے جو دلائل دیئے ہیں ان پر غور کر کے

اس کے جوابات تلاش کریں۔ علاوہ ازیں میں نے بشیر الدین صاحب سے شکایت کی کہ ایک

عام بات کہتے کہتے ایک شخص کا معین طریقہ پر نام لینا آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بشیر صاحب

میرے بڑے کرم فرما اور دوست ہیں، دوسرے دن انھوں نے مجھ کو معذرت نامہ لکھا اور میں نے

بھی اپنے لہجہ کی کوشش اور درشتی پر اظہار افسوس کیا، بات آئی گئی ہوئی۔



کی حیثیت ایک علمی مضمون کی دوسرے شعبوں کے مضمونوں کی طرح نہیں ہے، اس کے امتحانات برائے نام ہیں اور ان میں بڑی فیاضی اور دھاندلی برتی جاتی ہے، طلباء محض اس لئے دینیات لیتے ہیں کہ اس میں تو بے روک ٹوک پاس ہو ہی جائیں گے، علاوہ ازیں اس کی ایک بڑی وجہ میرے نزدیک یہ بھی تھی کہ دینیات کے اساتذہ ہمیشہ وہ حضرات ہوتے رہے ہیں جو کیسے ہی بڑے عالم فاضل ہوں، لیکن انگریزی میں بولنے اور لکھنے سے عاجز تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے ماحول میں خواہ کوئی مضمون ہو، کوئی استاد انگریزی میں مہارت کے بغیر خاطر خواہ عزت اور وقار حاصل نہیں کر سکتا اور ایسا استاد خود بھی احساس کتری کا شکار ہونے کے باعث اندر سے گھٹا گھٹا اور یونیورسٹی کی عمارتوں اور اس کی نفا سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرے گا۔

سنی دینیات میں تو دو لکچرر تھے۔ شیعہ دینیات میں صرف ڈیڑھ ہی تھے، اور وہ اس طرح کہ ایک صاحب لکچرر تھے اور دوسرے محض ٹیچر، یہی حال زنانہ کالج کا تھا، وہاں سنی دینیات میں ایک خاتون لکچرر تھیں، لیکن شیعہ میں جو خاتون پڑھاتی تھیں وہ ٹیچرس ہی تھیں، دین کی حیثیت سے اب شیعہ دینیات بھی میری نگرانی میں تھا۔ اس بنا پر یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ اور فیکلٹی کے لئے باعث مذلت تھی اس لئے میں نے مذکورہ بالا دونوں جگہوں کو ختم کرا کے ان کی جگہ دو لکچرر مقرر کرائے، کسی کام اور پروگرام کو شروع کرنے اور اطمینان کے ساتھ اسے انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ بیٹھنے کی جگہ تو معقول ہو، اس سلسلہ میں میں نے ولایت منزل حاصل کی جو ایک نہایت وسیع کشادہ اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی مضبوط عمارت ہے اور حسن اتفاق سے ایک چھوٹی سی مسجد بھی اس میں بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے حاصل کرنے میں بڑے پاڑے بیلنے پڑے۔ کیونکہ اس پر بہت سے لوگوں کی نگاہ تھی، اگر زیدی صاحب کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو میں اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اس عمارت کو اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ کیا، مالیوں کے ذریعہ اس میں خوبصورت لان بنوائے، اور پھلواریاں



بنوائیں۔ ڈین کے دفتر اور صدر شعبہ کے دفتر دونوں کے لئے الگ الگ فرسٹ گریڈ اور سکند گریڈ کے کلرک اور چپراسی، لائبریری کے لئے اسسٹنٹ اور ایک اسٹنڈنٹ حاصل کئے۔

یہ سب کچھ تو فیکلٹی کی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے تھا۔ معنوی حیثیت سے نصاب میں تغیر و تبدل کر کے اس کی حیثیت ایک علمی مضمون کی بنائی جو یونیورسٹی کے شایان شان ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ نواب علی یا در جنگ کے زمانہ میں اساتذہ کی ایک میٹنگ تھی اس میں کہیں دینیات کا ذکر آگیا تو ایک پروفیسر نے اپنے زمانہ طالب علمی کے نصاب دینیات کے بعض مشمولات کا تذکرہ کر کے اس کا مذاق اڑایا ایک اور پروفیسر صاحب نے اس پر کچھ اور عاشیہ آرائی کر دی، لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں خود نواب صاحب ان دونوں حضرات کو ان کے نام سے خطاب کر کے بولے: آپ یہ باتیں پرانے زمانہ کی کرتے ہیں۔ اب آج کل ہمارے ہاں جو نصاب رائج ہے آپ اس کو دیکھئے، میں نے بہت غور سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نصاب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے نصاب دینیات سے بھی بدرجہا بہتر ہے۔ فیکلٹی کی کلاسوں یعنی بی ٹی ایچ (۲ سالہ) اور ام۔ ٹی ایچ (یک سالہ) کے نصاب میں یہ تبدیلی کی کہ جو طلباء عربی سے نا آشنا ہوں، ان کے لئے ایک پرچہ عربی کا سونہروں کا اور جو طلباء عربی جانتے ہوں ان کے لئے ایک متبادل پرچہ تاریخ فقہ اسلامی“ کا لازمی کر دیا، اور حدیث و اصول حدیث اور فقہ و اصول فقہ کی کتابوں میں ادل بدل کر انھیں اپ ٹوڈیٹ بنادیا، علاوہ ازیں ام۔ ٹی ایچ کے نصاب میں ایک مستقل پرچہ ”مذہب کے تقابلی مطالعہ“ کا اضافہ کیا۔

نصاب کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر اساتذہ قابل نہیں ہیں تو وہ کسی مصرف کا نہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے فیصلہ کیا (۱) اساتذہ کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ڈپارٹمنٹ کے کاموں اور کچوروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے (۲) ایسے اساتذہ کا تعین

کیا جائے جولیاقت و قابلیت کے ساتھ انگریزی میں بھی اعلیٰ سند یافتہ ہوں، علمی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہوں اس سلسلہ میں میں نے اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ جب کبھی کوئی پوسٹ خالی ہو تو اس پر خود نیکلیٹ کے اعلیٰ سند یافتہ کا حق بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہے، بشرطیکہ وہ چاہے علامہ نہ ہو۔ پوسٹ کا حق خاطر خواہ طریقہ پر ادا کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتا ہو اس امر کو پیش نظر رکھنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا اور ڈپارٹمنٹ کے حق میں مفید بھی ! کیونکہ دنیات کی تعلیم اور اس میں ریسرچ پر جس نے عمر کے چھ سات برس صرف کئے ہیں اس کے لئے ملازمت کے مواقع کسی اور یونیورسٹی اور دفتر وغیرہ میں تو ہیں نہیں۔ اب اگر اس غریب کو یہاں بھی موقع نہ ملے تو اس سے طلباء میں بددلی اور بیزاری پیدا ہوگی۔

بہر حال اس نقطہ نظر اور اس کے ماتحت لگن سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے چارج لیا ہے اس وقت صرف دو استاد تھے، لیکن جب میں نے چھوڑا تو یہ تعداد آٹھ تک پہنچ گئی تھی، پھر ان میں ڈاکٹر یعنی ایم اے پی ایچ ڈی بھی ہیں، قاہرہ کے پڑھے ہوئے بھی ہیں، بلند پایہ اور اعلیٰ کتابوں کے مصنف اور معارف اور برہان کے مقالہ نگار بھی، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی یونیورسٹی کے ایک ڈپارٹمنٹ کا اسٹاف بحیثیت مجموعی سندات، تحریر و تقریر، علمی و تحقیقی کارناموں اور اپنے مضمون پر دسترس کے پیش نظر جتنا اچھا ہو سکتا ہے، یہ اسٹاف اس سے کم اچھا نہیں ہے۔

ایک استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے مضمون کو اس طرح پڑھائے کہ طالب علم کے دماغ میں اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ دلچسپی پیدا ہو اور یہ چیز دوسرے طلباء کے لئے بھی اس مضمون کی طرف رغبت کا سبب بنے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی کی مختلف مجلسوں اور سیمیناروں میں میری زبانی تقریر یا مقالہ تو ہوتا ہی رہتا تھا اب شعبہ دینیات کے اساتذہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہو کر کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں مقالہ خوانی اور بحث مباحثہ میں حصہ لینے لگے اور دوسرے شعبوں، یہاں تک کہ سائنس کے اساتذہ کے ساتھ



ان کو مذاکرہ میں شرکت کا موقع ملا تو اب دینیات کے متعلق یونیورسٹی کا جو ذہن پہلے تھادہ بالکل تبدیل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کے شعبہ میں داخلہ کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، نیکلیٹ کی کلاسیں جہاں پہلے ہو کا عالم رہتا تھا وہاں اب جہل پہل رہنے لگی، لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی اور آرٹس کے مضامین کے ساتھ سائنس اور کامرس کے طلباء بھی داخلہ لینے لگے۔ یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں نیکلیٹ کے امتحانات اکا دکا کسی نے پاس کر لئے تو خیر، ورنہ اس مضمون میں پی ایچ ڈی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اب لڑکے اور لڑکیاں بھی پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے لگے۔ ان کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا وظیفہ مبلغ -/300 یا یونیورسٹی کا وظیفہ مبلغ 250 ماہوار تین برس تک کے لئے ملتا تھا۔ جن طلباء یا طالبات کو پی ایچ ڈی کی ڈگری اب تک مل چکی ہے ان کی تعداد کافی زیادہ ہے ان میں سے جن کے مقالات چھپ چکے ہیں یا اب زیر طباعت ہیں ان کے نام یہ ہیں :

مولانا محمد انور شاہ کشمیری۔ حیات اور کارنامے

(۱) ڈاکٹر قاری حافظ محمد رضوان اللہ

اس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔

عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

(۲) ڈاکٹر حنیفہ رضی

یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے طبع کی ہے

شیخ الہند۔ حیات اور کارنامے

(۳) ڈاکٹر اقبال حسن خاں

مطبوعہ مسلم یونیورسٹی

زندگی کا تصور قرآن اور سائنس میں

(۴) ڈاکٹر ماجد علی خاں

یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور لاہور کے شیخ محمد اشرف اسے چھاپ رہے ہیں،

مقالہ ہمارے پہلے ایم ایس۔ سی کیا اور پھر نیکلیٹ آف تھیالوجی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد

مذکورہ بالا موضوع پر دینیات میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔

پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں نے پانچ چھ برس شعبہ دینیات سے وابستہ رہ کر وقت

ضائع نہیں کیا بلکہ محنت کی اور مضمون میں کمال پیدا کیا وہ کسب معاش میں بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ماجد علی خاں جن کا ذکر ابھی ہوا ٹریڈاڈ (Trinidad) کے ایک کالج میں لکچرر اور ڈائرکٹر آف اسلامک اسٹڈیز بھی ہیں۔ مس شفقت فاطمہ جو دینیات کی بہت ممتاز طالبہ رہی ہیں اور جو مولانا محمد قاسم نانوتوی پر سرچ کر رہی تھیں دو برس سے زیادہ سے ٹیونس کے ایک کالج میں اسلامیات کی لکچرر ہیں اور اب آئندہ سال سعودی عربیہ جارہی ہیں، وہاں تقرر ہو گیا ہے، ایک لڑکی کراچی کے ایک لڑکیوں کے کالج میں دینیات کی لکچرر ہے۔ یہ نام وہ ہیں جنہوں نے تعلیم یہاں پائی مگر اب بیرونی ممالک میں کام کر رہے ہیں، لیکن جو خود ہندوستان میں ہیں اور خوش اور مطمئن ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

یونیورسٹی میں دینیات کے لئے ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے، لیکن غیر ملکی طلباء سے قطع نظر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے بھی ایسے مسلمان طالب علم کثرت سے آتے ہیں جو اردو نہیں جانتے مگر دینیات لینا چاہتے ہیں، ہر سال ایسے طلباء کی الگ کلاس بنتی تھی اور میں خود اسے انگریزی میں پڑھاتا تھا۔

طلباء کی ایک سوسائٹی تھی جو ہر ڈیپارٹمنٹ میں ہوتی ہے، یہ جدید روح تھی میں نے اس کو فعال و موثر بنایا، اس سوسائٹی کے وقتاً فوقتاً جلسے ہوتے رہتے تھے جن کے اختتام پر خود و نوشت کا بہترین انتظام ہوتا تھا اور اس میں دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلباء بھی شریک ہوتے تھے، اس طرح دینیات کا حلقہ و تعارف دائرہ وسیع ہوتا تھا، لائبریری کے متعلق میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ لائبریری یونیورسٹی کی چند بہترین ڈیپارٹمنٹس لائبریریوں میں سے ہے۔

۱۸، ۱۹ برس پہلے کی بات ہے۔ محب محترم مولانا سید ابوالحسنؒ، میاں ندی دیوبند سے لکھنؤ اور میں کلکتہ جا رہا تھا۔ سفر میں چند گھنٹوں کی معیت ہوئی، اس موقع پر مولانا نے فرمایا: میرا احساس یہ ہے کہ مدارس عربیہ عمر طبعی کو پہنچ گئے ہیں اور اب دین کی حفاظت اور



اس کی خدمت کا کام کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لینے کا فیصلہ مشیت الہی کر چکی ہے، ان حالات میں میری بڑی تمنا اور آرزو ہے (اور میں نے چند حضرات سے اس کا تذکرہ کیا بھی ہے) کہ آپ کو اب کلکتہ سے علی گڑھ بلایا جائے، وہاں آپ کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ مولانا نے یہ بات اس زمانہ میں فرمائی تھی جب کہ علی گڑھ میرے دم و گمان میں بھی نہیں تھا، لیکن مولانا نے یہ کچھ ایسی ساعت نیک میں فرمایا تھا کہ میں علی گڑھ پہنچ ہی گیا۔ البتہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مقصد بھی پورا ہوا یا نہیں؟ کیونکہ مولانا کا مزاج دعوتی اور تبلیغی ہے اور میری طبیعت علمی اور اکتشافی! بہر حال مجھ کو اس کی مسرت ہے کہ زیدی صاحب جن کے دل میں دنیات کے شعبہ کی بکیسی کا بڑا غم تھا اور جس کا وہ اکثر اظہار فرماتے رہتے تھے، ان کا مقصد پورا ہو گیا، چنانچہ جب میں علی گڑھ سے سبکدوش ہو کر دہلی آیا ہی آیا تھا ایک روز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذکر حسین اسلاک اسٹڈیز کی ایک میٹنگ تھی اس میں زیدی صاحب نے پرنسپل خلیق احمد نظامی، پرنسپل فاروقی اور پرنسپل مجیب کی موجودگی میں مجھ سے مخاطب ہو کر اپنے خاص لہجہ میں زور دیکر فرمایا: ”اگر میں وہاں ہوتا تو ابھی آپ کو پانچ برس اور علی گڑھ سے نہ جانے دیتا۔“

۱۔ اس میں شک نہیں کہ نیکیوں آف تھیالوجی کی ترقی سے متعلق جو منصوبہ اور خاکہ میرے ذہن تھا میں اس کی کماحقہ تکمیل نہیں کر سکا اور اس کی حسرت ہی رہ گئی، مجھے ان طلباء کی طرف سے سخت صدمہ پہنچا جن کو میں نے ڈھائی سو تین سو روپیہ مہوار کا وظیفہ دلایا اور وہ مقالہ کی تکمیل کیے بغیر چل دیے، ان نوجوانوں کی اس سہل انگاری اور ثرولیدہ دماغی نے میری ہمت توڑ دی اور بعض منصوبوں کو خود مجھے مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اور جو کچھ میں کر سکا ہوں اس کے لئے اپنے رفقاء کار اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار و انتظام، خصوصاً وائس چانسلر، پروفیسر چانسلر اور اکاڈمک و ایجوکیشنل کونسل کا دل سے شکریہ گزار ہوں:

لنذیر بود حکایت دراز تر گفتم

## پروفیسر آل احمد سرور کا ایک خط

پروفیسر سرور نے تقسیم کے بعد سے اب تک مسلم یونیورسٹی کا پورا دور نہایت قریب سے اور محرم راز کی حیثیت سے دیکھا ہے اس لئے ذیل میں اڈیٹر برہان کے نام ان کا یہ خط شائع کیا جا رہا ہے :

محرمی ! تسلیم

برہان ایک عرصہ سے میرے پاس آتا ہے اور میں باقاعدہ اس کا مطالعہ کرتا ہوں، آپ کی تحریریں خاص طور سے دیکھتا ہوں، ادھر آپ نے علی گڑھ پر مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ شروع سے دیکھ رہا ہوں، تازہ شمارے (اگست ۱۹۷۳ء) میں آپ نے ذاکر صاحب کے دور اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ذاکر صاحب کی خدمات کا دور خفی جائزہ لیا ہے اور ان کی سیرت و شخصیت پر گہری نظر ڈالی ہے، میری ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا کماحقہ اعتراف نہیں ہوا، اور چونکہ میں انہیں خاصے قریب سے دیکھ



سکا ہوں اس لئے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عام طور پر مسلمانوں نے ان کی شاندار خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ اس سلسلہ میں احسان فراموشی تک کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے غلطیاں تو سبھی سے ہوتی ہیں، مگر بلاشبہ آزادی کے بعد اور تقسیم کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو گئے تھے ان میں ذاکر صاحب نے علی گڑھ کو بچالیا، موجودہ احتجاج کے سلسلہ میں بھی آپ کا رویہ میرے نزدیک تعمیری تنقید کا ہے، امید ہے کہ یہ نقطہ نظر مقبول ہوگا اور موجودہ تنگ نظر سیاست کی رو کو بدلے گا، میری مبارکباد قبول فرمائیے۔

مخلص آل احمد سرور  
از علی گڑھ، ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء

اڈیٹر برہان:

مبارکباد کا شکریہ!

مقبول یار گشت نظیری کلام ما

بیہودہ صرف شکر نہ کر دیم سودہ را

لیکن برہان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نامکمل ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں میں خود علی گڑھ میں نہ تھا، میں نے علی گڑھ پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کے جو آثار یا قبہ دیکھے برہان کا معنوی انہیں پر مبنی ہے، سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ قبل از رقت کیوں چھوڑا؟ اور وہ کیوں وہاں سے بیزار ہو کر گئے؟ پھر یہ بھی سنا جاتا ہے کہ آخر میں ان کے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے تھے، مجھ کو اس سلسلہ میں جو کچھ معلوم ہے وہ بہت

ناقص ہے اور اس کا مرتبہ علم حصولی کا ہے ، پروفیسر آل احمد صاحب  
 سرور کو ان چیزوں کا علم حضوری ہے ، اگر وہ ان کو لکھیں  
 تو برہان ان کو شائع کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرے گا۔  
 اور ڈاکٹر صاحب پر برہان کے مضمون کی تکمیل ہو جائے گی ،  
 برہان کا یہ سلسلہ مضامین یونیورسٹی کی اور خصوصاً یونیورسٹی  
 بعد از تقسیم کی ایک تاریخی روئداد ہے ، اسی وجہ سے بیرونی  
 ممالک میں بھی اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے ، جنوبی افریقہ  
 اور موریشش (جس کے سفرنامہ کے لئے شدید تقاضے چاروں طرف  
 سے آرہے ہیں) سے تو میں ابھی آیا ہوں۔ وہاں کے مسلمانوں  
 کو علی گڑھ کے ساتھ محبت نہیں عشق ہے ، اسی وجہ سے  
 برہان کا یہ سلسلہ مضامین وہاں بھی بڑی دلچسپی اور شوق سے  
 پڑھا جا رہا ہے اور ان حضرات نے ان مضامین کے انگریزی  
 ترجمہ کو کتاب کی صورت میں چھاپنے پر ایک مگر القدر رقم کی  
 پیشکش بھی کی ہے ، بہر حال ان وجوہ سے میں چاہتا ہوں  
 کہ تقسیم کے بعد سے اب تک یونیورسٹی کی پوری سرگذشت  
 اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں کسی دور عایت اور  
 جنبہ داری کے بغیر قلمبند کردوں تاکہ ایک طرف گورنمنٹ  
 کو محسوس ہو کہ اس نے ۱۹۷۲ء کا ایکٹ نافذ کر کے کیا عاقبت  
 کی ہے اور دوسری جانب مسلمانوں کو بھی عبرت ہو کہ انھیں  
 یونیورسٹی کے لئے اور اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کرنا  
 کیا چاہئے تھا اور کیا کر رہے ہیں ! اس بنا پر اگر پروفیسر آل احمد



ستروور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے عہد سے متعلق مذکورہ بالا  
حصہ کو مکمل کریں تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔

## اسلام اور عصر جدید

اردو ، انگریزی  
سالانہ چندہ میں رعایت

توسیع اشاعت کی غرض سے اعلان کیا جاتا ہے  
کہ جو صاحب ۳۱ دسمبر ۷۷ء تک خریدار بن جائیں  
گے ان سے سالانہ چندہ میں ایک تہائی کی رعایت  
کی جائے گی۔

اردو کا رسالہ ”اسلام اور عصر جدید“ بجائے پندرہ  
روپے کے دس روپے میں اور انگریزی کا جریدہ  
”اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج“ بجائے تین روپے کے بیس روپے  
میں صرف ایک سال کے لئے حاصل کیا جاسکتا ہے

پتہ

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی جامعہ گمرانی دہلی ۲۵

# مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(از مولانا محمد عبدالشہید خاں صاحب شروانی، اسسٹنٹ لائبریرین

شعبہ مخطوطات و انچارج اور نیشنل ڈویژن)

یہ عظیم المرتبہ اور رفیع المنازل کتاب خانہ، احاطہ مسلم یونیورسٹی کے وسط میں اپنی وسیع و عریض ہفت منزلہ عمارت اور مشرقی طرز کے خوشنما صدر دروازہ کے ساتھ بڑی شان و شوکت لئے ہوئے ہر زائر کو کچھ دیر کے لئے درطہ سحرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس عمارت کا نقشہ مشہور انجینئر مسٹر فیاض الدین جید آبادی نے بنایا تھا جس کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۹ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے دورِ وائس چانسلری میں رکھا تھا اور افتتاح ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو کرنل سید بشیر حسین زیدی وائس چانسلر کے عہد میں کیا تھا اس کی بنیاد کی کھدائی کا افتتاح معمر ترین اولڈ بوائے ڈپٹی محمد حبیب اللہ خاں نے ۷ دسمبر ۱۹۵۶ء کو پھاوڑا چلا کر کیا تھا۔ حکومت ہند کا بارہ لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس عمارت کا رقبہ تین لاکھ تیس ہزار ایک سو ساڑھے تریسٹھ مربع گز ہے۔ اگر اس کے مشرقی، مغربی اور جنوبی وسیع شاداب اور خوش منظر لانوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ رقبہ چار چاند ہو جائے گا۔ دسمبر ۱۹۶۱ء ہی سے یہ کتاب خانہ ۸۴ سال ”لبن لائبریری“ کے نام سے موسوم



رہنے کے بعد ”مولانا آزاد“ آزاد لائبریری کے نام پر میٹل ہو گیا۔ اور اب ”مولانا آزاد لائبریری“ کے نام سے شہرت یافتہ ہے۔

اس لائبریری کی موجودہ رفعت و منزلت تمام تر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند کی رہنمائی میں ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں جب مولانا وزیر تعلیم کی حیثیت سے کانو کیشن ایڈریس کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ اور لٹن لائبریری کی عمارت میں بیٹھ کر اس کا سرسری جائزہ لیا تو عمارت کو غیر محسوس کرتے ہوئے اس کی جدید شاندار و متکفل ضروریات عمارت کے تخیل کا اظہار فرمایا۔ اور واپس جا کر اس کو علی جامہ پہنانے کی تدابیر شروع کیں۔ جسے اپنی زندگی ہی میں یا یہ تکمیل کو پہنچا دیا۔ کیسے خبر تھی کہ فروری ۱۹۵۵ء میں وہ رگڑا دے عالم جاودانی ہو جائیں گے۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو اس کا افتتاح بھی کرنا پڑے گا۔ اور انھیں کے نام سے یہ لائبریری موسوم بھی کرنا ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کی اس لائبریری سے مولانا آزادی کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اسی موقع تشریف آوری پر جب نواب صدیق جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی سے ملنے ان کی کوٹھی حبیب منزل۔ پیرس روڈ پر تشریف لے گئے تو اپنے صدیق مکرم ”کوہم لوگوں کی موجودگی میں توجہ دلائی کہ اپنا نادار الوجود اور بیش بہا کتابخانہ، مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کو مرحمت فرمادیں۔ نواب صاحب نے اس شرط پر یہ مشورہ قبول کیا۔ کہ مولانا آزاد خود حبیب گنج آکر اس کا ذخیرہ کو انجام دلائیں۔ افسوس کہ مولانا آزاد اپنی ملکی و قومی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ وعدہ پورا نہ فرما سکے اور نواب صاحب ڈیڑھ سال بعد جو رحمت خداوندی میں پہنچ گئے۔ مولانا آزاد کو اس کا افسوس رہا۔ اس کے بعد جب میں حاضر خدمت ہوا تو نواب صاحب کے خلف الصدق مولوی حاجی محمد عبدالحق خاں شروانی کو میرے ذریعہ پیغام بھیجا۔ بالآخر یہ کتابخانہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں نئی لائبریری میں آ گیا اور اس کی وجہ سے مولانا آزاد لائبریری کی اہمیت میں دوچند اضافہ ہو گیا۔ اس کتابخانہ کو حبیب گنج سے علی گڑھ منتقل کرنے میں راقم الحروف بھی ذاتی و مفاتیح طور پر شریک رہا۔ اس کتابخانہ

کے انتقال مکانی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کے سیم اہرار کو بھی بڑا دخل رہا۔ مرحوم خود حبیب گنج تشریف لے گئے۔ اور کتا بخانہ کے لوازم سے متاثر ہو کر جلد سے جلد منتقل کرانے کے لئے سرگرم رہے۔

**آغاز** | اس لائبریری کی ابتدا ربانی مود سگاہ سرسید احمد خاں اور ان کے خلف الرشید سید محمود کی کتابوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (قائم شدہ ۲۲ مئی ۱۸۷۷ء) کے ایک کمرے میں ۱۸۷۷ء میں ہوئی جب اسی سال ”محمد بن ایٹکلو اور نیٹل کالج“ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے لارڈ لٹن وائسرائے ہند علی گڑھ آئے تو ان کی منظوری سے اس کا نام ”لٹن لائبریری“ رکھا گیا۔ اور موجودہ سرسید ہال میں اسٹیریج ہال سے متصل ایک ہال اور پانچ کمرے پر مشتمل عمارت میں ۱۹۷۷ء تک اسی نام سے موسوم رہی۔

سرسید کی کتابوں میں مخطوطات بھی تھے جن میں حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی ۱۰۷۷ھ کی تاریخ گزیرہ مصنفہ ۱۰۷۷ھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے سرورق پر سات مہروں ہیں۔ ایک مہر ”تابع شرع محمد اسحاق ۱۰۵۲ھ“ کی ہے۔ یہ نسخہ ابوالفیض فیضی فیاضی متوفی ۱۱۷۷ھ کی ملکیت میں رہا ہے۔ سرورق پر ان کی مہر اور دستخط بھی ہیں۔ اول و آخر اوراق پر ”سید احمد“ کی مہر ہیں۔ یہ نسخہ باریک تعلق خط میں خوشخط لکھا ہوا ہے۔ ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے سال کتابت نہ معلوم ہو سکا۔ مصنف نے یہ کتاب لکھ کر وزیر غیاث الدین بن رشید الدین صاحب جامع التواریخ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

سید محمود کی کتابوں میں القانون فی الطب اور کتاب النجاة بھی شامل تھے۔ جباریک نسخہ ثانیہ میں ۱۰۹۳ھ کے مطبوعہ دوم ہیں۔ پونے چار سو سال گزرنے پر بھی انکا کاغذ پائدار اور مضبوط ہے۔ یہ دونوں کتابیں مصنف ابوعلی ابن سینا متوفی ۴۲۸ھ ۱۰۳۷ء میں۔ اور لائبریری میں قدیم ترین مطبوعات ہیں۔

**رفتار ترقی** | یہ لٹن لائبریری ۲۲ سال تک ۱۹۷۷ء تک آہستہ خرامی پر قدم فرما



رہی یعنی اس کا اسٹاف تین افراد اور ذخیرہ کتب ۵۰۱ کی تعداد تک پہنچ سکا تھا۔ ان کتابوں میں نصف سے زیادہ (۲۷۵) مشرقی علوم والسنہ کی کتابیں تھیں اس کے بعد یہ لائبریری سنہ ۱۹۶۰ء تک سست رفتار پر کام زن رہی یعنی جب یہ پرانی عمارت سے منتقل ہو کر نئی عمارت میں آئی تو اس کا اسٹاف ۴۱ افراد پر مشتمل تھا اور کتابوں کی تعداد تفصیل ذیل ۱۸۲۰۱۶ تھی۔

انگریزی وغیرہ ، عربی ، فارسی ، اردو ، ہندی و سنسکرت ، مخطوطات  
۱۸۲۰۱۶ { ۸۹۸۲ ۶۴۱۹ ۳۷۷۸۵ ۵۵۰۵ ۸۲۸۴ ۱۱۵۰۳۹

”مولانا آزاد لائبریری“ ہونے کے بعد سنہ ۱۹۶۱ء سے اس کتاب خانے نے تیسرے تہائی اختیار کی۔ اس کا اندازہ اس رفتار ترقی سے ہو سکتا ہے کہ مالی سال ۱۹۶۱-۶۲ء کے خاتمہ پر ۳ مارچ ۱۹۶۱ء کو ۱۱ سال میں اس کے اسٹاف اور کتابوں کی تعداد علی الترتیب ۱۱۹ اور ۵۳۵۳۹ تھی۔ لیٹن لائبریری نے ۸۴ سال میں جتنی ترقی کی تھی مولانا آزاد لائبریری نے ۱۱ سال میں اس سے سہ چند ترقی کی۔

سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۴۱ ملازمین میں، عہدے داروں میں لائبریرین کے علاوہ، ایک اسٹنٹ لائبریرین، ایک آرٹھل اسٹنٹ اور دو لائبریری اسٹنٹ تھے۔ اور منظور شدہ بجٹ ۶۹۶، ۹۵، ۱ تھا۔ سنہ ۱۹۶۱-۶۲ء میں یہ بجٹ ریزمانہ سید محمد حسین رمنوی (۴۵۰، ۸۷، ۹) پر پہنچ گیا۔ اسٹاف اور کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

اسٹاف		
لائبریرین	۱	ایسی پروفیشنل اسٹنٹ ۲۲
ڈپٹی لائبریرین	۱	ادفتری عہدے داران ۵
اسٹنٹ لائبریرین	۵	کلرک فرسٹ گریڈ ۴
پروفیشنل اسٹنٹ	۱۶	سیکنڈ گریڈ ۱۲
		مقررڈ گریڈ ۳۶
		جلد ساز مختلف گریڈ ۱۳
		خاکروب ۴

کتاب			
۳۷	پشتو	۲۲۸۰	سنسکرت
۷۹	مراٹھی	۱۹۰۵	ملیالم
۵	بھاشا	۱۷۶۵	تیلیگو
۲	بنگالی	۳۱۰	تامل
۱۳۲۸۱	مخطوطات	۲۹۱	ترکی (سحر دین)
۳۱۸۲۶۵	انگریزی	۶۱۱۸۹	اردو
۲۱۱۸۳	عربی	۱۳۱۲۸	فارسی
۱۷۶۳۰	ہندی		

سہولت مطالعہ | طلبہ واساتذہ کے لئے خصوصاً اور دیگر مقامی و بیرونی دانشوروں کے لئے عموماً اس لائبریری میں تین بڑے ہال جنہیں کرسیوں، میزوں اور ہر ہال کے مناسب موزوں الماریوں میں کتابوں سے آراستہ کیا گیا ہے دارالمطالعہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ دو ہالوں کے بالائی حصوں میں بیس کیمیں بھی بنائے گئے ہیں جو ریسرچ اسکالروں کو الاٹ کر دئے جاتے ہیں جہاں بیٹھ کر وہ تنہائی میں سکون و یکسوئی سے رات تک کام کر سکتے ہیں۔ نیچے کے دونوں ہال بطور ریڈنگ روم علی العموم ۶ بجے شام تک اور امتحانات کے زمانے میں ۱۰ بجے رات تک کھلے رہتے ہیں جب کہ لائبریری ۲ ½ بجے شام بند ہو جاتی ہے۔ ان تینوں ہالوں کے علاوہ اورنٹیل ڈیڑن، پریڈیکل سیکشن اور ہندی و سنسکرت سیکشن کے ہالوں میں بھی مطالعہ و ریسرچ کا انتظام ہے یہاں خاصی تعداد میں میزیں اور کرسیاں مطالعہ کرنے والوں کے لئے مہیا کر دی گئی ہیں۔ اور ضرورت مند برابر سرگرم مطالعہ رہتے ہیں۔

## مشرقی شعبہ

اس لائبریری کا وقار و اہمیت اس کے مشرقی شعبہ کی وجہ سے ہے۔ یہ شعبہ جو عربی، فارسی، اردو، بھاشا، ترکی اور پشتو پر مشتمل ہے تقریباً ایک لاکھ و سٹس ہزار



کتابوں کا ذخیرہ عظیم رکھتا ہے۔ اس کی تقسیم مطبوعات اور مخطوطات دو حصوں پر ہے دونوں حصے اپنے نوا اور خصوصیات کی بنا پر دوسرے مشرقی کتاب خانوں سے بڑی حد تک ممتاز و منفرد ہیں۔ یہ شعبہ زیادہ تر اکابر ملت اور ارباب علم و خیر کے عطیات کا رہن منت ہے۔ قابل ذکر معطیان میں حسب ذیل سمار گرامی سرفہرست ہیں۔ ان حضرات نے جن میں اداروں کے ناظمین بھی شامل ہیں اپنی مادرِ درگاہ (مسلم یونیورسٹی) کی لائبریری کو مزین کرنے کے ساتھ اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دینے کا بھی سروسامان کیا ہے۔

- |                         |   |
|-------------------------|---|
| ۱۔ سمان اللہ کلکشن عطیہ | مولوی سمان اللہ خاں رئیس گورکھ پور                  |
| ۲۔ منیر عالم            | شاہ منیر عالم غازی پور                              |
| ۳۔ سلیمان               | سر شاہ سلیمان وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی جھپٹس آباد |
| ۴۔ احسن                 | سید علی احسن مارہرہ                                 |
| ۵۔ عبدالحی              | محمد مہدی انصاری فرنگی محل لکھنؤ                    |
| ۶۔ شیفتہ                | نواب محمد اسحاق خاں جہانگیر آباد میرٹھ              |
| ۷۔ قطب الدین            | ابوالقاسم حج اناد                                   |
| ۸۔ حبیب گنج             | مولوی حاجی محمد عبید الرحمن خاں شروانی علی گڑھ      |
| ۹۔ آفتاب                | آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس                     |
| ۱۰۔ جواہر میوزیم        | اسلامیہ کالج اٹاڈہ                                  |

## شعبہ مطبوعات

مالی سال ختم ۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو مطبوعات مشرقیہ کی تعداد تفصیل ذیل تھی۔

عربی ، فارسی ، اردو ، بھاشا ، ترکی ، پشتو	۲۱۱۸۳	۱۳۱۲۸	۶۱۱۸۹	۵	۳۹	۳۷
۹۵۵۸۱						





- ۲۔ نفحة اليمين احمد الشروانی الیمنی مطبوعہ کلکتہ ۶۱۸۱۱
- ۳۔ رسالہ من رسائل اخوان الصفا ————— ۶۱۸۱۲ " "
- ۴۔ البراہین السیاطیۃ جواد سابط " ۶۱۸۱۳ " "
- ۵۔ دیوان المتنبی المتنبی " ۶۱۸۱۴ " "
- ۶۔ القطبی قطب الدین الرازی " ۶۱۸۱۵ " "
- ۷۔ الفوائد الضیائیۃ عبد الرحمن الجامی " ۶۱۸۱۶ " "
- ۸۔ شرح السبع المعلقات عبد الرحیم " ۶۱۸۱۷ " "
- ۹۔ سورۃ النیس ————— لکھنؤ ۶۱۸۲۰
- ۱۰۔ السورۃ خمس الشریفیۃ ————— لکھنؤ ۶۱۸۲۰
- ۱۱۔ حل ابیات واحادیث وآیات الفلک الضیائیۃ عبد الرحیم " کلکتہ ۶۱۸۲۰
- ۱۲۔ الاشباہ والنظائر ابن نجیم " " ۶۱۸۲۴
- ۱۳۔ البہجۃ المرفیۃ شرح الالبفیۃ السیوطی " کلکتہ ۶۱۸۳۱
- ۱۴۔ عنوان الشرف شرف الدین اسماعیل الیمنی " لکھنؤ ۶۱۸۴۰

### مطبوعات قدیمہ قاریہ

- ۱۔ گلستان بابر ترجمہ لاطینی سعدی شیرازی ۱۶۹۰-۱۷۱۵
- ۲۔ تذکرہ سلاطین ایران بعد الاسلام بامقصد و ترجمہ بزبان اطالوی میرخواند ہروی " و اسناد ۱۷۱۵ء
- ۳۔ توزکات تیمور ابوطالب حسینی بترجمہ " اوکسفورڈ ۱۷۵۰ء
- ۴۔ تذکرہ سلاطین ایران بعد الاسلام بامقصد و ترجمہ بزبان اطالوی میرخواند ہروی " غوثین ۱۸۱۸ء
- ۵۔ کتاب زبور ولیم گلن - ترجمہ " لندن ۱۸۳۵ء
- ۶۔ کتاب المقدس توریت ٹومس کنستبل - " " ادن بورخ ۱۸۴۵ء

## قدیم مطبوعات فارسیہ ہند

۱۔ کشف اللغات	دو جلد	عالمگیری و مستطلاح جوزت	مطبوعہ کلکتہ	۶۱۸۰۶
۲۔ ہدایہ	چار جلد	غلام یحییٰ خاں۔ مترجم	" "	۶۱۸۰۷
۳۔ شاہنامہ فردوسی	فردوسی	" "	" "	۶۱۸۱۱
۴۔ قرآن سراجیہ	—	" "	" "	"
۵۔ محمد حیدریہ	محمد صادق اختر	"	لکھنؤ	۶۱۸۲۰
۶۔ گلستہ نشاط	منو لال۔ مرتب	"	کلکتہ	۶۱۸۳۶
۷۔ سیر المتاخرین	غلام حسین طباطبائی	"	" "	"
۸۔ دیوان زخمی	رتن سنگھ زخمی	"	لکھنؤ	۶۱۸۳۷
۹۔ نزمہ الناظرین	کمند لال اشکی الہی	"	" "	۶۱۸۳۹
۱۰۔ جام جم	سر سید احمد خاں	"	اکبر آباد	۶۱۸۴۰
۱۱۔ حدائق البنوم	رتن سنگھ زخمی	"	لکھنؤ	"
۱۲۔ نفائس اللغات	اودھ الدین بلگرامی	"	" "	۶۱۸۴۱
۱۳۔ شرح گل کشتی	رتن سنگھ زخمی	"	" "	۶۱۸۴۲
۱۴۔ دستور محبت	لچھی نرائن	"	" "	۶۱۸۴۳
۱۵۔ مفردات اہلیہ	فرید الدین مراد آبادی	"	اکبر آباد	۶۱۸۴۷
۱۶۔ انشائے مادھورام	مادھورام	"	لکھنؤ	"
۱۷۔ مرآۃ الخیال	شیر خاں	"	عمرہ الاخباء	۶۱۸۴۸
۱۸۔ کلیات فرد	ابوالحسن النعمانی پھلواری	"	کلکتہ	۶۱۸۵۱
۱۹۔ مہر نمرود	اسد اللہ خاں غالب	"	دہلی	۶۱۸۵۲
۲۰۔ تفسیر مجلستان سعدی	ہر گوپال تفتہ	"	نولکشتو	۶۱۸۵۷









مصنف نے عجیب فنی صنعت میں یہ کتاب مرتب کی ہے۔ مسلسل پڑھی جائے تو علم فقہ کا رسالہ ہے۔ پہلی جدول میں فن عروض، دوسری میں تاریخ، تیسری میں نحو اور چوتھی جدول میں فن قافیہ۔ اس طرح یہ کتاب پانچ فنوں کے رسائل پر مشتمل ہے۔

۹۔ پنج گنج خسروی (فارسی) دلیر چیمپراموی مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء صفحات ۲۸

اس رسالہ میں مصنف نے بڑی صنعت رکھی ہے۔ مسلسل بلا لحاظ جدول پڑھا جائے تو نثر میں قصہ عشق و محبت ہے جس میں طاثر منہس کی مدد سے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ پہلی جدول سے لے کر چوتھی جدول تک مختلف بحور و قوافی میں متفاوت عاشقانہ مثنویاں ہیں۔ مندرجہ بالا عربی کتاب میں بھی یہی صنعت ہے مگر اس میں نثر ہی میں طبع آدمائی کی گئی ہے۔ اس رسالہ فارسی میں نثر و نظم دونوں کو سمودیا گیا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔

## غیر مسلم مصنفین کی فارسی تصانیف

برادران وطن خصوصاً ہندو شعراء وادباء نے اردو ادب میں جو چار چاند لگائے وہ اہل علم وادب سے پوشیدہ نہیں۔ اس دور قحط الرجال میں بھی ہمارے ملک میں ہزاروں ایسے ہندو ادیب نظر آتے ہیں جو برابر اردو ادب کی بقا و ترقی میں سرگرم کار ہیں۔ فارسی زبان وادب کی ان برادران وطن نے بیسویں صدی کے اوائل تک جو غیر فانی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل فہرست سے ہو سکے گا۔ یہ وہ تصانیف ہیں جو مولانا آزاد لائبریری کے فارسی سیکشن میں موجود ہیں۔ یہ فہرست احصائی نہیں بلکہ نُشتہ نمونہ از خروارے ہے۔

نشر

۶۱۸۷۷	مطبوعہ ۱۸۷۷ء	بنو الی جی دلی	۲۔ پر بودہ چند راودی ناک
۶۱۸۷۹	"	بخت سنگھ	۳۔ عجیب القصص معروضہ بستان عشرت
۶۱۸۵۹	"	چرخ لال	۴۔ سوانح عمری
۶۱۸۷۰	"	راج کرن	۵۔ کشائش نامہ
۶۱۸۵۴	"	روپ نرائن	۶۔ شمش بہت
۶۱۸۵۲	"	سدر لال	۷۔ گلشن رنگین
۶۱۸۵۱	"	کنج بہاری لال	۸۔ تحفۃ العجائب
۶۱۸۹۱	"	راج امرت لال	۹۔ منشآت
۶۱۸۷۹	"	جے سکھ رائے	۱۰۔ انشائے راحت جان
۶۱۸۷۸	"	وارثہ، حقیر کوٹی مل	۱۱۔ صفات کائنات
۶۱۸۷۹	"	"	۱۲۔ مطلع السعدین
۶۱۸۸۴	"	نول کشور	۱۳۔ نگار دانش
۶۱۸۷۸	"	اننت چند داؤد نگری	۱۴۔ منشآت فاندان جواہر مل خطاط
۶۱۸۷۶	"	تمیز، کالے رائے	۱۵۔ انشائے تمیز
۶۱۸۷۵	"	دولت رائے	۱۶۔ انشائے دولت رام
۶۱۸۷۲	"	دین دیال	۱۷۔ ارمغان بے بہا
"	"	رگبر دیال	۱۸۔ چہار چمن موسوم بانشائے بہاریہ
۶۱۸۶۵	"	فتح چند	۱۹۔ خلاصۃ الآداب
۶۱۸۷۲	"	نادان، کامتا پرشاد	۲۰۔ انشائے بے نقاط
"	"	پچھی رام	۲۱۔ انشائے مفید
۶۱۸۷۵	"	پچھی نرائن	۲۲۔ رقعات



۶۱۸۴۷	مطبوعہ	۶۱۸۴۷	مادھورام	۲۳۔ انشائے مادھورام
۶۱۸۸۲	"	۶۱۸۸۲	ہر سہائے	۲۴۔ انشائے ہر سہائے
"	"	"	ہر نرائن	۲۵۔ خیالات نادر
۶۱۸۷۹	"	۶۱۸۷۹	ہیر لال عفت ہری کرشن	۲۶۔ انشائے لطیف
"	"	"	مخلص، اندرام	۲۷۔ چمنستان
۶۱۸۴۰	"	۶۱۸۴۰	زخمی، رتن سنگھ	۲۸۔ حدائق النجوم
۶۱۹۴۱	"	۶۱۹۴۱	آمنہ ناتھ	۲۹۔ آصف جاہی یعنی نصاب فارسی
۶۱۹۶۳	"	۶۱۹۶۳	گویا، بھائی نذلال	۳۰۔ کلیات
۶۱۹۰۱	"	۶۱۹۰۱	ہرمزجی (پارسی)	۳۱۔ گوہر دانش
۶۱۸۸۰	"	۶۱۸۸۰	شیدا، امر ناتھ	۳۲۔ خیالات شیدا
۱۳۳۰	"	۱۳۳۰	اجے سنگھ لاہوری	۳۳۔ دوست داران وطن
۶۱۸۳۹	"	۶۱۸۳۹	اشکی الہی، کندن لال	۳۴۔ نزمیہ الناظرین
۶۱۸۹۲	"	۶۱۸۹۲	درغا پرشاد	۳۵۔ بوستان اودھ
۶۱۸۹۷	"	۶۱۸۹۷	"	۳۶۔ گلستان ہند
۶۱۹۱۸	"	۶۱۹۱۸	سبحان رائے بھنڈاری	۳۷۔ خلاصۃ التواتر
"	"	"	گردھاری لال	۳۸۔ تاریخ ظفرہ
"	"	"	مکھن لال	۳۹۔ تاریخ یادگار
۶۱۸۹۰	"	۶۱۸۹۰	منارام	۴۰۔ رسالہ دربار آصفیہ
۶۱۹۴۹	"	۶۱۹۴۹	فراقی، پریم کشور	۴۱۔ وقائع عالم شاہی
۶۱۸۵۰	"	۶۱۸۵۰	دولت رائے	۴۲۔ مرآۃ دولت عباسیہ
۱۳۱۴	"	۱۳۱۴	شفیق، بھگتی نرائن	۴۳۔ لسیاط القاتم

۴۴۔ مجموعہ مکاتیب	گنگا دھر مجموعہ دار مطبوعہ
۴۵۔ رامائن امر پرکاش	امر سنگھ ۶۱۸۷۷
۴۶۔ متاکشرا	دگیا نیشور ۶۱۸۷۹
۴۷۔ تحفۃ الاسلام	اندرمن "
۴۸۔ گانھا	پور داؤد (پارسی) مترجم "
۴۹۔ اوستا	" " " "
۵۰۔ رامنائے سنکرت	ایندو شکیر ۱۳۳۰ اثر
۵۱۔ پرشین سانکرت گرامر	کپنن راہہ ۱۹۵۳ م
۵۲۔ بہار ابطال ضرورت	بہار، ٹیچنڈ ۶۱۸۵۱
۵۳۔ بہار محم	" ۶۱۸۹۴
۵۴۔ دریائے عقل	گنگا پرشاد ۶۱۸۷۷
۵۵۔ جواہر المحروف	بہار، ٹیچنڈ ۶۱۸۵۰
۵۶۔ مفتاح اللغات	رام نرائن ۶۱۸۶۹
۵۷۔ مصباح العلم	نعل بہادر ۶۱۸۷۹
۵۸۔ جواہر منظومہ	دولت رائے ۶۱۸۷۸
۵۹۔ مرآة الصرف	" " "
۶۰۔ مخزن اخلاق	درگا پرشاد ۶۱۸۹۹
۶۱۔ فی باید پسندید	رائے چند ۶۱۸۹۷
۶۲۔ نازک خیالات یعنی ترجمہ آتم بلاس	منسا رام خوشابی ۱۹۰۲ م
۶۳۔ منتخب المصادر	سنت پرشاد ۶۱۸۶۸
۶۴۔ منتخب تنقیح الاخبار	کنن لال۔ راہہ بہادر ۶۱۸۵۰
۶۵۔ شرح کل کشتی	زخمی، رتن سنگھ ۶۱۸۴۲



(نظم)

۱۔ بہارستان	بہار، ٹیکچر۔ مطبوعہ ۱۸۸۳ء
۲۔ دیوان الفتی	الفتی، پیارے لال " ۱۸۷۰ء
۳۔ دیوان انور	انور، کاٹکا پرشاد " ۱۸۹۵ء
۴۔ دیوان انس	انس، لال چند " ۱۸۵۲ء
۵۔ خیال بے خودی	بیخود، سیتل سنگھ " ۱۸۷۱ء
۶۔ دیوان تفتہ	تفتہ، ہرگوپال " ۱۸۵۷ء
۷۔ مطلع خورشید	جوہر، جواہر سنگھ " ۱۸۶۰ء
۸۔ دیوان صنیر	صنیر، نرائن داس " ۱۸۹۰ء
۹۔ دیوان مائل	مائل، چھنی لال " ۱۸۸۹ء
۱۰۔ دیوان موزون	موزوں، راجہ رام نرائن " ۱۸۷۱ء
۱۱۔ دیوان وقار	وقار، جوالا پرشاد " ۱۸۵۱ء
۱۲۔ قصائد پرفوائد	بہجت، نقشن لال " ۱۸۷۴ء
۱۳۔ برترہری شک مول	گھنشیام سنگھ " "
۱۴۔ دیوان زخمی	زخمی، رتن سنگھ " ۱۸۳۷ء
۱۵۔ دیوان گویا	گویا، بھائی نند لال " "
۱۶۔ رامائن	امانت رائے " ۱۸۷۱ء
۱۷۔ سری بھاگوت	" " ۱۸۵۵ء
۱۸۔ مناجات ہفت پیکر	ادماں پرشاد " ۱۸۹۵ء
۱۹۔ ریاض بہار آگین (سوداماں چتر)	نخشی رام " ۱۸۸۳ء

۶۱۸۶۰	مطبوعہ	تفتہ، ہرگوپال	۲۰۔ سنبلستان
"	"	شاد، سری کرشن	۲۱۔ مظہر الحسن
"	"	گوپی ناتھ	۲۲۔ رامائن رام چتر
۶۱۸۴۳	"	پچھی نرائن	۲۳۔ دستور محبت
۶۱۹۲۱	"	فروغ، بدری کرشن	۲۴۔ گوہر عرفان فروغ
۶۱۹۳۵	"	نانک شاہ	۲۵۔ دیوان نانک شاہ
۶۱۸۷۷	"	وقار، رائے کشن کمار	۲۶۔ اختراع جدید
۶۱۹۰۲	"	ہرلیج، سیٹھ	۲۷۔ رامائن
۶۱۸۷۶	"	ہندی، کنھیالال	۲۸۔ ظفر نامہ ریخت سنگھ
۶۱۸۷۳	"	"	۲۹۔ یادگار ہندی
۶۱۸۵۷	"	تفتہ، ہرگوپال	۳۰۔ تفسیر گلستان سعدی
۶۱۸۸۱	"	خود رفتہ، بہاری لال	۳۱۔ ترجیع بند
۶۱۸۹۸	"	فروغ، بدری کرشن	۳۲۔ نوۃ وفات و مسدس شہر آشوب
۶۱۸۷۸	"	ہندی، کنھیالال	۳۳۔ ہندگی نامہ
۶۱۸۳۶	"	منوالال - مرتب	۳۴۔ گلدرتہ نشاط
۶۱۸۹۸	"	درگاپر شاد	۳۵۔ حدیقہ عشرت
۶۱۹۵۸	"	ہندی، کنھیالال	۳۶۔ سفینہ ہندی
۶۱۹۵۹	"	خوشگو، بندرا بن داس	۳۷۔ سفینہ خوشگو
"	"	شاد، سرکشن پرشاد	۳۸۔ ایمان شاد
۶۱۹۱۹	"	"	۳۹۔ مثنوی آئینہ وجود

مشرقی شعبہ مطبوعات میں اکثر کتابوں کے مختلف و متعدد ایڈیشن لائبریری میں موجود



میں جس سے ریسرچ اسکالروں کو اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملتی ہے اور شعبہ مخطوطات میں کسی مخطوطہ پر کام کرنے والے دانشوروں کو بھی شعبہ مطبوعات سے استفادہ ناگزیر رہتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں شعبے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## شعبہ مخطوطات

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس لائبریری کی ابتداء بانی درسگاہ سرسید احمد خاں اور ان کے خلیفہ الرشید حبیب سید محمود کی کتابوں سے ہوئی اور جب مختلف ارباب دانش اور اہل علم کے عطیات کا اضافہ ہوا تو مشرقی و مغربی شعبوں کی تقسیم ناگزیر ہوئی پھر جب قلمی نسخوں کی بہتات ہوئی تو مشرقی شعبے کو مطبوعات و مخطوطات دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ اب مطبوعات کا حصہ اورنٹل ڈویژن اور مخطوطات حصہ مینوسکرپٹس ڈویژن کہلاتا ہے۔ دونوں کا اسٹاف اور محل وقوع علیحدہ ہے۔ باہمی ربط قائم رکھنے کے لئے آخر الذکر ڈویژن کا اسسٹنٹ لائبریرین ہی اول الذکر ڈویژن کا انچارج بھی ہے۔ دونوں شعبوں میں تقریباً ایک لاکھ دس ہزار مطبوعات و مخطوطات ہیں۔

شعبہ مخطوطات اس وقت گیارہ کلکشنوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یونیورسٹی کلکشن ۷۔ احسن کلکشن

۲۔ سبحان اللہ ۸۔ آفتاب

۳۔ عبدالسلام ۹۔ جواہر میوزیم

۴۔ شیفۃ ۱۰۔ فرنگی محل

۵۔ منیر عالم ۱۱۔ حبیب گنج

۶۔ سر سلیمان

ان سبھی کلکشنوں پر نظر ڈالنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

ز فرق تا بقدم ہر کجا کفی محرم کشتہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست  
اگران کے نوادر و خصائص کو قلمبند کیا جائے تو مستقل ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔  
حتی الوسع ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے قابل ذکر گوشوں پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔

## قرآن مجید

لائبریری میں مطبوعات و مخطوطات قرآن پاک کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ مخطوطہ قرآنوں  
کی تعداد ۱۹۰-۷۰، تقریباً ہر نسخہ خصوصیات کا حامل ہے۔ چند نسخوں کا قدر تفصیل سے  
ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن شریف مترجم فارسی۔ تقطیع کلاں، طول ۲۴ اینچ، عرض ۱۴ ۱/۲ اینچ۔  
کاغذ کشمیری، بخط کشمیری۔ بین السطور ترجمہ فارسی، شنگرفی، برعاشیہ تفسیر حسینی، دو دو  
صفحات اول و آخر و ابتدا ہر منزل مطلقاً، لاجوردی رنگ آمیزی، جداول مطلقاً و لاجوردی  
ع شنگرفی، اسمار سور و حوضہ مطلقاً، خط گوشہ لاجورد۔ در آخر تفسیر نوشتہ بید محمد مختار  
— ۲۵ جمادی الآخر ۱۲۸۲ھ

۲۔ قرآن مجید۔ بخط اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ہند۔ خوشخط بخط نسخ۔ ورق آخر  
کی پشت پر کشتہ مرقوم ہے لیکن خود عالمگیری کی مندرجہ ذیل عبارت تاریخ کتابت کی نفی  
کرتی ہے:-

”من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام نام نوشتہ ام، تاریخ ہم نوشتن در کار نیست، اگر  
برائے ادب سائنہ نوشتہ اند علم و حبیب و کیفی“ (کلمات طیبات عالمگیر (۴) ۳۲۲ عبد السلام علیہ السلام)  
۳۔ قرآن مجید۔ تقطیع کلاں مطلقاً جدول مترجم فارسی بہت ہی باریک کام بنایا گیا ہے  
جمہوریت ہی دیدہ زیب ہے کاتب مولانا عبدالرحمن احمد آبادی کے شاگرد ہیں جو  
کوشاہ کے معاصر تھے۔





خصوصی صفحات کی جداول مرتع و منقش۔ ابتداء میں چند اوراق پر ہر سورہ کے فوائد و خواص و تعداد حروف وغیرہ۔ آخر میں تین صفحات پر فالنامہ حروف، منظوم بزیان فارسی، بروقی سادہ ہر مکتب خورد ”محمد عبدالرحیم“ ۱۳۰۹ھ

۱۲۔ قرآن شریف۔ مکتوبہ ۱۳۷۵ھ۔ برحوالی متون و برحواشی، تفسیر عربی۔ بروقی اول یک ہر مربع و دو ہر مدور و ہر۔ غیر صاف۔

۱۳۔ پنجسورہ۔ لوح و جداول و خطوط بین السطور مطلقا، حواشی منقش و مطلقا، نہایت خوشخط و بظہر بن شیخ عبداللہ احمد آبادی شمس۔ بروقی آخر یک ہر مدور ”قابل خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ“ و دو ہر بیضوی ”نیکنام خاں“ و ”محمی الدین علی خاں“ شاہی کتاب خانہ میں داخل رہا ہے۔

۱۴۔ قرآن شریف۔ نہایت خوشخط و بظہر بن شیخ۔ جداول و علامات آیات و خطوط سطور مطلقا، عنوان ہائے سورہ برنگ سفید، مکتوبہ ۱۳۷۵ھ

۱۵۔ طومار بخط غبار۔ یہ ۱۸ فٹ ۳ انچ طویل اور ۳ انچ عرض کاغذی پیگڑی ہے جس کے نیچے کپڑا لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ تعوذ و تسمیہ، نصر من اللہ و فتح قریباً و کلمات درود کے ہر حرف و نقطہ و جملہ میں پورا قرآن پاک بخط غبار لکھا گیا ہے۔

۱۶۔ قرآن شریف بخط غبار شکل کتبہ۔ یہ کتبہ پارچہ موچی پر قرآن پاک کی سات منزلوں میں سے چار منزلوں پر بخط غبار مشتمل ہے۔ سر کتبہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کا طغرا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت :-

”حضرت قطب شیخ فرید صاحب گنج شکر قدس اللہ سرہ“

میں ابتدائی چار منزلیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کتبہ کا طول ۴ فٹ ایک انچ اور عرض دو فٹ پانچ انچ ہے۔ نیچے عبارت درج ہے :-

”از سید شوکت حسن خفی رقم امردہوی ۱۳۲۵ھ“



۱۔ قرآن پاک۔ شکل صدری۔ یعنی القیصل بوش المصنفی لحرز الملوك والابطال  
فی المحروب والمعارک۔ یہ صدری خفی خط نسخ میں پورے قرآن پر مشتمل ہے۔ اس کا کلا  
اور دامن بڑے خوشامطرز پر بنایا گیا ہے نیلے اور سرخ رنگ نے خوشنائی میں مزید اضافہ  
کر دیا ہے۔ پوری صدری مرصع ہے۔ یہ بڑی نادر اور نایاب چیز ہے۔ طول دو فٹ  
۱۲ انچ، عرض ایک فٹ ۱۰ انچ، آستین طول و عرض دس انچ۔  
سر اس مسعود رنبیرہ بانی درس گاہ سرسید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر  
کے زمانے میں دورہ یورپ کے موقع پر اپنے دوست لارڈ لوکھین کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں  
یہ تحفہ حاصل کیا۔ (ریکارڈ رجسٹر آفس)

## قرآن شریف کا تحفہ

یوپی گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ لارڈ لوکھین کے ایک دوست نے مسلم یونیورسٹی  
علی گڑھ کو ایک قبائندر کیا۔ جس پر تمام قرآن شریف لکھا ہوا ہے۔ یہ خلافتِ شام کے  
زمانے میں کوئی افسر انگلستان لے گیا تھا اب پھر مسلمانوں کو واپس دے دیا گیا۔  
(ہفت روزہ ایمان۔ سیرت کمیٹی پٹی لاہور۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء)  
(بحوالہ ہفتہ وار المنبر لائل پور۔ پاکستان۔ جلد ۱۳ شمارہ ۱۲ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء)  
ادعیہ ۱۔ دلائل ہجرات۔ مؤلفہ محمد بن سلیمان الجزولی المتوفی ۸۵۰ھ۔ نہایت خوشخط نسخہ  
۲۔ جوش صفیر و کبیر۔ بخط نسخ نہایت اعلیٰ نسخہ۔ مکتوبہ قاسم الداعوی ۱۲۸۳ھ اول چار  
اوراق تمام مرصع، بین السطور و حواشی مرتب بہ نگارگری بظلال تمام عنوان، مرقومہ برنگ سفید۔  
۳۔ ادعیہ۔ بخط نسخ مکتوبہ باقی محمد ۱۲۸۵ھ۔

## قدیم نسخے

مرنی ۱۔ قرآن شریف (سورۃ فاتحہ و سورۃ بقرہ) برچرم آہو، معرثی از نقاط و اعراب۔

بخط کوئی مطلقاً منقش و خوشخط۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

۲۔ میمون الاجوبہ فی فنون الاسلہ۔ تصنیف ابوالقاسم عبدالکریم القشیری المتوفی ۳۶۵ھ

بخط المصنف پانچویں صدی ہجری کی تصنیف و ترقیم۔

۳۔ نہج البلاغہ۔ مرتبہ الشریف الرضی المتوفی ۶۱۴ھ۔ دو جلد، مکتوبہ ۵۳۵ھ۔ کاتب

علی بن ابی القاسم بن علی چھٹی صدی ہجری کے ربع ثانی میں اس کی کتابت کا اختتام اسی سال ہوا ہے جس سال کاتب نے حج کیا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کی دو عظیم یادگاریں اس سال سے وابستہ ہیں

یہ نسخہ مختلف کتاب خانوں کی زینت رہا ہے۔ دونوں جلدوں کے اول و آخر اوراق پر گیارہ تحریریں ہیں۔ تین پر ۱۲۰۲ھ، ۱۱۸۳ھ، ۱۲۵۷ھ تاریخ پڑی ہے سات تحریروں کے ساتھ دستخط بھی ہیں۔ ۱۶ مہر میں ہیں، ۵ محلوک ہیں ۴ ربع مہر میں ”سید ابو جعفر باسطلی“ کی ہیں، ایک ربع مہر ”سید محمد عباس المہوسوی“ کی ہے اور چھ محلوک و مدور مہر میں ”الواثق بالملک السعیدی عبدہ مبارک بن عبد اللہ العالی الادالی“ کی ہیں۔ اس کا مقابلہ لاویب افضل الدین المحسن کے ذاتی نسخہ سے ہوا ہے۔

۴۔ صحاح الجوبہری۔ تالیف ابو نصر ساعیل بن حاد الجوبہری المتوفی ۳۹۶ھ۔ بخط نسخ، مکتوبہ ۶۲۸ھ روشنائی شیرخرا۔ یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول کے سرورق پر کچھ تحریریں اور مہر ہیں۔ اکثر تحریریں متادی گئی ہیں، باقی ماندہ تحریریں میں اہم تحریر محمد بن احمد بن مسعود القنوی المتوفی ۴۷۷ھ کی ہے۔ عبارت یہ ہے :-

”من کتب العبد الفقیر الی اللہ الغنی محمد بن احمد بن مسعود القنوی الحنفی متواترہ“

صمصام الملک کی مہر بھی ہے۔ سید نور الحسن نادر کی بھی تحریر اور مہر ہے ”نور چشم اصفیانا در حسن“ ایک مہر ”تلمذہ الشیخ“ بھی ہے۔ دوسری جلد کے آخر میں یہ عبارت ہے ”بلغ مقابله بخط ابن الجوالیقی“





- ۷- مثنوی معنوی - بخط نستعلیق - مکتوب ۸۶۲ هـ  
 ۸- خمس نظامی متوفی ۶۰۲ هـ .. مکتوب ۸۴۳ هـ - مصور -  
 ۹- مثنوی معنوی - .. مکتوب ۸۸۸ هـ  
 ۱۰- مثنوی ز سیر - از خسرو دهلوی متوفی ۷۲۵ هـ - مکتوب ۸۸۶ هـ - خط نستعلیق، جدول طائی  
 ۱۱- کلیات عماد فقیه متوفی ۷۴۳ هـ - مکتوب قبل از ۸۸۸ هـ ..  
 ۱۲- انتخاب از اختیارات بدیع - از حاجی زین الدین عطار - خط نستعلیق، مکتوب حسن علی مشهور  
 به صبوری ۸۸۸ هـ -

۱۳- رساله اسامی الادویه - .. خط نستعلیق .. ..

به صبوری ۸۸۹ هـ -

۱۴- معارف العوارف ترجمه عوارف المعارف - از عبدالحسن بن علی برغش بخط نسخ مکتوب ۸۹۷ هـ -

۱۵- رساله قوشچی - .. .. .. ..

اردو بها شا | ۱- نوط زمر صبح - از مرصع رقم، میر عطاء حسین خاں تحسین - مکتوب ۱۱۱۸ هـ

۲- هشت کنشت ترجمه هشت بهشت خسرو - از غلام احمد دهلوی .. مکتوب ۱۱۲۵ هـ

۳- پدمات - از ملک محمد جالسی .. مکتوب ۱۱۳۹ هـ

۴- ترجمه بگلوت گیتا - از راجه بیر بر ندیم اکبر بادشاه .. ..

۵- رس گاہک چند کا شرح رشک پریا کیشواس مکتوب سید غلام نبی سلیم بکری ۱۱۵۹ هـ

۶- امر چند کا .. ..

۷- ده مجلس دکنی منظوم - از ولی دکنی مکتوب ۱۱۹۰ هـ

۸- دیوان سودا .. مکتوب ۱۱۹۵ هـ

۹- دیوان ولی دکنی .. مکتوب ۱۱۹۸ هـ

۱۰- فقہ ہندی منظوم - از عبدی - سال تصنیف ناکلمہ



۱۱۔ رسالہ دیدارِ خدا از فیاض الحق - سال تصنیف ۱۰۷۵ھ

کتب عربیہ ساتویں صدی ہجری، کتب فارسیہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری اور کتب اردو و بھاشا گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری تک کی پیش کی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مذکورہ زبانوں کا قدامت کتابت کے لحاظ سے کیسا نایاب ذخیرہ شعبہ مخطوطات میں موجود ہے۔

نادر نسخے ۱۔ حالنامہ بایزید انصاری (فارسی) مرتبہ علی محمد بن ابی بکر قندھاری مرید و خادم خاندان بایزید انصاری۔ بایزید عہد اکبری کے مشہور بزرگ تھے جنہیں لوگ پیر روشن ضمیر کہتے تھے اور جنہوں نے پہاڑوں میں ایک دنیوی حکومت قائم کر رکھی تھی اور جن سے شاہانِ دہلی پریشان اور حکومت کا امن پر لگندہ تھا۔ یہ کتاب روشنیہ تھریک کی بہترین تاریخ ہے۔ اس نسخے کے علاوہ دنیا میں کسی اور نسخے کے وجود کا علم نہیں۔ مکتوبہ بخط نسخ۔

۲۔ نفائس المآثر (فارسی) از مرزا علاء الدولہ نامی قزوینی۔ سال تالیف ۹۷۳ھ۔ اس کتاب کا دوسرا نام تذکرہ علاء الدولہ بھی ہے۔ ابتداء میں دسویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے پھر تہذیبوں کی تاریخ بابر سے لے کر تک کی لکھی گئی ہے اس تذکرہ کے کسی اور نسخہ کا علم نہیں۔ برٹش میوزیم کے مجموعوں میں اس کے کچھ اقتباسات ملتے ہیں۔ یہ نسخہ بخط نسخ مکتوبہ ۱۰۷۵ھ ہے۔ یہ نسخہ مولانا غلام علی آزاد بگرامی کے پاس رکھا ہے۔ جابجا ان کی تصحیحات اور حواشی مدج ہیں۔ سرورق پران کی تحریر دستخط اور ہر ملی موجود ہے۔

۳۔ مونس الاحرار فی دقائق الاشعار (فارسی) مشتمل برہفاد و پنج شعراء۔ از احمد بن محمد کلاتی۔ سال تصنیف ۱۰۷۵ھ۔ بخط نستعلیق غنیمت اوراق ۴۰۷، تقطیع کلاں۔ اس تذکرہ کے کسی دوسرے نسخے کا علم نہیں۔

۴۔ قصائد نصیۃ از عمید، فاضل اللہ لوکی (معاصر سلطان ناصر الدین محمد متوفی ۱۰۷۵ھ) بخط نستعلیق خفی بہتر۔ یہ نسخہ بھی نایاب ہے۔

مستور نسخے ۱۔ خطہ نظامی گنجوی متوفی ۱۰۷۵ھ۔ مکتوبہ حسین عبد اللہ ۱۰۷۵ھ۔ تصاویر، بخط نستعلیق خوشخط،

ابتدائی صفحات مطلقاً سرورق پر ہیں۔

۲۔ دیوان حافظ شیرازی متوفی ۱۱۹۷ھ۔ مکتوبہ ۱۱۹۷ھ، بخط نستعلیق نفیس، ۳ مرتبے۔

۳۔ مثنوی معنوی۔ از جلال الدین محمد رومی متوفی ۷۴۰ھ۔ مکتوبہ ۱۱۹۷ھ، بخط نستعلیق نفیس،

کاتب عبداللہ بن قنبر قندی، مزین بہ تصاویر کثیرہ۔ میر نور اللہ کے حواشی بھی درج ہیں۔

۴۔ مثنوی حسینی۔ مصنفہ ۱۱۶۷ھ۔ تصاویر ۲۹۔

۵۔ گلستان و برہان پستان۔ از سعدی شیرازی متوفی ۷۹۱ھ۔ مکتوبہ حامد ساکن ہی ۱۲۵۷ھ۔

تمام مطلقاً مجذول و مرصع۔ تصاویر ۱۹۔

۶۔ حمد حیدری۔ از محمد رفیع باذل مشہدی۔ بخط نستعلیق پاکیزہ، مصوّر و مطلقاً۔ تصاویر ۲۰۔

۷۔ شاہنامہ فردوسی متوفی ۱۱۷۷ھ۔ (۴ نسخے) مصوّر۔

مرصع و منقش نسخے ۱۔ اکریا۔ از سعدی شیرازی متوفی ۷۹۱ھ۔ مکتوبہ بدیع علی تکیہ آغا مرزا ۱۲۷۷ھ بخط نستعلیق

نہایت خوشخط، زرافشان۔

۲۔ ہفت بند کاشی۔ مکتوبہ عطار رقم و مرصعہ محمد علی ۱۲۸۰ھ۔ بخط نستعلیق خوشخط۔ زمین سنہریا۔

۳۔ محمد حسن کاشمیری۔ مرصع بطلا۔ ” ” ” ”

۴۔ ملفوظات صاحبقران۔ حالات امیر تیمور۔ از افضل بخاری۔ در عہد شاہ بہاں۔ مکتوبہ

ہدایت اللہ ۱۲۲۲ھ ابتدائی دو صفحوں پر نہایت خوبصورت سنہرا کام ہے۔ اس نسخہ کی کتابت مرزا

ایزد بخش بہادر خلف شاہ عالم بادشاہ غازی کے لئے کی گئی ہے آخر میں ان کی ہر ثبت ہے۔

۵۔ چہل حدیث با ترجمہ فارسی منظوم۔ بخط نستعلیق جلی تمام صفحات مرصع و مذہب مطلقاً

بر حواشی نگاری بطلا، مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۱ھ۔

۶۔ مرغوب القلوب (مثنوی)۔ بخط نستعلیق جلی تمام صفحات مرصع و مذہب و مطلقاً، بر حواشی

نگاری بطلا، مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۱ھ۔

خوشخط نسخے ۱۔ دیوان لسانی شیرازی متوفی ۱۲۱۷ھ۔ بخط نستعلیق نفیس، مکتوبہ حسن قلی ۱۲۹۷ھ۔



- ۲۔ خمسہ نظامی گنجوی۔ مکتوب فیروز محمد بن سلیمان۔ بخط نستعلیق خوبتر۔
- ۳۔ کلمات۔ مکتوبہ بجلال اللہ ۱۰۹۳ھ۔
- ۴۔ مثنوی معنوی۔ مکتوبہ ۱۰۸۹ھ، بخط نستعلیق نہایت خوشخط، مطلا۔
- ۵۔ زاد المعاد۔ ۱۲۳۵ھ، کاتب طاہر شیرازی، بخط نسخ خوشخط، مجلد طلائع البحر زبرداری
- ۶۔ طبقات اکبری۔ از خواجہ نظام الدین احمد بخشی۔ مکتوبہ ۱۰۸۵ھ، بہرہ مصنف، کاتب عبد الحق قریشی۔
- ۷۔ مجموعۃ الرسائل الاربعۃ فی النافذۃ المذہبیۃ۔ از نور اللہ شوستری و حسین بن عبد الصمد عالمی
- و غیرہا مکتوبہ ۱۱۱۶ھ، بخط نسخ خفی بہتر۔ بر جواشی گلکاری، لوح مطلا، نسخہ مجلد بطلا، مشتمل بر چہار
- رسائل۔ سرورق پردہ ہر ربع محلوک۔ کاتب عبد الوہاب بن محمد طاہر۔ مقام کتابت احمد آباد گجرات۔
- خودنوشت نسخہ ۱۔ عیون الاجوبہ فی فنون الاسلہ۔ از ابو القاسم عبدالکریم القشیری المتوفی ۱۰۶۵ھ۔
- خط المصنف۔ ۲۔ فتح المتعال فی مدح النعال۔ از احمد بن محمد المغربي المتوفی ۱۰۵۳ھ۔ بخط المصنف۔
- ۳۔ مجموعۃ الرسائل۔ از ابن طولون، محمد بن علی بن احمد الصالحی الدمشقی الخفی المتوفی۔
- ۴۔ تلخیص الشفا۔ از فضل مام خیر آبادی متوفی ۱۲۲۳ھ۔ مکتوبہ ۱۲۲۷ھ۔
- ۵۔ حاشیۃ افق المبین۔ از فضل حق خیر آبادی متوفی ۱۲۷۸ھ۔
- ۶۔ دیوان صائب متوفی ۱۰۸۸ھ۔ مکتوبہ ۱۰۸۳ھ۔ . . . . بخط المصنف
- ۷۔ شرح خطبۃ القواعد۔ از فخر الدین محمد۔ مکتوبہ ۹۰۰ھ۔ . . . .
- ۸۔ چارچہن۔ از غلام محی الدین مبتلا و عشق۔ ۱۱۸۷ھ۔
- ۹۔ ارتباج الاکباد بارباح نقلا ولاد۔ از الحافظ السخاوی، محمد بن عبد الرحمن متوفی ۹۰۴ھ۔
- ۱۰۔ حالات خودنوشت۔ از نجم الدین علوی کاکوردی قاضی القضاۃ مملکتہ متوفی ۷۲۹ھ۔
- ۱۱۔ ترغیب السالک (مسودہ) از مصطفیٰ خان شفیقہ متوفی ۱۲۸۶ھ۔ . . .
- ۱۲۔ منیار الایمان فی آداب القرآن۔ از سید عبد الجبار بن سید علاء الدین، مکتوبہ ۱۲۰۹ھ۔
- ۱۳۔ ہدایۃ النجاۃ۔ از عبد الحلیم فرنگی محلی لکھنوی متوفی ۱۲۸۵ھ، بخط نستعلیق شکست آئین مکتوبہ ۱۲۵۲ھ۔





درج ہیں۔ ورق ۱۰۴ کے حاشیہ پر آخری مکمل قول لکھ کر عبارت بھی لکھی ہے۔ تاریخ ۱۰۷۰ھ ڈالی ہے۔  
 یہ نسخہ بھی شاہی کتابخانوں میں رہ چکا ہے مختلف تحویل داروں کی تقریریں درج ہیں قدیم ترین تحریر  
 ۳ جمادی الاول ۱۱۸۷ھ کی ہے۔ تین غیر مقررہ ہریں بھی ہیں۔  
 ۱۔ جہرۃ اشعار العرب۔ مرتبہ ابی الخطاب القرشی۔ مکتوبہ ۹۹۸ھ۔ اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے  
 کہ اول نسخوں میں اور اس نسخہ میں نمایاں اختلافات ہیں۔ اس سے قدیم نسخہ کا بھی علم نہیں۔  
 ۱۱۔ سہو المصلین۔ از حسن بن محمد بن احمد۔ مکتوبہ ۸۳۱ھ۔ فقہ کی ایک غیر معمولی کتاب۔  
 ۱۲۔ کتاب الامتاع باحكام السراع۔ از کمال الدین ابوالفضل جعفر بن ثعلب الادوی الشافعی  
 المتوفی ۷۲۸ھ۔ مکتوبہ ۱۰۲۷ھ۔

۱۳۔ حقیقتہائے ہندوستان۔ (در احوال مدخل و مخرج صوبجات ہندوستان) ادبھی نائن  
 شیفق اورنگ آبادی۔ سال تصنیف ۱۲۰۴ھ۔ مکتوبہ ۱۲۰۸ھ۔ سرورق پر مصنف کی تحریر  
 اور دستخط ہیں۔

۱۴۔ ذکر الملوک (تاریخ حقی) مختصر تاریخ ہند از عہد معز الدین محمد بن سام متوفی ۶۰۲ھ  
 تا عہد اکبر بادشاہ۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ۔ مکتوبہ ۱۰۲۰ھ۔ سال تصنیف ۱۰۰۵ھ  
 ۱۵۔ اشعت اللغات۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مکتوبہ محمد علی الدہلوی ۱۰۲۸ھ۔  
 بخط نسخ خفی پاکیزہ۔ در آخر ترجمہ بقلم المصنف ۱۰۲۹ھ۔

۱۶۔ تانتخ گزیدہ۔ از حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی ۷۵۰ھ۔ سال تصنیف ۷۳۰ھ۔ سرورق  
 پر ہریں۔ یہ نسخہ ابوالفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی ملکیت میں رہا ہے سرورق پر ان کی ہر اور دستخط  
 بھی ہیں۔ سرسید احمد خاں کی ملکیت میں بھی رہا ہے ان کی ہریں بھی ہیں۔  
 ۱۷۔ چاول۔ اس چاول پر ایک طرف ڈاکٹر سرعنیا الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم  
 کی تصویر اور دوسری جانب ان کا نام مع خطابات تحریر ہے۔

۱۸۔ المطول۔ از سعد الدین التفازانی المتوفی ۷۹۲ھ بخط نسخ مکتوبہ ۸۳۹ھ کاتب  
 سید شریف۔ بر سرورق عبارت و دستخط نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ سلسلہ دخول نسخہ کتابخانہ  
 شاہی و ہفت ہر مدور و بیہنوی ”عنایت خاں شاہجہانی“ ”محمد حسن بندہ شاہجہاں“ ”عبد اللہ  
 خان زاد عالمگیر بادشاہ“ وغیرہم و دستخط جائزہ عبد اللہ چلی شہ جلوسی و دیگر جائزہ شہ و برورق  
 آخری ہر مدور و مربع ”صادق جان بندہ شاہجہاں“ وغیرہ و جائزات متفرقہ۔

ہندو مذہب سے متعلق مخصوصی خطوط ۱۔ یحزید۔ بزبان تلگو بر، بھوج پتر۔

۲۔ ڈرامہ ہائے بہاس۔ بزبان ملیالم بر، بھوج پتر۔

یہ دونوں نسخے بہت قدیم اور اہم ہیں۔ کاغذ ہیا ہونے سے قبل مخصوص درخت کی چھال کو  
 پھیل کر باریک بنایا جاتا تھا اور اس پر لکھا جاتا تھا جس طرح ہرن اور دوسرے جانوروں کی کھال



صاف کر کے کتابت کے کام میں لائی جاتی تھی۔ قرآن پاک کے ڈھائی پارے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے  
بخط کوئی ایسی ہی کمال پر لکھے ہوئے ہیں۔

۳۔ شرح فارسی شری گیتاجی۔ از روی شکر بہاس۔ تصنیف شکر اچارج۔ مولف دھریا  
سنیاسی۔ منصور لوح و صفحہ اول مطلقاً۔ بر حواشی نگاری بطلا، نسخہ مجددی، بخط نستعلیق خوشخط،  
متن بربان سنسکرت، شرح بربان فارسی۔

۴۔ شری رام چندر جنم پتر۔ بربان سنسکرت۔ خوشخط منصور۔  
۵۔ ترجمہ فارسی ہا بھارت۔ از نقیب خاں بن عبد اللطیف الحسینی۔ سال تصنیف  
۹۹۲ھ۔ بعد اکبر بادشاہ۔ مکتوبہ عبدالرحمن ۱۱۱۲ھ بمقام کشمیر، بخط نستعلیق۔ ہر ورق پر دو ہر  
مدور غیر مقرر۔ یہ ترجمہ ڈیڑھ سال میں بمبادت چند برہمنان و ملا عبد القادر بدایونی شیخ بہاؤ کیا گیا۔  
۶۔ ترجمہ فارسی بھگوت ہا پران۔ از ابو الفیض صفی متونی ۱۰۰۲ھ۔ مکتوبہ ہرنج رائے کھتری  
ساکن لہارہ ۱۲۱۵ھ، بمقام چھاؤنی ساہنور۔ لوح مطلقاً، نسخہ مجددی، بین السطور نیز مطلقاً،  
بخط نستعلیق غنیمت۔

۷۔ ترجمہ بھگوت گیتا۔ در بھاشا۔ از راجہ بیر برہنیم اکبر بادشاہ۔ مکتوبہ دولت شاہ  
۱۱۳۵ھ۔ بمقام شاہجہاں آباد، بخط نستعلیق۔ ہر ورق دوم ہر مربع ”پچھن داس“

شعبہ مخطوطات میں فرامین شاہی، دستاویزات، قبایح جات، تصاویر، کتبات، مکاتیب  
وغیرہ کا بھی معتد بہ ذخیرہ ہے جن کی مجموعی تعداد ۲ ہزار سے متجاوز ہے۔ ۹۶۰ کے بھی ہیں جن میں تقریباً  
اور طلائی بھی ہیں۔ ہندو سیرینڈ سے آخر عہد مغلیہ تک۔ فرمانوں میں بابر بادشاہ سے لے کر آخر عہد مغلیہ  
تک۔ فرمان بابر بادشاہ مکتوبہ ۹۳۳ھ اور فرمان اکبر بادشاہ مکتوبہ ۹۷۵ھ۔ کتبات اور وصلیاں  
ہندو پیروں ہند کے مشہور خطاطوں کی شاہکار بھی ہیں۔ مکاتیب بھی رہنمایان قوم، ادبار، شعراء  
علماء اور صلحاء ہر طبقہ کے ملیں گے۔ اسی طرح تصاویر بھی شاہان و بیگمات مغلیہ، نادر شاہ، نادر شاہ،  
مولانا فخر الدین، طوطی بیگم وغیرہ بیسیوں مشاہیر کی ملیں گی۔ نوٹوں کی خاصی تعداد میں موجود ہیں  
جن میں دور سید احمد خاں کے کیا بگروپ بھی ہیں۔

شعبہ مخطوطات کو صیب گنج کلکشن نے چار چاند لگائے ہیں۔ قدیم ترین مخطوطات عربیہ و  
فارسیہ اسی کلکشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کلکشن کے جامع، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا  
محمد حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس اعظم صیب گنج و صدر الصدور مملکت حیدر آباد دکن نے اپنے  
قلم سے اپنے کتابخانہ کے اہم نسخوں کی جو عنوان وار فہرست بنائی ہے۔ اس سے اس پیش بہا ذخیرہ کی اہمیت  
کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ خاص عنوان درج ذیل ہیں۔

۱۔ الذہبیات۔ اس کے تحت ۹۹ وہ نسخے ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے امتیاز رکھتے ہیں۔



ان کی بعض سے ماوراء النہر، ایران، ترکی، کشمیر، ہندوستان وغیرہ مالک کے ہنر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔  
۲۔ الخطایات۔ اس کے تحت بڑے خطاطوں کے قلم کے ہ نسخہ درج ہیں مثلاً میر عساکر  
میر علی کاتب وغیرہ۔

۳۔ الخطایات۔ اس کے تحت ۳۵ وہ نسخے ہیں جو احیاناً ملک کے لکھے ہوئے ہیں مثلاً  
مناجات امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ بدرگاہ قاضی الحاجات۔ مکتوبہ درزا ابو الحسن آصف خاں برادر  
نورجہاں ۱۰۲۵۔ بخط استعلیق خوشخط، مطلا، مجدول، زرافشاں۔

۴۔ المجلدات۔ قدیم جلد سازی کے ۱۶ نمونے۔

۵۔ السلطانیات۔ جن ام نسخوں کا سلاطین اور وزراء سے تعلق رہا ہے وہ اس کے تحت  
درج ہیں مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتاب خانے کی صحیح بخاری وغیرہ۔

۶۔ الفتوحات۔ وہ دو نسخے جو سلاطین کے کتابخانوں میں مال غنیمت کے طور پر داخل ہوئے۔

(۱) صحیح البخاری۔ از فتح بیدر دست ابراہیم عادل شاہ۔ مکتوبہ ۷۷۸ھ۔

(۲) مثنوی گوئے و چوگان ملا عارفی۔ نوشتہ میر علی کاتب۔ از فتح گو لکنڈہ، بردست اورنگ زیب

عالمگیر بادشاہ۔

۷۔ المقامیات۔ جن ۹۶ کتابوں پر مقام کتابت درج ہے۔

۸۔ المکتوبات۔ جن ۲۶۳ نسخوں پر مہر ہے۔

۹۔ المحسنیات۔ اس کے تحت وہ ام نسخے ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں۔ (غیر خطاطیات)

۱۰۔ القرطاسیات۔ اس کے ذیل میں کاغذوں کے ۱۱ اقسام دکھائے گئے ہیں۔

۱۱۔ العتیقات۔ اس کے تحت ۲۳ قدیم نسخے درج ہیں (نویں صدی یا اس سے قبل کی کتابیں)

سب سے قدیم نسخہ یا پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کا ہے۔

۱۲۔ المخطوط۔ اس میں ۱۶ مختلف خطوں کی تشریح ہے۔

۱۳۔ المصنفیات۔ اس میں ۳۸ وہ نسخے ہیں جو بخط مصنف ہیں یا نسخہ مصنف سے

منقول یا مقابلہ شدہ ہیں۔

مخطوطات کی ترتیب فہرست میں ڈاکٹر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی مرتبہ ”فہرست  
نمائش گاہ مخطوطات و نوادر“ مطبوعہ ۱۹۵۳ء اور ڈاکٹر پروفیسر ندیر احمد کے مجموعہ مقالات  
”تاریخی و ادبی مطالعے“ مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں شامل مضمون ”کتاب خانہ حبیب گنج“ سے  
بھی حسب مواقع مدد لی گئی ہے۔

امید ہے کہ اس مضمون سے ارباب علم و ادب دانش کی نظر میں ”مولانا آزاد لائبریری“  
سے متعلق مفید معلومات کا اضافہ ہو سکے گا۔

# برہان

جلد ۱ | ماہ شوال المکرم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۳ء | شمارہ ۵

- |     |   |   |
|-----|---|---|
| ۲۸۹ | سعید احمد اکبر آبادی  | ۱۔ نظرات                                    |
|     |   | مقالات                                      |
| ۲۹۳ | جناب اکٹر خورشید فارق صاحب پرنسپل دہلی یونیورسٹی            | ✓ ۱۔ عہد نبوی کا تاریخی جائزہ               |
| ۳۰۷ | سعید احمد اکبر آبادی  | ✓ ۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تقسیم کے بعد    |
| ۳۲۶ | مولانا حبیب ریحان صاحب ندی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ البیضاء | ✓ ۳۔ لیبیا میں سرقہ و حجابہ حدود            |
| ۳۴۳ | جناب اکٹر محمد احسان اللہ خان صاحب                          | ۴۔ اجتہادی تحریک                            |
| ۳۴۸ | مولانا جلد شاہد خان صاحب شرفانی                             | ۵۔ استدراک                                  |
|     |   | مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ |
| ۳۵۰ | نثار احمد فاروقی۔ دلی کالج دہلی                             | ۶۔ دیوان ہیرم خان خان خاناں ایک تبصرہ       |
| ۳۵۵ | س ع   | ۷۔ تبصرے                                    |



## نظرات

اس مرتبہ عرب اسرائیل چوتھی جنگ متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اس کو مغربی ایشیا میں ایک پائدار اور مستقل امن کی نوید کہا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے کی تین لڑائیوں میں خواہ عرب کی شکست کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ بہر حال ایک عام خیال یہ پیدا ہو گیا تھا کہ اسرائیل کی طاقت و قوت ایک قصائے سیرم ہے۔ اور عرب اس کو کبھی چیلنج نہیں کر سکیں گے لیکن اس مرتبہ عربوں نے دنیا پر مٹی رُوس الا شہادہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ مردہ نہیں زندہ قوم ہیں بزدل نہیں، بہادر ہیں۔ عروج و زوال اقوام کے اسرار و رموز سے باخبر ہیں۔ اور عہد جدید کی جنگ سامانیوں سے پوری طرح آشنا اور متحرک و فعال۔ بیدار مغز اور روشن خیال ہیں۔ ان کی بیدار مغزی کی پہلی علامت یہ تھی کہ انہوں نے حملہ میں پہل کی اور یہ اعلان کر کے کہ ان کا مقصد صرف اپنے ان علاقوں کی بازیافت ہے جو فلسطین کی جنگ میں ان سے ہتیا لئے گئے تھے۔ اور جن کو مجلس اقوام متحدہ کی تجویز اور بین الاقوامی رائے عامہ کے دباؤ کے باوجود اسرائیل نے ان کی واپسی پر کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ عربوں نے کہا کہ مسلسل چھ برس تک بڑی بے چینی سے انتظار کیا کہ کسی طرح ہمارے منصوبہ علاقے ہم کو واپس مل جائیں۔ لیکن جب کوئی پُر امن کوشش کامیاب نہ ہوئی اور مجلس اقوام متحدہ بھی اپنی تجویز پر عمل کرانے میں ناکام رہی اور بڑی بڑی طاقتیں بھی ایک حقدار کو اس کا داجی حق نہ دلا سکیں تو اب ”تنگ آمد جنگ آمد“ کے مطابق اس کے سوا چارہ کار ہی کیا باقی رہ گیا تھا کہ وہ خود براہ راست اقدام کریں۔

عربوں کے اس اعلان نے طبعی طور پر دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ کو ان کے ساتھ بھڑی کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر اس اعلان کے بعد عرب لڑے تو اس بہادری اور شجاعت و دلیری سے

لڑے کہ دشمن کے چھکے چھڑا دیئے۔ دنیا کے بڑے بڑے فوجی مبصرین یہاں تک کہ اسرائیل کے کمانڈر انچیف اور پرنسپل ڈیفنس ٹکنس تک نے عربوں کی بہادری اور جنگ آزمائی کی تعریف کی۔ اور اس کی داد دی ہے۔ دنیا نے اس مرتبہ صاف دیکھ لیا کہ اگر جنگ صرف عرب اور اسرائیل کے درمیان محدود رہے اور امریکہ جیسی عظیم طاقت بے تحاشا اسرائیل کی مدد نہ کرے تو جنگ کا فیصلہ یقیناً عربوں کے حق میں ہوگا۔ دنیا کے ارباب سیاست کے دل و دماغ پر یہ اثرات بے شبہ عربوں کی شاندار کامیابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور روس دونوں جو عرب و اسرائیل کی جنگ میں باہم ایک دوسرے کے حریف اور مقابل سمجھے جاتے تھے۔ اور اس مرتبہ بھی جنگ کے آغاز میں صورت حال یہی تھی، ایک ہو گئے۔ اور ان کے آپس کے سمجھوتے سے جنگ بندی کے لئے جو فارمولہ تیار ہوا وہ انسداد جنگ کی بنیاد بنا۔

جنگ بندی کا رزولوشن مجلس اقوام متحدہ نے ۲۴ء کے جنگ کے موقع پر بھی منظور کیا تھا۔ اور اسی کی بنیاد پر جنگ ختم ہوئی تھی۔ لیکن اس رزولوشن میں اصرار جو رزولوشن منظور ہوا ہے۔ اس میں بہت بڑا فرق ہے۔ حالیہ رزولوشن میں یہ صاف کہا گیا ہے کہ جنگ ٹوک جانے کے بعد فریقین میں جلد از جلد باہم گفت و شنید کا بندوبست کیا جائے گا۔ اور ۲۴ء کی جنگ میں اسرائیل نے جن عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا معمولی رد و بدل کے بعد اسرائیل کو ان سے دست بردار ہونا ہوگا۔ امریکہ اور روس کے باہمی اتفاق سے مجلس اقوام متحدہ کا یہ رزولوشن اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ ان دو بڑی طاقتوں نے اب یہ محسوس کر لیا ہے عرب اور اسرائیل دونوں فوجی اور جنگی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے برابر کی طاقتیں ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں اگر باہمی بغض و عداوت اور جنگ کی صورت یہی برقرار رہی تو تیل اور نہرو سونز کے باعث اس کا اثر یہی نہ ہوگا کہ امریکہ اور یورپ کے اقتصادی حالات متاثر ہوں گے بلکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکہ اور روس دونوں ایک دوسرے کے فریق مخالف کی حیثیت سے میدان جنگ میں کود پڑیں اور نہایت سخت قسم کی بھیانک عالمگیر



جنگ چھڑ جائے۔ اور اس جنگ کے لئے نہ امریکہ تیار ہو سکتا ہے نہ روس۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس معاملہ میں امریکہ اور روس کی نیت اور ارادہ کے بارہ میں بدگمانی سے کلام لیں۔

اس رزولوشن کی سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں بڑی طاقتیں عرب اور اسرائیل میں براہ راست بات چیت کا بندوبست کریں گی اور جلد از جلد عربوں اور اسرائیل نے اس کو تسلیم کر لیا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کا ایک گونہ آغاز ہو بھی چکا ہے۔ چنانچہ جنگ بندی سے ان مسطور کی تحریر کے وقت تک عرب اور اسرائیل کے فوجی افسر دو مرتبہ بات چیت کر چکے ہیں۔ اور اس پر اسرائیل کی وزیر اعظم نے مسرت کا اظہار کیا اور آئندہ پائیدار امن کے لئے اسے فال نیک قرار دیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اب جب کہ عربوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوالیا ہے ان کو اسرائیل کے ساتھ براہ راست بات چیت کرنے میں کوئی بھجک یا رکاوٹ نہ ہونی چاہئے۔ اسرائیل ایک چھوٹی سی مملکت ہے اور وہ چاروں طرف سے عرب ملکوں میں گھیرا ہوا ہے۔ اس بنا پر عربوں سے مستقل طود پر برسرِ پیکار رہنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے اس کو نہ وہاں کی گورنمنٹ برداشت کر سکتی ہے اور نہ وہاں کے عوام اسے گوارہ کر سکتے ہیں۔ اور نہ وہ یہودی جو لاکھوں کی تعداد میں دوسرے ممالک میں آباد ہیں اسے انگریز کر سکتے ہیں۔ اس بنا پر ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ خیب عربوں اور اسرائیل میں براہ راست گفتگو ہوگی تو وہ بے نتیجہ نہ رہے گی۔ اور اس سے بہت سے مسائل کا حل مل آئے گئے بعد مغربی ایشیا میں پائیدار امن کی ایک راہ نکل آئے گی۔

ہم اپنے عرب بھائیوں کو ان کی اس شاندار کامیابی پر ذی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عزم و ہمت سے بین الاقوامی سیاست کا رخ موڑ دیا ہے اور بڑی بڑی طاقتوں کے لئے حقائق پر معروضی نقطہ نظر سے سوچنے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ عربوں کی اس کامیابی میں بڑا دخل تین چیزوں کا ہے۔ ایک ان کا باہم اتحاد و اتفاق، دوسرا ان کی خود اعتمادی

اور تیسرا عہدِ جدید کے تقاضوں اور اس کے مطالبات کا صحیح ادراک شعور اور واقعہ بھی ہے کہ یہی تین چیزیں ہیں جو اس زمانے میں کسی قوم کی ترقی اور اسی کی بقا کے لئے ضروری ہیں اور سب سے آخر میں مگر سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ عرب من حیث القوم مسلمان ہیں اور اسلام کے اولین علمبردار وہی رہے ہیں اس لئے ہم ان کو کیا بتائیں کہ اسلام ہی وہ حقیقی سرچشمہ ہے جو ان کو اتحاد بھی بخشتا ہے اور علم و عمل کے اعتبار سے اُن کو ناقابلِ شکست توانائی اور طاقت بھی عطا فرماتا ہے جو لوگ اس کے ہو گئے ان کو وہ یہ مژدہ جاں فزا سنا ہے۔

لا تمھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون

## اہل علم کے لئے پہنچ نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی: جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قطار شائع ہو رہی ہے۔ قیمت مصریہ کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے۔ آج ہی پہنچے دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک بیس جلد طبع ہو چکی ہیں۔ باقی دس جلد عنقریب طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ تفسیر جلالین ثلوثی مصری: مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطی (۲) معرفت الناسخ والمنسوخ لابن حجر قیمت مجلد - ۵۰

۳۔ شرح ابن عقیل: الفہم بن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے۔ قیمت مجلد - ۵۰

۴۔ شیخ زادہ: حاشیہ بیضاوی سورۃ لقمرہ مکمل قیمت ۸۰/-

۵۔ فتح الباری: جو قطار شائع ہو رہی ہے۔ خدا کے فضل سے دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں۔

ملنے کا پتہ: ادارہ مصطفائیہ دیوبند (یو۔ پی۔)



# عہد نبوی کا تاریخی جائزہ

ہجرت

(۴)

از جناب ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

بیعت عقبہ سے قریشی اکابر گبر گئے، انہیں یقین ہو گیا کہ محمدؐ نے اُن سے لڑنے کے لئے بیعت کی ہے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ محمدؐ کا خاتمہ کر کے بیعت سے پیدا ہونے والے خطروں کا سد باب کر دینا چاہئے، وہ جانتے تھے کہ اگر ان کے کسی ایک خاندان نے رسول اللہؐ کو قتل کیا تو اسے بنو ہاشم و منطلق کے عیظ اور انتقام کا نشانہ بننا پڑے گا اس لئے طے ہوا کہ قریش کے ہر خاندان سے ایک ایک جوان چنا جائے اور یہ سب مل کر رسول اللہؐ کے قتل میں شریک ہوں تاکہ ان سے انتقام لینا ہاشمیوں کے بس سے باہر ہو جائے۔ رسول اللہؐ کو اس سازش کا علم ہو گیا، انہوں نے ہجرت کا عزم کر لیا۔ بیعت کے تیسرے ماہ ایک رات وہ اپنے مقرب ابوبکر صدیق کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہو گئے، انہیں اندیشہ تھا کہ قریش کے گماشتے ان کا تعاقب کریں گے اس لئے مکہ کے قریب وہ ایک غار میں جو غار ثور کے نام سے موسوم تھا چھپ گئے اور وہاں تین راتیں گزاریں۔ اس اشار میں قریش کے گماشتے تلاش میں ناکام ہو کر لوٹ گئے۔ رسول اللہؐ مع ابوبکر اپنی تیز دانتی قھوار پر سوار ہو کر جسے چار سو روپے میں خریدا تھا دو اور عربوں کے ساتھ جن میں سے ایک رہبر تھا، مدینہ روانہ ہو گئے۔

دس بارہ دن کا سفر کر کے رسول اللہؐ مدینہ کے ایک بیرونی محلہ میں اترے جہاں اس کی کثیر خاندان شاخ عمرو بن عوف کی بستیاں تھیں، یہاں دو چھتے قیام کے بعد رسول اللہؐ کی سواری اندرون شہر کی طرف روانہ ہوئی وہ اسی محلہ سے گذرتے تو اسی نقیب انہیں اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دیتے تاکہ رسول اللہؐ کا

اس مضمون کی تسلط کا عنوان "رسول اللہؐ کی ولادت" غلط تھا اسے "عہد نبوی کا تاریخی جائزہ" قرار دیا جائے

تقرب حاصل ہوا اور جب خزرجی مصلوں سے گزرتے تو خزرجی نقیب اپنے ساتھ ٹھہرنے کی درخواست کرتے تاکہ رسول اللہ کی جسمانی قربت سے ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو دو دونوں قبیلوں کی رقیبانہ رجحانات کے پیش نظر رسول اللہ نے اپنے دادا کی تمغیاں میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا جس کا تعلق قبیلہ خزرج کے ہماری خاندان سے تھا۔ وہ اس خاندان کے ابو ایوب انصاری کے گھر کے باہر ایک صاف ستھرے چوک میں اپنی اونٹنی سے اترے۔ ابو ایوب کا مکان دو منزلہ تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہتے تھے، ان کے ساتھ بال بچے نہیں تھے، گھر صاف ستھرا اور ماحول پرسکون تھا۔ رسول اللہ کے پہنچتے ہی اس و خزرج کے نقیبوں کے گھر سے ان کے لئے کھانے کے تحفے آنے لگے، پہلا تحفہ مشہور صحابی زید بن ثابت کی ماں کا تھا، انھوں نے ایک بادیہ میں روٹی، گھی اور دودھ سے تیار کیا ہوا پسندیدہ کھانا خرید بیچا، زید بن ثابت کھانا لے کر آئے، وہ ابھی لوٹے بھی نہ تھے کہ سعد بن عبادہ خزرجی نقیب کا بادیہ آگیا اس میں بھی خرید و عراق تھا، رسول اللہ کا قیام ابو ایوب کے گھر سات ماہ رہا، اس اشارہ میں ہر رات تین بار اسی و خزرجی گھروں سے ان کے لئے کھانا آتا رہا۔ کسی نے ابو ایوب کی بیوی سے پوچھا کہ رسول اللہ کو کون سا کھانا پسند تھا تو انھوں نے کہا: رسول اللہ خود کسی کھانے کی فرمائش یا مذمت نہیں کرتے تھے لیکن ابو ایوب نے مجھے بتایا کہ ایک رات وہ اس بادیہ میں رسول اللہ کے ساتھ شریک طعام تھے جو نقیب سعد بن عبادہ نے بھیجا تھا اور جس میں طغیش نامی سالن تھا، یہ سالن رسول اللہ نے بڑی رغبت سے کھایا، ایسی رغبت انھوں نے دوسرے کھانوں سے ظاہر نہیں کی تھی، ہم بھی رسول اللہ کے لئے طغیش پکانے لگے، ہر بس بھی پکاتے تھے، یہ بھی انھیں پسند تھا، رات کے کھانے پر ان کے ساتھ کبھی پانچ کبھی چھ اور کبھی دس تک آدمی ہوتے تھے۔ رسول اللہ کو ابو ایوب کے گھر کا پانی موافق نہیں آیا، اس لئے وہ ان کے لئے اچھا پانی اُنس نامی کنوئیں سے منگوا کر لاتے تھے

---

۱۔ بروند ظہار، فرق بفتح البین کی جمع۔ کم گوشت ہڈی کا لذیذ سالن جسے عرب بہت پسند کرتے تھے۔

۲۔ ابن سعد ۱/۲۳۷ انساب الاشراف ۱/۲۶۷



سات ماہ بعد جب رسول اللہ اپنے گھر منتقل ہوئے تو آتش بن مالک، ہند اور عارثہ بیوٹ الشقیہ نامی کنوئل سے دیہیوں میں بھر کر رسول اللہ کے گھر پانی پہنچاتے تھے۔ <sup>۱</sup> قیل لأم یوب وکان مقام رسول اللہ فی منزل زوجہا سبعة أشهر رأی الطعام کان أحب إلی رسول اللہ : فقالت : ما رأیتہ أمر بطعام یصنع له بعینہ ولا رأیتہ ذم طعاما قط ولكن أنا یوب أخبرنی أنه تحشی معه لیلۃ من قصعة أرسل بها سعد بن عبادة فیہا طفیف شغل فرآہ ینہکھا نہکاً لمیرہ ینہک غیرہا فکنا نعمل له وکنا نعمل له المہرین فلراہ یعبہ ، وکان یحضر عشاءہ الخمسة الی الستة الی العشرة۔

## مشکلات

مدینہ اگر رسول اللہ کو تین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اقتصادی، قیادت اور مذہبی وہ جب تک مکہ میں تھے انہیں نہ رہائش کی کوئی تکلیف تھی، نہ کھانے پہننے کی، نہ روپیہ پیسہ کی، ان کا ذاتی فراخ و پر آرام مکان تھا، ان کی مال دار بیوی خدیجہؓ اپنی وسیع اور بھلتی بھولتی تجارت سے اتنا وافر کمائی تھیں کہ رسول اللہ امدان کے متعلقین کو ہر طرح کی آسائش میسر تھی اور اتنا روپیہ پس انداز ہو جاتا تھا کہ وہ دوسروں پر خرچ کرتے تھے، رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو ایک انصاری کے گھر سات ماہ تک ٹھہرے۔ ان کا اپنا مکان نہ تھا، نہ مکان بنانے کے وسائل۔ ان کے بیڑاں ابو یوب اور دوسرے انصاری مقرب ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے، ان کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ اپنی دوسری ضروریات رفع کرتے۔ ہجرت کے چار ماہ بعد انہوں نے بال بچوں کو مکہ سے بلایا تو ان کے سفر خرچ کا بند و بست ابو بکر صدیق سے ڈھائی سو روپے لے کر کیا۔

۱۔ انساب الاشراف ۱/۵۲۵

۲۔ ایضاً ۱/۵۳۵ ابن سعد ۱/۵۰۴۔

۳۔ انساب الاشراف ۱/۵۲۹ ابن سعد ۸/۶۲

ابوبکر صدیق ہجرت کے وقت دو ڈھائی ہزار روپے مدینہ لے آئے تھے ہجرت کے ساتویں ماہ ان کا خاندان آیا تو اسے ایک دوسرے انصاری کے گھر ٹھہرایا گیا اور کچھ دن بعد انصاری نقیبوں نے ان کے لئے دو تین کمرے مسجد سے متصل بنوائے تو ان میں اثاثہ تھا نہ گڑہستی کا سامان۔ رسول اللہ کی مشغلی تین سال پہلے عائشہؓ سے ہوئی تھی، عائشہ کو مدینہ آتے کئی ہفتے گزر گئے لیکن وہ رخصت ہو کر رسول اللہ کے گھر نہ جاسکیں۔ کیوں کہ ان کے پاس بہرا داکر نے کے لئے روپیہ نہ تھا، ان کے خسر ابوبکرؓ نے یہ رقم ادا کی تو عائشہؓ فی رخصتی محل میں آئی۔ نئے گھر میں رسول اللہ کے لئے دودھ، کھجور اور کھانا انصاری گھروں سے آنا تھا، کھانا پکانے کا سامان اکثر ان کے گھر میں موجود نہ ہوتا تھا۔ ایک بار ابوبکر صدیق نے بکری کی ران بھیجی تو اس دن نہ جلانے کے لئے تیل تھا نہ پکانے کے لئے گھی۔ مکہ میں رسول اللہؐ اپنی دوسری بیوی سودہ، دو لڑکیوں فاطمہ و راحمہ کلثوم نے پالک زید بن حارثہ، اُن کے لڑکے اسامہ بن زید، ابورافع (مولیٰ) ام المومنین (کھلائی) اور علی بن ابی طالب کے کفیل تھے، یہ سب مدینہ آگئے تو ان کی کفالت رسول اللہ کے لئے پریشان کن مسئلہ بن گئی۔ ان بچوں میں علی حیدر کی ناداری کا حال خود ان کی زبانی سننے کے قابل ہے ہاڑوں کی ایک صبح میں گھر سے بھوکا نکلا تو مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے ایک کٹی ہوئی سوراخ دار کھال لی جو گھر میں بچوں کی تھی، اس کے ٹکڑے سے سرنکال کرا سے گلے میں ڈال لیا اور گرمی حاصل کرنے کے لئے اسے سینہ پر باندھ لیا، خدا کی قسم، نہ تو میرے پاس گھر میں کھانے کے لئے کچھ تھا نہ رسول اللہ کے گھر میں، ان کے پاس اگر کچھ ہوتا تو مجھے ضرور اس کی خبر ہوتی، میں مدینہ کی بیرونی بستی میں نکل گیا، ایک یہودی نے اپنے باغ کی دیوار سے سرنکال کر کہا: بدو، کیا ایک ڈول پانی کے بدلے ایک کھجور لے گا؟ میں نے آمادگی ظاہر کی، اس نے باغ کا دروازہ کھول دیا اور میں اندر چلا گیا۔ میں کنوئیں سے ایک ڈول



پانی نکالتا اور وہ مجھے ایک کھجور سے دیتا، جب میری منہی کھجوروں سے بھر گئی تو میں نے کہا: بس سیر  
 لئے اتنی کھجوریں کافی ہیں، انہیں کھا کر میں نے پانی پیا اور رسول اللہ کے پاس مسجد میں چلا گیا جہاں وہ  
 ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ تھوڑی دیر میں (ہجرت سے پہلے مدینہ میں رسول اللہ کے نابیندے)  
 مصعب بن عمیر سامنے سے نمودار ہوئے، ان کے جسم پر ایک پیوند لگی چادر تھی۔ رسول اللہ نے پیوند  
 دیکھے تو انہیں مکہ میں مصعب کی ٹھٹھا دار زندگی یاد آگئی جب وہ عطر میں لیسے ہوئے عمدہ کپڑے  
 اور اعلیٰ قسم کے جوتے پہنا کرتے تھے ادراپ (وہ ایسے مفلس تھے کہ) ان کے تن پر پٹی ہوتی چادر تھی،  
 اس خیال سے رسول اللہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہجرت کے دوسرے سال علی حیدر کی فاطمہؓ سے  
 شادی ہوئی تو وہ بالکل تہی دست تھے، ان کا ہر ایک زرہ بکھر دیا سو بچا سدا پتے میں بیچ کر ادا کیا گیا  
 جو رسول اللہ نے انہیں عطا کی تھی، اسی رقم سے رسول اللہ نے فاطمہؓ کے لئے خانہ داری کی کچھ ضروری چیزیں  
 ہمتا کیں۔

رسول اللہ کے کئی درجن ہاشمی و مطلبی رشتہ دار اور دوسرے قرشی مع مال بچوں کے مدینہ آئے تھے،  
 ان میں سے اکثر مکہ کے خوش حال تاجر تھے، معدودے چند کو چھوڑ کر مدینہ میں تقریباً سب ہی بے سروسامان  
 پریشاں حال اور مختلف قسم کی معاشی اور سماجی رحمتوں سے دوچار تھے۔ انصار نے عارضی طور پر انہیں  
 اپنے گھروں میں ٹھہرایا تھا اور ان کے کھانے پینے کا کلی یا جزئی بندوبست بھی کرتے تھے لیکن عرصہ  
 تک نمودار دین کے قیام و طعام سے عہدہ برآ ہونا ان کے بس سے باہر تھا، ان کے چند خاندان ہی  
 مرفہ الحال تھے، باقی کی معاشی بنیادیں کمزور تھیں، وہ زراعت، نخلستانوں، دستکاری، معمولی تجارت  
 کے ذریعہ روزی حاصل کرتے تھے۔ سال میں کچھ ہفتے ایسے بھی گذرتے جب ان کے پاس پیٹ بھرنے

لے امتیاع (ابن عبد البر، حیدرآباد) ۱/۳۷۹

بے کسرا اعمال و متقی برہان پوری، حیدرآباد ۳/۳۲۱

معہ ایضاً ۱۱/۷

اپنی ادا اپنے متعلقین کی بے سرو سامانی، ہاشمی وغیر ہاشمی مہاجرین کی خستہ حالی کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی فکر میں مدینہ کے ایک نو مسلم طبقہ نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا، یہ طبقہ شہر کے بے سہارا اور ادھر ادھر سے آئے ہوئے عربوں پر مشتمل تھا جو ایک خوش حال زندگی کی امید میں مسلمان ہو گئے تھے، ان کے ہاتھ میں نہ پیسہ تھا، نہ جسم پر کپڑا، نہ پیر میں جوتا، ان کی ایک جماعت کی نشست و برخاست مسجد نبوی کے سامان میں تھی، یہ لوگ ننگے جسم، ننگے پیر، ننگے سر درں میں ادھر ادھر مزدوری کی تلاش میں بھل جاتے تھے یا جنگل سے ایندھن جمع کر کے بیچتے تھے، ننگے جسموں ہی سے نماز پڑھتے، انہیں کبھی مزدوری ملتی ہی نہ تھی اور کبھی اتنی کم ملتی کہ ان کا گزارہ نہ ہوتا تھا، انہیں کبھی رسول اللہ کے گھر کھانے کو مل جاتا، کبھی انصاری گھروں سے، یہ لوگ زیادہ تر بھوکے رہتے تھے، کھانے، کپڑے اور پیسے کے لئے ان کی نظر ہی رسول اللہ کی طرف اٹھتی لیکن وہ ان کی مدد کرنے سے خود کو قاصر پاتے۔

۱۰۱۔ نبوت کے تیرھویں سال انصار کے جن شتر غامیندوں نے بیعت کی تھی وہ اس

11



د فریج کے سارے نمایندوں پر مشتمل نہیں تھے، ان دونوں قبیلوں کی ایک اقلیت کے نمایندے بیعت میں شریک ہوتے تھے۔ بیعت کرنے والوں میں معدومے چند کو چھوڑ کر جو بختہ کار سن ہدیہ اور صفت اول کے لیڈر تھے باقی دوسرے اور تیسرے درجہ کے ادھیڑ و جوان لوگ تھے، جن کا مقصد رسول اللہ کی قیادت میں اُبھرنا اور اپنی قوم میں رسوخ بڑھانا تھا۔ اقلیت کے نمایندوں کو اسلام یا رسول اللہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں سے کچھ جینیفی ٹوہد تھے، بعض کارجان عیسائیت کی طرف تھا اور بیشتر یہودی نظریات و عقائد سے متاثر تھے۔ انھوں نے اکثریت کے دباؤ میں اگر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن وہ ہر معاملہ میں رسول اللہ کی بے چون و چرا اطاعت کرنے کو تیار نہیں تھے، انھیں یہ بات بھی کھٹکتی تھی کہ رسول اللہ نے انھیں نظر انداز کر کے اُن سے کم عمر، کم تجربہ اور کم صلاحیت لوگوں کو اپنا مقرب اور قبائلی لیڈر (نقیب) بنالیا تھا، ان میں سے بعض کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے رسول اللہ کی بے چون و چرا اطاعت کی تو ان کے مفادات کو نقصان پہنچے گا اور قبیلہ میں ان کا اثر و رسوخ کم ہو جائے گا، بعض کا خیال تھا کہ بہت سے مقامی اور قبائلی معاملات میں ضروری ہے کہ رسول اللہ کی رائے سے ان کے عدم تجربہ یا نادانیت کی بنا پر اختلاف کیا جائے اور انھیں تھکا مشورہ دیا جائے۔

نکہ سے روانہ ہو کر رسول اللہ سب سے پہلے مدینہ کے باہر اوس کی ایک وسیع شاخ عمرو بن عوف کے محلہ میں اترے، یہاں ان کی پذیرائی سعد بن فہشہ نے کی جنھیں بیعت عقبہ کے موقع پر رسول اللہ نے عمرو بن عوف کا رسمی لیڈر (نقیب) مقرر کیا تھا، یہاں قریب دلی ہفتے قیام کے دوران ان کی ملاقات قبیلہ کے ایک معزز بختہ کار زعیم ابو عامر راہب سے ہوئی، ابو عامر بیعت عقبہ میں شریک نہیں ہوا تھا اس نے قبیلہ کے دباؤ میں آکر بادل نا خواستہ اسلام قبول کر لیا تھا اور ایک خبر ہے کہ وہ مسلمان ہوا ہی نہیں تھا، اسے مذاہرب کے مطالعہ کا شوق تھا، عیسائی راہبوں اور یہودی علماء سے مذہبی گفتگو کیا کرتا تھا، گاہے گاہے شام جاتا اور وہاں کے ممتاز راہبوں سے ملتا، وہ خود براہمی توحید کا قائل تھا۔ موٹے اون کے پٹے پہنتا اور سادہ راہبانہ

زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے رسول اللہ سے پوچھا: محمدؐ تمہارا کیا مذہب ہے؟ رسول اللہ: وہی جو ابراہیم کا تھا، توحیدِ فالص۔ ابو عامر: میں تو پہلے سے اس پر عامل ہوں۔ رسول اللہ: تم کہاں اس پر عامل ہو! ابو عامر: میرا اسی پر عمل ہے، البتہ تم نے ابراہیمی مذہب میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں داخل کر دی ہیں۔ رسول اللہ: میں نے ابراہیمی مذہب کو آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیا ہے۔ ابو عامر رسول اللہ کی گفتگو سے مطمئن نہیں ہوا، رسول اللہ اس سے بے چون و چرا اطاعت چاہتے تھے، وہ اس کے لئے تیار نہ تھا، محلہ میں اس کے ہم خیال دوسرے ممتاز لوگ بھی اس کی طرح رسول اللہ سے بدظن تھے، اُن کے اشارہ سے کچھ لوگ رات میں رسول اللہ پر پینٹیں بھی پھینکا کرتے تھے۔ رسول اللہ نے اپنی حفاظت کے لئے اپنے رشتہ دار خزرجی خاندان بنو نجار کو طلب کیا، ان کے بہت سے جوان مسلح ہو کر آگئے، بنو نجار میں رسول اللہ کے دادا عبدالمطلب کی ننھیال تھی، رسول اللہ اپنی اودھنی قصوار پر سوار ہو کر روانہ ہوئے، ان کے راستے میں ایک دوسرا انصاری محلہ آیا، وہاں میر محلہ قسم کے لوگوں نے جو بیعت عقبہ میں شریک ہوئے تھے انہیں اپنے ساتھ کھڑنے کی دعوت دی، یہ محلہ چھوٹا تھا، رسول اللہ کو حفاظت کا انتظام ناکافی نظر آیا، وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ اودھنی مامور ہے یعنی اسی جگہ رکنے کی جہاں خدا کی طرف سے اسے رکنے کا حکم ہے۔ انہوں نے عبد اللہ بن ابی بن سلول کے محلہ کا رخ کیا، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا عبد اللہ ایک تجربہ کار صلح پسند دوستانہ شخص، بار سوخ خزرجی لیڈر تھا، جس کا احترام اوس و خزرج کے دونوں قبیلے کرتے تھے۔ عبد اللہ نے بیعت عقبہ والا حج اپنے بہت سے متبعین کے ساتھ کیا تھا لیکن اسے بیعت کا علم نہیں تھا، شرانصاریوں نے اس سے بیعت مخفی رکھی تھی، انہیں پہلے سے عبد اللہ کی رائے معلوم تھی کہ وہ رسول اللہ کے مدینہ آنے کے حق میں نہیں ہے، اسے بہت سے اندیشے



لاحق تھے۔ ان میں سے ایک اس کے لئے سخت حوصلہ شکن یہ اندیشہ تھا کہ رسول اللہ کے آنے سے  
دنوں قبیلوں میں اس کے وقار و سوخ اور حاکمانہ اقتدار کو کاری ضرب لگے گی۔ عبداللہ اپنی  
مزارحم نامی گڑھی کے باہر حسم پر چادر لپیٹے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، رسول اللہ نے اونٹنی  
روکی اور عبداللہ کے پاس جا کر کہا: میں تمہارے ساتھ ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ عبداللہ نے حیرت  
اور خفگی سے کہا: اُن لوگوں کے ساتھ جا کر ٹھہرو جنہوں نے تمہیں بلایا ہے۔

ابو عامر راہب سے رسول اللہ کے تعلقات کشیدہ ہوتے چلے گئے، وہ برملان پر اعتراض  
کرتا تھا اور ان کی قیادت کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا، ہجرت کے چند ماہ بعد ایک وقت ایسا  
آیا جب رسول اللہ سے اس کے تعلقات سخت ناخوشگوار ہو کر منقطع ہو گئے اور اپنے خاندان کے  
پچاس ہم خیال لوگوں کے ساتھ وطن چھوڑ کر مکہ چلا گیا، وہاں قریش کے مخالف کیمپ میں منہم ہوا۔  
اندھو سال بعد جنگ اُحد میں بڑی گرجوشی سے رسول اللہ کے خلاف لڑا۔ ابو عامر اپنی قوم و عمر  
بن عوف میں بہت سے ہم خیال وہم نوا چھوڑ گیا تھا جو رسول اللہ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے  
تھا اور ان کے بداندیش تھے۔ ابو عامر کے برخلاف عبداللہ بن ابی بن سلول رسول اللہ سے اُلجھتا  
نہیں تھا، نہ منہ درمنہ ان پر اعتراض کرتا تھا، وہ اپنے مصاحبوں کے حلقوں میں ان پر نقد کرتا  
تھا اور بہت سے معاملات میں اپنے متبعین کو رسول اللہ سے عدم تعاون کا مشورہ دیتا تھا۔  
صعب اول کا ایک اور اسی لیڈر جو رسول اللہ کی بے چون و چرا اطاعت کے لئے تیار  
نہیں ہوا ابوقیس صیفی بن اُسلت تھا، وہ شاعر تھا اور ابو عامر راہب کی طرح موجد بھی، اوس  
کی ان چار شاخوں کے اکابر میں اسے حاکمانہ اقتدار حاصل تھا: اُمیہ بن زید، خطمہ، وائل اور  
واقف۔ ابو عامر راہب کے برخلاف ابوقیس نے رسول اللہ کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کی لیکن وہ  
مسلمان بھی نہیں ہوا، رسول اللہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھتے تو وہ واہ واہ کرتا اور جب اسلام

لانے کو کہتے تو جھوٹا وعدہ کر کے چلا جاتا۔ ابوقیس اور اس کے زیر اثر چاروں شاخوں کے محلے مدینہ کی یہودی بستیوں سے ملے ہوئے تھے اور ان دونوں کے درمیان ازدواجی و اقتصادی روابط مستحکم تھے۔ یہ چاروں شاخیں یہودی نظریات و رجحانات سے بھی متاثر تھیں۔ رسول اللہ کے استیصال کے لئے ان کے اکابر مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کرتے رہتے تھے اور قریش نیز نجد کے متعدد طاقت ور قبیلوں (غطفان، قرارہ، مڑہ، سلیم، اسد) کو رسول اللہ کے خلاف بھڑکاتے تھے جس کے نتیجے میں خندق کا محاصرہ ہوا۔ سلسلہ سے سلسلہ تک جب ان کے پڑوسی و دوست یہودی قبیلوں کی جلاوطنی اور تباہی رسول اللہ کے ہاتھوں مکمل ہو چکی اور دوسری طرف خندق کے محاصرہ میں رسول اللہ کے استیصال کے لئے قریش کی تیسری بڑی کوشش ناکام ہوئی اور مدینہ کی مسلم اکثریت کا ان اکابر پر خشناک دباؤ بڑھا تو یہ اور ان کے ماتحت اسی عرب مجبور ہو کر مسلمان ہو گئے لیکن ابوقیس صیفی مرتے وقت تک رسول اللہ کی بے چون و چرا اطاعت سے بچنے کے لئے اسلام سے گریز کرتا رہا۔

رسول اللہ کو توقع تھی جیسا کہ بیعت عقبہ کے موقع پر انصاری نقیبوں نے انہیں باور کرایا تھا کہ مدینہ کے یہودی قبیلے قینقاع، نضیر و قرظہ مسلمان ہو جائیں گے۔ رسول اللہ مدینہ آنے کے چند دن بعد ہی یہودی اکابر اور مذہبی علماء سے ملے اور انہیں بتایا کہ میں نبی ہوں، وہی نبی جس کے مبعوث ہونے کی تم پیش گوئی کرتے تھے، توراۃ میں جس کے وہی آسمانی صفات بیان کئے گئے ہیں جو مجھ میں موجود ہیں، میں توحید خالص کی دعوت دیتا ہوں جسے ابراہیم، اسماعیل اور موسیٰ نے پیش کیا تھا۔ یہودی اکابر نے کہا کہ ہمیں اپنا مذہب بہت عزیز ہے، ہم اسے کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتے، ہم پہلے ہی سے توحید کے قائل ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، ہمارے مذہب میں وہ خوبیاں ہیں جو تمہارے مذہب میں نہیں ہیں۔ . . . . . یہودی علماء نے کہا کہ تم وہ نبی نہیں ہو جس کی ہم پیش گوئی کرتے تھے، نہ تم میں وہ صفات موجود ہیں جو مبعوث ہونے والے نبی کی توراۃ میں بیان



کی گئی ہیں، جس نبی کی ہم پیش گوئی کرتے رہے ہیں وہ اسرائیلی نسل کا ہو گا عرب نہیں ہو سکتا اور اس میں وہ ساری صفات بدرجہ اتم موجود ہوں گی جو توراۃ میں بیان کی گئی ہیں، یہودی عالموں نے رسول اللہ سے مذہب، خدا، روح اور پچھلے انبیاء کے بارے میں بہت سے سوالات کئے اور ان کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے انھیں رسول اللہ میں نبی کی جھلک نظر نہیں آتی، چند یہودی اشخاص نے شخصی مفاد یا کسی مصلحت کے زیر اثر اسلام قبول کر لیا اور شاید ایک دو کے سوا کوئی یہودی دل سے رسول اللہ پر ایمان نہیں لایا۔ رسول اللہ کئی ماہ تک یہودیوں سے اپنی نبوت کا اعتراف کرانے کی کوشش کرتے رہے، ان کی استمالت کے لئے وہ پہلے سے ہی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے تھے، اب ان کی مزید تالیف قلب کے لئے وہ عاشوراء کا روزہ رکھنے لگے اور متعدد یہودی شمار اسلام میں داخل کر لئے مثلاً رمضان کے روزے، چار کعتی نماز، خون و مردہ کی حرمت اور حرم زانی، اس کے باوجود انھیں یہودیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، یہودی اکابر اور علماء انھیں اپنے مذہب، آزادی، اور خوش حالی کے لئے سنگین خطرہ تصور کرتے تھے۔

رسول اللہ کو امید تھی اور بیعت عقبہ میں شریک ہونے والے مدنی اعیان نے انھیں اطمینان بھی دلایا تھا کہ مدینہ کے پڑوس اور مضافات کے سارے عرب قبیلے اسلام لے آئیں گے، مدینہ کے قریب چند قبیلوں کے اوس و خندج سے باہمی مدد کے معاہدے بھی تھے، بیعت عقبہ کے بعد ان قبیلوں میں اسلام پھیلانے کا کام شروع ہو گیا تھا لیکن قبول اسلام کی رفتار بہت سست تھی، عرب کی نفسیت، جس کی تخلیق نامہربان طبعی حالات سے ہوئی تھی مذہب کے قیود اور نبی کی بے چون و چرا اطاعت سے رہا کرتی تھی، آزادی فکر و عمل پر ہی اس کی بقا کا دار و مدار تھا اور مذہب و نبی ان دونوں کی راہ میں سنگِ گرل تھے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ نے مدینہ کے پڑوس و مضافات کے عرب قبیلوں کو مدینہ، جہینہ، اسلم، اشجع، عفار، سکیم، عبس، ذبیان اور خزاعہ میں اسلامی دعوت زیادہ وسیع پیمانہ پر شروع کر دی، اس کے اجزائے ترکیبی تین تھے۔ توحید، نماز اور اقرار نبوت، کچھ عرصہ بعد اس میں روزہ و زکوٰۃ بھی اضافہ ہو گیا، عربوں کے لئے زکوٰۃ کے بعد اسلام کی سب سے مشکل اور ناقابل قبول قید اقرار نبوت تھی

جس کے معنی تھے مدینہ کے ایک عرب کی بے چین و چرا اطاعت، نہ عام عرب اپنے فکر و عمل پر یہ بشری ڈالنے کے لئے تیار تھا، اس کے قبائلی سردار جنہیں قرابت میں اپنے حاکمانہ اقتدار اور آزادی عمل کی موت نظر آتی تھی۔ چن عرب قبیلے جیسے جہنہ اور فریہ انصاری اکابر کے دباؤ میں اگر جن کے وہ زیر اثر تھے اور جن سے ان کے باہمی معاہدے تھے بڑے دل سے مسلمان ہو گئے، باقی نے نہ صرف یہ کہ رسول اللہ کی وفاداری کا حلف لینے سے انکار کر دیا بلکہ انہیں اپنی آزادی و خود مختاری کے لئے خطرہ سمجھ کر ان کے خلاف جارحانہ حرکتیں کرنے لگے اور جب موقع ملا مسلمان تاجروں، مسافروں اور مدینہ کے باہر چرنے والے مویشیوں کو لوٹ لیتے تھے۔

مختصر یہ تھی نوعیت ان اقتصادی قیادت اور مذہبی مشکلات کی جن سے ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ ہوتے، عرب معاشرہ میں اس شخص کی سرکاری تسلیم کی جاتی تھی جو خوب مال دار، طاقتور و فیاض ہوتا تھا، ایسے شخص کی عزت ہوتی تھی، رُعب مانا جاتا تھا اور اطاعت کی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مدینہ اور باہر کے بہت سے عرب ان کی مالی بے بضاعتی کے باعث نا انہیں نبی مانتے ہیں نہ ان کی عزت کرتے ہیں نہ ان کی اطاعت کرنے کو تیار ہیں، ان حالات میں انہیں معاشی توانائی حاصل کرنے اور اپنی مادی طاقت بڑھانے کا شدت سے احساس ہوا، انہیں یقین ہو گیا کہ جب تک وہ اور ان کے ہاجر شدہ دار و رسالتی مفلس و قلاش ہیں، کھانے پینے تک کے لئے انصار کے محتاج، اس وقت تک ان کی بے چین و چرا اطاعت ہو سکتی ہے نہ ان کی اسلامی تحریک فروغ پاسکتی ہے، انہیں یہ یقین ہو گیا کہ جن حالات سے وہ گھرے ہوئے ہیں ان میں معاشی توانائی حاصل کرنے اور مادی وسائل بڑھانے کا عملی طریقہ یہ ہے کہ مخالفوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے اور انہیں شکست دے کر ان کی دولت و وسائل پر قبضہ کر لیا جائے، ہجرت کے ساتویں ماہ مخالفوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی ہدایت وحی ان الفاظ میں اُترائی گئی۔ اُذِنتَ لِلَّذِينَ يَقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ حِلْمُكَ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَعْوِهِمْ لَقَدِيرٌ (حج)

رسول اللہ ﷺ اور وطن کے ہاجر ساتھیوں کو لڑائی کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ ان کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے (وطن سے پھلنے پر مجبور کر کے) اور بلاشبہ خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ اگلے سال قرآن نے مخالفوں سے جنگ و قتال ایک مذہبی فریضہ قرار دے دیا۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَتَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال) کا فوس سے لڑو یہاں تک کہ کفر ختم ہو جائے اور اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب باقی نہ رہے۔



جنگ و قتال کی اجازت پاکر رسول اللہ نے سب سے پہلے قریش کے تجارتی قافلہ بکڑنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ قریش کے قافلہ ہفتوں کے وقفہ سے برابر شام کے مختلف شہروں کو آتے جاتے رہتے تھے۔ مکہ سے شام جانے والی تجارتی شاہراہ مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں بحرِ فلزم کی ساحلی پٹی سے ہو کر گذرتی تھی۔ ہجرت کے ساتویں ماہ رسول اللہ کے جاسوسوں نے خبر دی کہ قریش کا ایک قافلہ بہت سا تجارتی سامان لیکر شاہراہ سے گذرنے والا ہے۔ رسول اللہ نے اپنے چچا حمزہ بن عبدالمطلب کی قیادت میں ایک ٹولی بھجی جس میں تیس نادار مہاجر تھے، انصاری کوئی دھکا۔ ٹولی کو سامان چھیننے کا موقع نہیں ملا۔ قافلہ یہ سلامت مکہ نکل گیا۔

اس کے بعد اگلے چھ ماہ میں چھ دستے بیس سے دو سو آدمیوں پر مشتمل قریش کے شام آنے جانے والے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے کے لئے مدینہ سے بھیجے گئے لیکن ہر بار قریشی لیڈر اپنا قافلہ بچا کر صاف بھیریت نکل گئے۔ ان میں سے چار دستوں کے قائد خود رسول اللہ تھے۔ ان دستوں کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ قریشی قافلہ ہر بار خوب چوکنا ہو کر اور موثر حفاظتی تدابیر اختیار کر کے گذرتے تھے۔ جبکہ رسول اللہ کے دستے ناکافی ہتھیاروں اور بار برداری کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے باعث اتنی تاخیر سے مقررہ جگہ پہنچے کہ قافلہ ان کی دست برد سے باہر نکل چکا ہوتا۔

**پہلا مال غنیمت** | ہجرت کے سترھویں ماہ رسول اللہ نے آٹھوں دستہ مکہ کے مشرق میں بلطن نخل کے علاقہ میں جہاں میں بارہ مہاجر تھے، رسول اللہ کو خبر ملی تھی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ طائف سے مکہ کی طرف جا رہا ہے یہ رجب کا مقدس مہینہ تھا جس میں لڑائی سمجھڑا اور لوٹ مار ممنوع تھی۔ جب دستہ قافلہ کے قریب پہنچا تو قافلہ کا لیڈر انہیں لیڈر سمجھ کر حفاظتی اقدامات کرنے لگا۔ دستہ کے ایک رکن نے چال چلی، اس نے اپنا سر منڈا دیا اور نظاہر کیا کہ حج یا عمرہ کرنے مکہ جا رہا ہے۔ حج اور عمرہ سے پہلے عربوں میں بال کٹوانے کا دستور تھا۔ قافلہ کا لیڈر یہ دیکھ کر بے خوف ہو گیا۔ اور اس نے احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کیں۔ موقع پاکر دستہ کے قائد عبداللہ بن جحش قافلہ پر لڑ لڑ پڑے اور سامان سے لے لے ہوئے اونٹ مدینہ لے آئے۔ اس قافلہ میں شراب، چمڑے کا سامان اور شمش تھی۔ طائف بن تمیم کی اہم خطی تھا۔ مال غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے۔ چار حصے دستہ کے ارکان نے لیے اور ایک حصہ رسول اللہ کو دیا۔ یہ پہلی فوجی جہم تھی جس میں مال غنیمت حاصل ہوا۔

# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

## تقسیم کے بعد

(۱۴)

از سعید احمد اکبر آبادی

یونیورسٹی کی ایک قدیم روایت ہے کہ جلسہ تقسیم اسناد (convocation) کے موقع پر چانسلر، وائس چانسلر، پروفیسر چانسلر اور مہمان خصوصی، یہ سب ترکی ٹوپی برسر اوڑھیں و مطالعہ دربر ہوتے ہیں، افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا ہے جو یونیورسٹی کے قاری کرتے ہیں، پھر جب ہر فیکلٹی کا ڈین اپنے ہاں کے کامیاب امیدواروں کو وائس چانسلر کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس وقت اس کا خطاب وائس چانسلر سے اور اس کے جواب میں وائس چانسلر کا اعلان کہ میں ان طلباء کو ڈگری دینا منظور کرتا ہوں، یہ سب کچھ عربی زبان میں ہوتا ہے، ان دونوں کے لئے مخصوص عربی عبارتیں ہیں جو بعینہا محفوظ چلی آرہی ہیں، جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھ دین اور وائس چانسلر کو یہ عربی عبارت برلوزک زبان یاد کرنی ہوتی ہے، زیدی صاحب کو اسلامی کردار تو بڑی چیز ہے، یونیورسٹی کے رواجی کردار تک کا اتنا خیال تھا کہ ایک مرتبہ کورٹ کی شینگ میں ایک صاحب نے رزلوشن پیش کیا کہ کنووکیشن کے موقع پر ڈین اور وائس چانسلر جو فارمولا عربی میں پڑھتے ہیں وہ اردو میں پڑھیں، لیکن زیدی صاحب نے اس پر بحث کی ضرورت



بھی محسوس نہیں کی اور ان کی درخواست پر محرک نے تجویز واپس لے لی، اسی طرح کورٹ میں ایک مرتبہ موسیقی کا ایک شعبہ قائم کرنے کی ایک صاحب نے تجویز پیش کی تو معمولی گفتگو کے بعد زیدی صاحب کے ایما پر محرک نے اسے بھی واپس لے لیا۔

زیدی صاحب کو مسلمانوں کی زبوں حالی اور پسماندگی کا شدید غم اور دکھ ہے انہوں نے مجھ سے بار بار کہا: مولانا! کوئی مسلمان لڑکا جو فرسٹ کلاس ہو، چاہے وہ کیسے ہی غریب گھرانہ کا ہو میرے پاس لے آئیے، میں اس کو ضائع نہ ہونے دوں گا، اور فی الحقیقت ہوا بھی ایسا ہی! متعدد لڑکوں کو میں جانتا ہوں کہ انتہائی غریب گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ٹرسٹ کلاس تھے، زیدی صاحب نے ان لڑکوں کی ہر قسم کی مدد کی اور آج یہ لڑکے ہندو بیرون ہند میں عزت اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا نواب علی یادو جنگ کے زمانہ میں جو فتنہ و فساد ہوا اس کا سبب ہی یہ تھا کہ انجینئرنگ کالج میں مقامی طلباء کا جو کوٹہ مقرر تھا نواب صاحب اسے ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے برعکس زیدی صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ یونیورسٹی کے مڈیکل کالج کے ہاسپٹل کے لئے اتر پردیش گورنمنٹ کو رقم دینی تھی، لیکن گورنمنٹ نے شرط یہ لگائی کہ مڈیکل کالج میں دانشہ کے لئے یونیورسٹی کے طلباء کا کوئی کوٹہ نہ ہوگا۔ زیدی صاحب نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، بہت دنوں تک بات چیت چلتی رہی، گورنمنٹ اپنے موقف سے نہیں ہٹتی تھی اور زیدی صاحب اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے تھے، آخر گورنمنٹ کو زیدی صاحب کے مطالبہ کے مطابق پچاس فی صدی کا کوٹہ تسلیم کرنا پڑا: ع

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا کجا

ستمبر ۶۲ء میں جب میں ایک برس کی رخصت پر کناڈا جانے لگا اور روانگی سے پہلے کی شب میں ایس ایس ہال کے ڈائننگ ہال میں میرا وراعیہ ڈنر ہوا تو مختلف شعبوں کے پروفیسروں اور اساتذہ وغیرہم کے ساتھ زیدی صاحب بھی اس میں شریک تھے اور ڈنر کے ختم پر میری نسبت اپنے مشفقانہ خیالات اور جذبات کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ یونیورسٹی کے تعلق سے یہ میری اور ان

کی آخری ملاقات تھی، میں کناڈا میں ہی تھا کہ زیدی صاحب اپنے عہدہ کی مدت پوری کر کے سبکدوش ہو گئے، علی گڑھ واپس پہونچا تو سنا کہ زیدی صاحب کو علی گڑھ سے رخصت کرتے وقت اساتذہ اور طلباء نے اپنے قلبی رنج و ملال کا اور ان کی ذات کے ساتھ محبت اور احترام کا جو عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے وہ یونیورسٹی کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں | اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ زیدی صاحب یونیورسٹی کے چند اعلیٰ عہدہ دار نے یہ سب کارنامے تنہا اور بنفس نفیس انجام دے ڈالے، درحقیقت کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا قابل اور لائق اور مضبوط عزم و ارادہ کا انسان ہو، کسی ادارہ کی ذمہ دارانہ خدمت کے عہدہ سے اس وقت تک سبکدوش ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کے ساتھ اچھے رفقاء کی ایک جماعت نہ ہو اور اس کو ان سب کا تعاون حاصل نہ ہو، ایک اعلیٰ درجہ کے ایڈمنسٹریٹر کی پہچان یہی ہے کہ وہ خود محنت، ایمانداری اور قابلیت سے کام کرتا ہے اور اپنی پسند کے ساتھی منتخب کر کے ان سے کام لیتا اور ان کی رفاقت سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھاتا ہے، اس بنا پر ضروری ہے کہ اس عہدہ کے اُن چند اعلیٰ عہدہ داران یونیورسٹی کا بھی اس موقع پر تذکرہ کیا جائے۔ جو زیدی صاحب کے دست و بازو اور دل سے ان کے معاون اور مددگار تھے، اس سے آپ کو اس زمانہ کے یونیورسٹی کے ماحول اور فضا کا بھی اندازہ ہو گا۔

۳۹ جب میں سکے میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل مقرر ہو کر وہاں پہونچا تو میرے استاذ شمس العلماء مولانا عبدالرحمن صاحب (دہلی یونیورسٹی) مرحوم نے مجھ کو کراچی سے مبارکباد کا خط لکھا اور تحریر فرمایا: اس بات کو نہ بھولنا کہ تمہاری کرسی وہ ہے جس پر دس برس تک سر ڈینی سن راس بیٹھا ہے، لیکن ڈینی سن راس دوسروں سے خوب کام لیتا اور خود کام کم کرتا تھا، تم سے امید ہے کہ تم خود بھی کام خوب کرو گے اور دوسروں سے بھی اسی طرح کام لو گے۔



سیدنا علامہ سید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ | سیدنا اس زمانہ میں یونیورسٹی کے چانسلر تھے، اگرچہ وہ مسلمانوں کے ایک خاص مذہبی فرقہ کے امام اور روحانی پیشوا تھے، لیکن نہایت متقی اور پرہیزگار اور عابد شب زندہ دار تھے، معمولی شعائر اسلام کا بھی بہت خیال رکھتے تھے، میں نے خود دیکھا ہے مغرب کی نماز اور اس کے بعد اوراد و وظائف سے ایک گھنٹہ سے کم میں فارغ نہیں ہوتے تھے، ان کے دل میں پوری ملت اسلامیہ کا بڑا درد اور اس کے مسائل و معاملات کا بڑا احساس تھا، ان کا ایجوکرم ہند اور بیرون ہند کے اسلامی اداروں پر برستار رہتا تھا، علی گڑھ یونیورسٹی کی بھی لاکھوں سے مدد کی، وہ محض خانہ پری کے لئے چانسلر نہیں تھے، بلکہ یونیورسٹی کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے اور صلاح و مشورہ میں برابر شریک رہتے تھے، میرے زمانہ قیام میں علی گڑھ کئی مرتبہ تشریف لائے، اس موقع پر اساتذہ و غیر ہم سب سے ملنے اور یونیورسٹی کے معاملات پر گفتگو فرماتے، دینیات کی فیکلٹی میں جو کام ہو رہا تھا اس سے واقف تھے اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، ایک مرتبہ مجھ کو خاص طور پر تنہائی میں یاد فرمایا اور اسلام اور مسلمانوں پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، اسی اثنا میں میں نے عرض کیا کہ میں فیکلٹی آف تھیالوجی کو اسلامی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ایک مرکز (INSTITUTE OF ADVANCED ISLAMIC STUDIES) کی شکل میں دیکھنے کا متنی ہوں اور اس کے بعد میں نے اس کا خاکہ پیش کر کے عرض کیا کہ کم از کم پچیس لاکھ روپیہ سے اس کا آغاز ہو سکتا ہے، تو چند سوالات اور ان کے جوابات کے بعد مسرت کے اظہار کے ساتھ فرمایا: ”آپ اللہ کا نام لے کر شروع کیجئے اور یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے ماتحت مختلف مراحل و منازل سے گزرنے کے بعد جب اسکیم پختہ ہو جائے تو چند روز کے لئے میرے پاس بمبئی چلے آئیے۔“ مگر افسوس ہے ۱۹۶۵ء میں ایک شدید زلزلہ آیا تو سارے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بساط کہن ہی الٹ گئی۔

آں قدح بشکست و اس ساقی مانند

سیدنا یونیورسٹی کے جس کسی فنکشن میں شرکت فرماتے وہاں طلباء اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ

ننگے سران سے سامنا نہ ہو، ان کو اس طرح کی باتیں بہت بری لگتی تھیں، علی گڑھ میں قیام کے دنوں میں ایک روز ضرور تہمند طلباء کی ملاقات کے لئے مخصوص ہوتا تھا، پہلے سے دن اور وقت کا اعلان ہو جاتا اور اس کے مطابق جناب موصوف اپنے سکریٹری اور اکاؤنٹنٹ کے ساتھ مولانا آزاد لائبریری میں آکر بیٹھ جاتے طلباء یکے بعد دیگرے اپنی درخواست کے ساتھ ان کے سامنے پیش ہوتے اور آپ درخواست پڑھوا کر سننے کے بعد اس پر حکم صادر فرماتے اور اکاؤنٹنٹ حکم کی فوراً تعمیل کر دیتا، اس طرح سینکڑوں طلباء کی ضرورت رفع ہو جاتی اور بے ساختہ ان کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔

نواب سراج سعید خاں آف چٹاری نواب صاحب اس زمانہ میں پروجائسلر تھے اور آج کل چائسلر ہیں۔ نواب صاحب سرسید کی بزم کہن کی دشت روشن ہیں کہ اگر کوئی پوچھے کہ سرسید علی گڑھ سے کس قسم کے لوگ پیدا کرنا چاہتے تھے تو شنیدہ کے بودا منندیدہ کے مطابق فوراً بے تکلف نواب صاحب کی طرف اشارہ کر دیجئے اور فر سے کہئے: ”ایسے“ سرسید کا اصل مقصد و منشا علامہ اقبال کے لفظوں میں ”دین و دنیا ہم آمیز کہ اکسیر ایست“ کے سوا اور کیا تھا! نواب صاحب جنہوں نے سرسید کی آنکھیں دیکھی ہیں اس مصرع کا صحیح مصداق ہیں، انگریزوں کے زمانہ میں کسی صوبہ کا گورنر یا حیدر آباد ایسے عظیم ریاست کا وزیر اعظم ہو جانا ایک ہندوستانی کی حراج تھی، نواب صاحب ان دونوں پر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فائز رہے، ساتھ ہی عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے یکے اور سچے مسلمان۔ اسلامی اخلاق و عادات اور مشرق کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا ایک پیکر حسین بھی، قرآن مجید کے حافظ ہیں اور اس کا اتنا اتہام کرتے ہیں کہ گورنری کے زمانہ میں بھی محراب سنائی نافذ نہیں کی، تین برس پہلے عید کے موقع پر میں حاضر

۱۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۹ء ہے، اس حساب سے سرسید کے انتقال کے وقت

آپ نو برس کے تھے۔



ہوا تو مسرت کے ساتھ فرمایا: میں نے اس سال ۶۹ ویں عہدِ سنائی ہے، بے شبہ: ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ پھر خود نواب صاحب نہیں، بلکہ عورتیں اور مرد لہڑھے اور جوان چھوٹے اور بڑے سب ہی دیندار اور کٹھنڈہبی ہیں۔ نواب صاحب کو یونیورسٹی سے محبت نہیں عشق ہے، وہ اس کے تمام اہم معاملات و مسائل میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، کبر سن کے باوجود یونیورسٹی کی تمام تقریبات میں پابندی سے شریک ہوتے، گھنٹوں بیٹھے رہتے اور تقریر کرتے ہیں، ان کی ایک معین سالانہ رقم ہے جس سے طلباء کی مدد کرتے ہیں، یوں بھی دست گردان کوئی ضرورت مند پہنچ جائے تو بے نیل رام نہیں آتا۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی اوصاف و کمالات کے باعث ہندو مسلمانوں اور گورنمنٹ، سب کے ہاں بڑی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، نواب صاحب نے ”یاد ایام“ کے نام سے اپنی خود نوشت سوانح عمری عمدہ کتابت و طباعت اور کاغذ کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کر دی ہے جو بڑی دلچسپ، بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں | ڈاکٹر صاحب برصغیر انڈیا پاک کے مشہور فاضل، مورخ، ادیب اور مصنف ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور اردو، تینوں زبانوں میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں جو معیاری اور بلند پایہ ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں عرصہ تک تاریخ اور سیاسیات کے استاد رہنے کے بعد جب وہاں سے سبکدوش ہوئے تو زیدی صاحب کی نظر انتخاب نے ان کو تارا اور یہ یونیورسٹی کے پروفیسر پائلر ہو کر علی گڑھ آ گئے، ڈاکٹر صاحب پختہ عقیدہ اور کڑار کے مسلمان ہیں، اس معاملہ میں وہ کبھی اس درجہ جذباتی ہو جاتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا ان کے ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے، اعلیٰ درجہ کے پٹھان ہونے کے باعث وہ بالکل صاف ستھرے اور کھرے آدمی ہیں، مصلحت پسندی کا ان کے ہاں گند رہی نہیں، وہ الفاظ کو چبانا اور حقائق کو گھا پھر کر بیان کرنا نہیں جانتے، جو بات دل میں ہے اس کو بر ملا کہنے میں ان کو اس بات کا ڈر نہیں کہ اس سے عزت سادات رہے گی یا جائے گی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے برادر خورد ہیں، لیکن افتادِ طبع اور مزاج کے

اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق تھا، بڑے بھائی کا عمل حسرت کے اس شعر پر تھا:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات

سنے نہ کوئی مرے دل میں یا دہن میں ہے

لیکن برادر خرد کی طبیعت کا آئینہ دار یہ شعر ہے:

فاش می گویم و از گفتم خود دل شادم

بندہ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا گوشہ خاطر اسلام پسند گروپ کی طرف تھا وہ اس کو چھپاتے نہیں تھے اور اکاڈمک کونسل، اکزیکوٹو کونسل اور کونسل، غرض کہ جہاں کہیں موقع ہوتا وہ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے تھے، لیکن اب غالباً ڈاکٹر صاحب نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اسلام پسندی کا وہ شور و غوغا محض ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے تھا اور اسلام کی محبت اور دین کے ساتھ مخلصانہ تعلق سے ہرگز اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا، بہر حال مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو قلبی تعلق اور لگاؤ ہونا چاہئے وہ تو تھا ہی۔ مزید برآں علی گڑھ سے ڈاکٹر صاحب کا دیرینہ اور خاندانی تعلق بھی تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے بحیثیت پرووائس چانسلر کے اپنے عہدہ کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے بڑی جانفشانی، محنت اور ایمانداری سے اپنے منصبی فرائض و واجبات انجام دیے، ان کو طلباء کے ساتھ اور طلباء کو ان کے ساتھ محبت تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس عہدہ کا وقار ان کی ذات کے ساتھ قائم تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کی اسلامی، علمی اور ادبی فضا میں سرگرمی اور جوش کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہو جائے، کبھی کبھی زیدی صاحب اور ڈاکٹر صاحب میں اختلاف رائے شدید ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر جلد ہی صلح صفائی بھی ہو جاتی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی ”یادوں کی دنیا“ کے نام سے اپنی سوانح عمری لکھی ہے جو کافی ضخیم ہے، مگر ساتھ ہی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

عابدی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی حاجی صاحب اس زمانہ میں ٹرینڈر تھے، آپ نے اس



انتہائی ذمہ دارانہ اور نازک عہدہ کے فرائض و واجبات جس محنت و مشقت اور دل کی لگیں کے ساتھ انجام دیے اس کی مثال اس زمانہ میں عنقا ہے، وہ اس عہدہ کی کوئی تحزاہ نہیں لیتے تھے لیکن کام اس انہماک سے کرتے تھے کہ صبح کو دس بجے کے قریب دفتر آتے اور شب میں نو سائے نو کے قریب ہی وہاں سے نکلتے تھے۔ حاضر حواسی کا یہ عالم تھا کہ دفتر کی ایک ایک چیز پر ان کی نظر رہتی تھی، پٹری ریلوے میں مالیات سے متعلق شدید اعتراضات کی صفائی اور یونیورسٹی کی ان سے برأت کے سلسلے میں جو کچھ ریا رک کیا گیا ہے اور جو پہلے گند چکا اور اس میں حاجی صاحب کی سوجھ بوجھ اور قابلیت کو بڑا دخل ہے، حاجی صاحب جو لڑا مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ہیں ان کے خاندان کا علی گڑھ اور سرسید سے جسم و جان کا تعلق رہا ہے، اسی تعلق کا نتیجہ ہے کہ حاجی عبید الرحمن خاں صاحب شیروانی نے اپنا لاکھوں روپیہ کا ..... اور انتہائی بیش قیمت نو اور پریشکل کتب خانہ یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔ موصوف ایک زمانہ میں چند مہینوں کے لئے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت بھی یونیورسٹی سے ایک پیسہ نہیں لیا اور اب بھی کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے، ایک اچھے مسلمان کی پہچان یہی ہے کہ اس کے دیکھے سے خدا یاد آئے اور نیکی کی ترغیب ہو۔ موصوف اسی قسم کے مسلمان ہیں، ایک عربی شاعر نے اپنے ممدوحین کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ آپ پر بھی صادق آتے ہیں۔ کہتا

ہے:

ہیون، لینون، ایساؤ ذو وکسہ

سواس مکرمة ابناء ایسا

ترجمہ: یہ لوگ نرم خواہ اور نرم طبیعت ہیں، خوش حال اور ارباب کرم ہیں، بزرگیوں کے بانی

۱۔ اردو میں کرم کا لفظ مہربانی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، لیکن عربی میں اس کے معنی نہایت وسیع ہیں

اور جملہ فضائل و کمالات اخلاقی پر مشتمل ہے۔

اور خوشحال لوگوں کی اولاد ہیں (یعنی نودولیتے نہیں ہیں)

رجسٹرار وائی، ڈی خاں | زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپوں میں جو کشمکش برپا رہتی تھی اس کی تان غریب رجسٹرار اور اس کے دفتر پر ٹوٹتی تھی، جہاں الٹنگ کونسل یا اکیڈمی کونسل یا کورٹ کی میٹنگ شروع ہوئی اور گزشتہ میٹنگ کی کارروائی پڑھی گئی کہ رجسٹرار پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی، ایک صاحب فرماتے ہیں: ”قلاں آئیٹم کی نسبت جو فیصلہ ہوا تھا اس کا اندراج غلط ہوا ہے۔“ ایک دوسرے نے کہا: ”زندہ یوشن یہ منظور ہی نہیں ہوا تھا تو رپورٹ میں اسے منظور کیسے لکھ دیا گیا ہے“ تیسرے نے شکایت کی کہ میٹنگ کا ایجنڈا قاعدہ کی رو سے پندرہ دن پہلے آنا چاہئے تھا لیکن رجسٹرار آفس سے ابھی چار دن پہلے آیا ہے“ چوتھے بولے: ”قلاں مسئلے پر میں نے جو تقریر کی تھی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔“ پانچویں نے ارشاد فرمایا: ”قلاں پوسٹ کے متعلق سیکشن کیٹی نے جو فیصلہ کیا تھا رجسٹرار کی رپورٹ میں اس کا اندراج اشتباہ انگیز لفظوں میں ہوا ہے، غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں، رجسٹرار اور اس کا دفتر سخت پریشان رہتا تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سب سوالات بے معنی ہی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ جیسا کہ چٹرجی کیٹی کی رپورٹ میں درج ہے۔ رجسٹرار آفس سے چھوٹی بڑی فروگزاشتیں اور غلطیاں ہوتی بھی رہتی تھیں، اس بنا پر زیدی صاحب کو خیال ہوا کہ رجسٹرار کی پوسٹ کے لئے کوئی پرانا تجربہ کار اور لائق و محنتی شخص لایا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے کہ اسسٹنٹ رجسٹرار کی متعدد پوسٹوں پر اپنے ڈھب اور پسند کے آدمیوں کا تقرر کرے، چنگے انھوں نے جستجو شروع کی اور آخر کار وائی۔ ڈی (غالباً یا ورداد) خاں صاحب کو رجسٹرار کی پوسٹ پر لے آئے، موصوف اس سے پہلے ایک عرصہ تک پونا میں کام کر چکے تھے اور اس بنا پر بڑے تجربہ کار اور منجھے ہوئے تھے۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے، یونیورسٹیوں کے طریق کار سے خوب واقف تھے، دفتری نظم و نسق میں بڑی مہارت تھی اور نہایت مستعد، چست اور ہمتور۔ حاضر حال آئی تھے، جب وہ علی گڑھ آئے ہیں اس وقت ان کی عمر ۵۸، ۵۹ برس کی ہو گئی



لیکن اس کے باوجود انہیں کام کی دھن اور محنت کی لگن ایسی تھی کہ صبح کو دس بجے کے قریب آفس میں بیٹھتے تو شام کو ۸ بجے کے قریب ہی وہاں سے بھٹکتے تھے اور پھر بھی جب قیام گاہ پر آتے تو ناکلوں کا پلندہ ان کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ سونے سے پہلے اور سونے کے بعد پلنگ پر لیٹے لیٹے انہیں پڑھتے تھے۔ انہوں نے رجسٹرار آفس کے لفظ و نسق میں بہت سی مفید اور کارآمد اصلاحات کیں اور اس عہدہ کے وقار کو اونچا کیا، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ زیدی صاحب یونیورسٹی کے لئے جو کچھ کر سکے اس میں دفتری کاموں کے اعتبار سے خاں صاحب کی مستعدی، تجربہ کاری اور محنت و لیاقت کا بھی بڑا حصہ ہے، اکاؤنٹ کو نسل وغیرہ میں رجسٹرار پر جو لے دے ہوتی تھی خاں صاحب کے آنے کے بعد اس کا سلسلہ ختم تو نہیں ہوا۔ لیکن بہت کم ہو گیا، اگر کوئی بات ان سے پوچھی جاتی تو فوراً اس کا معقول جواب ملتا تھا۔

کسی اڈمنسٹریشن کے حسن و قبح کا دار و مدار موقع و محل، زمان و مکان اور متعلقہ افراد و اشخاص پر ہوتا ہے، جاگیرداری اور آمریت کے زمانہ میں اڈمنسٹریشن کا جو طریقہ کامیاب ہو سکتا تھا وہ جمہوریت کے دور میں نہیں ہو سکتا اور کسی گورنمنٹ کے سکرٹریٹ میں اچھے اڈمنسٹریشن کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ اگر بعینہا یونیورسٹی میں اختیار کی جائیں تو ان سے نقصان پہونچ سکتا ہے، جہاں تک جمہوریت کے عہد اور اس کے دور میں ایک اچھے اڈمنسٹریشن جو اوصاف و کمالات ہونے چاہئے بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ زیدی صاحب کو ان میں بہرہ وافر ملا ہے، انہیں خود بھی اس کا احساس تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: ”میرے نکتہ چینی اگر یہ کہیں کہ میں علمی آدمی نہیں ہوں تو میں اسے تسلیم کر لوں گا۔ لیکن میں اس بات کو کیسے مان سکتا ہوں کہ مجھے اڈمنسٹریشن بھی نہیں آتا۔“

مسٹر بدر الدین طیب جی | ۱۹۴۷ء کے آخر میں زیدی صاحب سبکدوش ہو گئے تو ان کی جگہ جناب بدر الدین طیب جی کا تقرر ہوا۔ موصوف سوادو برس کے قریب والس چانسلر رہے، حکومت ہند کے حکمران خارجہ میں اڈیشنل سکرٹری اور سینئر آئی۔ سی۔ ایس تھے اس لئے وہ سپن ان کی

گھٹی میں پڑا تھا۔ داغ صاف ستھرا اور بے گنجلک تھا، وہ سچے اور کھرے انسان اور غیر معمولی جرأت و جسارت کے مالک تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کی اپنی کار، اپنے ملازم، اپنے برتن اور اپنا فرنیچر یہ سب چیزیں یونیورسٹی کی چیزوں سے الگ تھیں، ان کے گھر میں کسی کی مجال نہ تھی کہ یونیورسٹی کی کوئی معمولی سے معمولی چیز بھی گھر کے کلم میں لائے۔ ان کا بچہ زمری میں پڑھتا تھا اس کی والدہ خود اپنی کار میں اسے روزانہ لے جاتی اور پھر واپس لاتی تھیں۔ وہ اس رعب و اب کے آدمی تھے کہ ضلع کا انسر بھی وقت کے تقرر اور ان کی اجازت کے بغیر ان سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے یونیورسٹی کا وقتا۔ اور مرتبہ بلند کیا، ایک مرتبہ شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی تھی، بدرالدین طیب جی کو معلوم ہوا کہ بارہ سینے کالج کے ہندو طلباء ایک میٹنگ کر رہے اور حسب معمول ایک جلوس نکالنے کا ارادہ کر رہے ہیں، مغرب سے پہلے جھپٹے کا وقت تھا، وہ اسپورٹس مین کے لباس میں فوراً اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ سیدھے کالج پہنچ گئے، طلباء پر ان کی اس جرأت اور صاف دلی کا غیر معمولی اثر ہوا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ جلوس نہیں نکالیں گے، علاوہ ازیں انھوں نے حکام ضلع کو بھی چوکنا کیا اور خود بھی رات میں کئی مرتبہ شہر کا گشت کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک وہ رہے فرقہ وارانہ فساد کا پتہ بھی نہیں کھڑکا۔ ایک اخبار نے ایک مرتبہ یونیورسٹی کے متعلق ایک غلط سلسلہ فتنہ انگیز خبر چھاپ دی، بدرالدین طیب جی کو علم ہوا تو اوڈیٹر کو بلا کر جواب طلب کیا اور کہا: ”اخبار کی آئندہ اشاعت میں نمایاں طور پر اس غلط خبر کی تردید ہو جانی ضروری ہے، ورنہ میں اخبار کا لائسنس منسوخ کرادوں گا۔“ چنانچہ اخبار میں خاطر خواہ طور پر تردید شائع ہو گئی۔

بدرالدین طیب جی موروثی طور پر کٹر نیشنلسٹ تھے، لیکن ان کے ہاں نیشنلزم کا تصور یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ بڑی مچھلی کو چھوٹی مچھلی کے ٹہرپ کر لینے کی اجازت دے دی جائے۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ مسلمانوں کے ملی وجود کے بقا کا دار و مدار ان کے مذہب، ثقافت اور روایات کے زندہ رہنے پر بھی ہے، اس بنا پر علی گڑھ میں ایک دو مرتبہ نہیں مختلف جلسوں اور



جلسوں میں بار بار بڑی قوت سے کہا کہ یہاں آکر مجھے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ اگرچہ اس درس گاہ کے دروازے کسی پر بھی بند نہیں ہوئے، لیکن اس کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کی تعلیم و تربیت تھا اور پھر فرماتے کہ جس طرح یہ مقصد سرسید کے زمانہ میں تھا اسی طرح آج بھی اس کا مقصد یہی ہونا چاہیے۔ موصوف کو اپنے اس خیال کی صداقت کا اس درجہ یقین تھا کہ جب ایک مرتبہ یہ افواہ اڑی کہ یونیورسٹی کے نام سے لفظ ”مسلم“ خارج کر دیا جائے گا تو انہوں نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا اور اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں دھاندلی کی تو میں فوراً استعفا دے دوں گا۔

چتر جی کیٹی نے اپنی رپورٹ میں طلباء کے داخلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جو طلباء ایک مرتبہ یونیورسٹی میں داخل ہو کر یونیورسٹی برادری کا جز ہو گئے ان کا حق ہے کہ آئندہ داخلہ کے معاملہ میں ان کو باہروالوں پر چند شرائط کے ساتھ ترجیح دی جائے، بدرالدین طیب جی کا وہ خیال تو تھا جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اب رپورٹ کی اس سفارش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اکاڈمک کونسل سے یہ بات منظور کرائی کہ انجینئرنگ کالج میں خود اپنے یونیورسٹی کے طلباء کے داخلہ کا تناسب ۵۰ فی صد ہوگا۔ میں بیرون ہند تھا اس لئے اکاڈمک کونسل کی اس میٹنگ میں شریک نہ تھا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا بیان ہے کہ ”جب انہوں (بدرالدین طیب جی) نے یہ مسئلہ اکاڈمک کونسل کے سامنے پیش کیا تو یہ بھی کہا کہ میں نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر کوٹھاری سے اس کے متعلق گفتگو کر لی ہے اور وہ میری رائے سے متفق ہیں“ چنانچہ اس پر عمل ہونے لگا اور انجینئرنگ کالج میں مقامی اور غیر مقامی طلباء کا یہ تناسب قائم ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ کسے خبر تھی کہ دو برس کے بعد یہی چیز یونیورسٹی کے

لئے ایک شدید بھونچال ثابت ہوگی۔

جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کے کنونشن منعقدہ دہلی۔ مارچ ۱۹۷۳ء میں جو خطبہ صدارت پڑھا تھا اس میں انہوں نے کہا ہے: ”بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی میں حکمرانی ایسی ہی کی جیسے ایک ضلع کا حاکم ضلع پر کرتا ہے، وہ انزکٹو کونسل، اکاڈمک کونسل اور کورٹ کے ممبروں کا بہت کم لحاظ کرتے تھے“ (ص ۱۰) لیکن مجھ کو اس ریمارک سے اتفاق نہیں ہے، اگر جسٹس بشیر احمد سعید صاحب بجائے ”ضلع کے حاکم“ کے یہ کہتے کہ بدرالدین طیب جی کا ڈسٹرکشن انگریزوں کے ڈسٹرکشن جیسا تھا تو میرے نزدیک یہ بات صحیح ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ ایک علی گڑھ ہی نہیں، بلکہ آزادی کے بعد سے دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرح سب ہی یونیورسٹیوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اکاڈمک کونسل، سنڈیکیٹ، اور کورٹ وغیرہ کی میننگس میں وہ سنجیدگی اور متانت نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے اور یہ اچھی خاصی بحث و مناظرہ کی مجلسیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یہ مجلسیں مقابلہ پھر بھی بہت فہمیت اور سنجیدہ ہوتی تھیں اور ان میں ہلڑ بازی نہیں ہوتی تھی، با اینہم چند گنے چنے حضرات ایسے بھی تھے جو موقع بے موقع اور ایک ہی چیز پر بار بار بولنے کے عادی تھے اور چونکہ زیدی صاحب ایک عوامی طبیعت رکھتے تھے اس لئے ان کے ہاں تقریروں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی، نتیجہ یہ تھا کہ اکاڈمک اور انزکٹو کونسل وغیرہ کی میننگس پانچ چھ گھنٹے اور کبھی صبح و شام دونوں وقت چلتی تھیں۔ بدرالدین طیب جی ڈسپن کے معاملہ میں زیدی صاحب سے بالکل مختلف آدمی تھے، انہوں نے اکاڈمک کونسل اور انزکٹو کونسل وغیرہ کی میننگس کو کمزور کر دیا، وہ بار بار اور بے ضرورت کسی کو نہیں بولنے دیتے تھے اس لئے جو حضرات زیادہ بولنے کے عادی تھے۔ اور

۱۔ اسی سلسلہ میں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ اور مشاہدہ دہلی یونیورسٹی کے اس دور کا جب کہ سربراہ کالوریشن چاہتے تھے اپنے کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں۔



جسٹس بشیر احمد سعید صاحب کا شمار بھی انہیں حضرات میں تھا۔ انہیں بدرالدین طیب جی کی اس روک ٹوک سے طبعاً بیزاری ہوئی ہی چاہئے تھی، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بدرالدین طیب جی میں ایک قسم کی حاکیانہ ضد اور ہٹ تھی، وہ جس بات پر اڑ گئے، اڑ گئے، اپنے سامنے کسی کی چلنے نہیں دیتے تھے، اسی وجہ سے بعض حضرات نے تو اکاڈمک کونسل کی میٹنگ میں آنا بالکل ہی ترک کر دیا تھا، اور ان کے کٹھن کونسل اور کورٹ کی میٹنگس میں بھی وہ پہلی سی ہمہ جہاں اور چہل پہل نہ رہی تھی۔

ان کی ضد کی وجہ سے ایک مرتبہ مجھے بھی بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہوا یہ کہ شعبہ سنی دینیات میں دو لکچروں کا انتخاب ہونا تھا۔ . . . . . ان میں ایک لکچر کم۔ ناظم دینیات کی پوسٹ تھی اور دوسری لکچر برائے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کی، جب ان دونوں جگہوں کے لئے امیدواروں کا انٹرویو ہو چکا اور بدرالدین طیب جی نے میری رائے معلوم کی تو میں نے دو امیدواروں کا نام لیا، یہ سنتے ہی طیب جی کا موڈ بگڑ گیا اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں زور دے کر فرمایا: ”پہلی پوسٹ کے لئے آپ نے جس کی سفارش کی ہے، یہ نرے مولانا ہیں، انگریزی سے بالکل نا بلند۔ پھر یہ یونیورسٹی کے طلباء کو کیا فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ دوسرے امیدوار کی نسبت تسخیر کے انداز میں فرمایا: ”مانا کہ یہ ایم۔ اے، ال۔ ال۔ بی ہیں، لیکن یہ پوسٹ تو مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی ہے، امیدوار نے جب ویدوں کا اور عہد نامہ قدیم و جدید کا مطالعہ ہی نہیں کیا تو اس پوسٹ کا حق کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔“ میں نے عرض کیا: میرے نزدیک ایک امیدوار کی عمدہ صلاحیت اور متعلقہ پوسٹ کے لئے اس کے استحقاق کی دلیل یہ ہے کہ امیدوار کو اپنے مضمون کے ساتھ شغف اور وہابانہ تعلق ہو، اس کا مطالعہ برابر جاری رہے اور اس نے تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہوں۔ اس کے بعد میں نے کہا: اس معیار پر یہ دو امیدوار پورے اترتے ہیں۔ چنانچہ یہ ان کے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کو ملاحظہ

فرمائیے، اس سے میری بات کی تصدیق ہوگی، اب رہی یہ بات کہ یہ حضرت انگریزی نہیں جانتے تو واقعہ یہ ہے کہ میں خود انگریزی کو ایک لکچر کے لئے ضروری شرط قرار دیتا ہوں، لیکن یہ پوسٹ اس لکچر کی ہے جسے ناظم دینیات کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس پوسٹ پر ایک باقاعدہ عالم، متشرع اور متدین کا تقرر ہو تاکہ ناظم دینیات کی پوسٹ کا تقدس برقرار رہے، اس لئے اس شخص کے حق میں میرے نزدیک انگریزی کی شرط پر اصرار کرنا مناسب نہ ہوگا۔ دوسرے امیدوار کی نسبت میں نے کہا: یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ امیدوار نے ہندو مذہب اور یہودیت و عیسائیت کا سرے سے مطالعہ کیا ہی نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں جو سوالات انٹرویو میں ان سے کئے گئے تھے ان کے جوابات انہوں نے ایسے ضرور دیے ہیں کہ ان کو بچاس فی صد نمبر دیے جاسکتے ہیں، یہ مستعد، محنتی اور علمی و تحقیقی ذوق کے آدمی ہیں اس لئے میں نگرانی رکھوں گا۔ امید ہے وہ اپنی خامی جلد پوری کر لیں گے۔

لیکن طیب جی کہاں ماننے والے تھے، چارپانچ منٹ ان کے اور میرے درمیان کھکھش رہی، اس موقع پر اکیپرٹ حضرات حسب دستور خاموش رہے، آخر جب میں نے کہا: "وائس چانسلر صاحب! جن دو شخصوں نے اسلامیات پر محنت کی ہے، ریسرچ اور تحقیق کر کے قابل قدر علمی خدمات انجام دی ہیں، اگر ان کو اپنی محنت اور ذوق و شوق کی داد مسلم یونیورسٹی میں بھی نہیں مل سکتی تو کہاں ملے گی؟" وائس چانسلر صاحب یہ سنتے ہی ہنس پڑے اور موقع پا کر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بھی میری حمایت میں بولے تو فرمایا: "بہت اچھا! آپ کو اتنا اصرار ہے تو یہی سہی! لیکن یہ یاد رکھئے کہ ان دونوں کا تقرر حسب قاعدہ ایک برس کے لئے آزمائش ہوگا، اس ایک برس میں ایک صاحب کے لئے انگریزی میں اچھی خاصی استعداد کا بہرہ پہنچانا ضروری ہوگا اور دوسرے کو یہ بتانا ہوگا کہ انہوں نے سال بھر میں ہندو مذہب اور یہودیت و عیسائیت پر آپ کی ہدایت کے مطابق کتنی کتابیں باقاعدہ پڑھی ہیں، اور پھر



دروے کو فرمایا : اب ان دونوں کی نگرانی آپ کا کام ہے، سال پورا ہونے کے بعد جب تک آپ اپنی رپورٹ میں ان دونوں باتوں کا مجھے اطمینان نہیں دلائیں گے میں ان کو مستقل (Condemned) نہیں کروں گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ طیب جی کا معاملہ طلباء کے ساتھ بہت نرم اور دلجوئی کا اور اساتذہ کے معاملہ میں وہ سخت تھے۔ میرے نزدیک یہ شہرت غلط نہیں تھی لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طلباء کو اپنی اولاد سمجھتے تھے اس کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے، ان کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لیتے، باقاعدہ گھوڑے کی سواری کرتے، تالاب (Swimming pool) میں ان کے ساتھ غسل کرتے اور تیرتے تھے، میں نے خود تو نہیں دیکھا اور وہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ طلباء کس ہال میں ڈنر کھانے بیٹھے، لیکن کھانا جو سامنے آیا تو بے حد خراب لٹکوں نے اسٹرائک کر دی اور وائس چانسلر کی کوٹھی پر پہنچے، طیب جی اس وقت گھر کے اندر بے تکلفی کے ساتھ صرف بنیان اور نیکر پہنے بیٹھے تھے، ان کو لٹکوں کی آمد کا حال معلوم ہوا تو فوراً اسی حالت میں باہر نکل آئے، لٹکوں نے ان کو گھرایا ہوا اور اس لباس میں دیکھا تو بولے : قبلہ! آپ نے لباس تو ٹھیک پہن لیا ہوتا "بدرالدین طیب جی نے جذباتی انداز میں کہا : ہیں! میرے بچے کسی وجہ سے پریشان ہو کر میرے مکان پر آئیں اور میں کپڑے بدلنے میں دیر لگاؤں! یہ کیسے ہو سکتا ہے! " لٹکے آئے تھے احتجاج کرنے، مگر وائس چانسلر کا رویہ اس درجہ شفقانہ دیکھا تو کچھ کہے سنے بغیر واپس جانے لے، بعد میں بدرالدین طیب جی کو لٹکوں کے آنے کی غرض و غایت کا علم ہوا تو اس وقت جو کچھ گھر میں موجود تھا وہ لاکر لٹکوں کے سامنے رکھ دیا اور پردہ و دست کو حکم بھیجا کہ آئندہ وہ کھانے کے خراب ہونے کی شکایت نہ سنیں، لٹکوں کے ساتھ اس تعلق خاطر کے باعث لٹکوں کی معمولی فروگزاشتوں اور غلطیوں سے درگزر کرتے تھے، لیکن جو جرائم خیانتِ نفس کا منظر ہوتے تھے ان پر یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے ماتحت ان کو سزا دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔

اس کے برعکس اساتذہ کا معاملہ دوسرا تھا، بدرالدین طیب جی کی نگاہ اس پر تھی کہ اساتذہ کی ذمہ داریاں بڑی نازک اور اہم ہیں، ملک اور قوم کے معمار و حقیقت یہی لوگ ہیں، نوجوانوں کے مستقبل کا بننا اور بگڑنا انہیں کی فرض شناسی اور اس سے کوتاہی اور غفلت پر مبنی ہے، اس بنا پر اساتذہ کو علم و عمل اور اخلاق کے اعتبار سے طلباء کے لئے ایک نمونہ ہونا چاہئے، لیکن افسوس ہے، علم اور اخلاق میں باہمی سمبندھ کے منقطع ہو جانے کے جو المیہ ناک مظاہر پورے ملک میں نظر آتے ہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی فضا بھی ان سے خالی نہ تھی، یہاں بھی ایسے اساتذہ (اور بعض اور بچے دیکھ کے) موجود تھے جو سر شام اسٹان کلب میں (کچھ بیگمات کے ساتھ اور کچھ تنہا) پہنچ جاتے اور شب میں بارہ ایک بجے سے پہلے گھر واپس نہیں لوٹتے تھے، کلاس پابندی سے نہیں جس کے باعث کورس مکمل نہیں ہوتا تھا، بعض شعبوں کے مدرس صاحبان کا تو یہ حال تھا کہ سال میں دو چار کلاسیں لیں اور پھر غائب! دفتر کے چیراسی سے گھر کا کام لیتے تھے، شعبہ کے فرنیچر کی بعض چیزیں بے تکلف اپنے گھر لے جاتے تھے، یونیورسٹی میں جو پروفیسر صاحبان اور وارڈن ہوتے تھے ان میں بعض حضرات روپیہ پیسہ کے معاملہ میں غیر محتاط تھے، لڑکوں کے روپیہ سے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کی دعوت کرنے میں انہیں تاثر نہیں، پھر یہ مرض تو اس ملک میں ہمہ گیر ہے کہ اپنی یونیورسٹی یا کسی اور یونیورسٹی کے کام سے کہیں کا سفر کیا ہے اور سفر خرچ فرسٹ کلاس کا لیا ہے، حالانکہ سفر تھری کلاس میں ہوا ہے، یا ایک ہی شہر میں دو مختلف اداروں میں گئے ہیں اور دونوں جگہوں سے الگ الگ فرسٹ کلاس کے دو سفر خرچ لئے ہیں۔ بدرالدین طیب جی کو طالب علمی کے زمانہ کے علاوہ اور خصوصاً آزادی کے بعد کے زمانہ میں (جب کہ ہماری تعلیم گاہوں کے زمین و آسمان تبدیل گئے ہیں) کبھی کسی یونیورسٹی سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس بنا پر اب انہوں نے اساتذہ اور انتظامیہ میں اس قسم کے لوگ دیکھے تو غصہ کے ساتھ ان کو اس کا شدید رنج اور صدمہ ہوا اور آدمی چونکہ دنگ تھے، پر کسی بات کی کرتے نہیں تھے۔ اس لئے کسی شخص کی بے عزتی اور ذلت کی خلاف ورزی



ان کے علم میں آئی انھوں نے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے میں ذرا تاہل نہیں کیا۔ بعض اونچے درجہ کے سینئر پرنسپل تھے ان تک کو معطل کرنے میں پس و پیش نہیں کیا، ایک پرنسپل جو چند روز پہلے ہی اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے ان کی نسبت معلوم ہوا کہ طلباء کے فنڈ کے دس ہزار روپے ہڑپ کر گئے ہیں، بدرالدین طیب جی نے ان کو فوراً بلایا اور کہا: یہ روپیہ آج شام تک فنڈ میں جمع ہو جانا چاہئے، ورنہ میں معاملہ پولیس کے سپرد کر دوں گا، ایک ہڈ کلرک کی نسبت پتہ چلا کہ داخلہ کے معاملہ میں اس نے رشوت لے لی ہے، اسے فوراً معطل کر دیا گیا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ ادھر کوئی شخص معطل ہوا اور اس نے کورٹ میں رٹ داخل کر دی۔ بدرالدین طیب جی سوا دو برس کے قریب علی گڑھ میں رہے ہیں، لیکن اس مختصر مدت میں بھی جس کثرت سے لوگ ان کے زمانہ میں معطل ہوئے اور جتنے رٹ یونیورسٹی کے خلاف ان کے زمانہ میں داخل ہوئے کسی والٹس چانسر کے عہدہ میں ایسا نہیں ہوا، ان کے عہدہ کی بھی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے ان کی حکومت کو ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حکومت کہا ہے لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ یونیورسٹی کے اسٹاف اور اس کے عملہ میں یہ خرابیاں تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں اور یقیناً تھیں تو ان کو دور کرنے اور ان کی اصلاح کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اساتذہ اور عملہ میں جو ایماندار، محنتی اور فرض شناس لوگ تھے وہ سب بدرالدین طیب جی کے مداح اور قدردان تھے لیکن جن کے خلاف انھوں نے تادیبی کارروائی کی تھی وہ اور ان کے ہم خیال وہم مشرب انھیں کیوں پسند کر سکتے تھے، البتہ طلباء ان پر جان چڑھتے تھے اور پروانہ داران پر فدا تھے۔

جب وہ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ سے روانہ ہوئے ہیں تو اس وقت طلباء نے جس گرم جوشی، والہانہ محبت اور تعلق خاطر کے جذبات کے ساتھ انھیں رخصت کیا ہے وہ پورا منظر دیدنی تھا۔ زیدی صاحب کی رخصت کے وقت تو میں ہندوستان میں ہی نہ تھا۔ اس وقت اسٹیشن پر میں بھی موجود تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ان تک پہنچنا ممکن نہ

ہوسکا۔ میں ذاتی طور پر بھی ان کی عنایت و کرم اور توجہ کا شکر گزار ہوں۔ ان کے ہاں جو پختہ یا ڈنر ہوتا تھا اس پر وہ ڈین صاحبان کو باری باری بلاتے تھے، لیکن محکوم ہر موقع پر یاد فرماتے اور علم و فن، شعروادب اور مذہب و سیاست کے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتے تھے بہر حال اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ و ملازمین میں خود اعتمادی اور عزت نفس کا جذبہ پیدا کیا، ان کو یہ سکھایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے تمہاری عزت کریں تو پہلے تم خود اپنی عزت کرنا سیکھو، ان میں فرض شناسی کی خوبدیا کی، یہ واقعہ ہے کہ ان کے عہد میں بڑے سے بڑا فرقہ پرست ہندو بھی یونیورسٹی کی طرف ترجیحی نظر کرتے ہوئے ڈرتا تھا ضلع کے حکام اور پولیس کے افسران ہوشیار اور چوکنا رہتے تھے اور یونیورسٹی تو یونیورسٹی! ان کی وجہ سے شہر کے مسلمان بھی چین کی نیند سوتے تھے۔

ان کی فطرت میں صداقت پسندی اور حق گوئی کا جو جوہر قدرت نے ودیعت رکھا ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد سے اب تک انھوں نے انگریزی کے بلند پایہ اخبارات و رسائل میں بیسیوں مضامین لکھ ڈالے جن میں انھوں نے گورنمنٹ کی مختلف پالیسیوں اور کاموں پر اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایوان پارلیمنٹ کے دروہام بھی گونج اٹھے۔ مسلمانوں نے ان کو اپنا لیڈر بنانا چاہا۔ مختلف جماعتوں نے ان پر ڈورے ڈالے اور ہر ایک نے ان کو اپنانے کی سعی کی۔ لیکن انھوں نے مسلم پرسنل لا اور بعض چیزیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا جذباتی تعلق ہے ان کی نسبت اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر کے انھیں مایوس کر دیا اور وہ ان کھنڈازوں سے یہ کہتے ہوئے ترت نکل گئے:

بروڈ این دام بر مرغ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ!



## لیبیا میں سرقہ و حرابہ کے حدود

(۲)

از مولانا حبیب رحمان ندوی لکچرار اسلامی انسٹی ٹیوٹ، البیضا (لیبیا)

دفعہ ۱۳

مکرم جرم کرنے والے مجرم کی توبہ سے متعلق تحقیقی کارروائیاں۔

۱۔ دوبارہ جرم کرنے والے مجرم کو سابقہ دفعہ کے بند نمبر کی روشنی میں تین سال جیل میں رہنے سے قبل رہا نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ مجرم کو اس بات کا حق ہے کہ یہ مدت (تین سال) گزر جانے کے بعد نیا بہ عامہ (پبلک پراسیکیوٹ) کے پاس درخواست پیش کرے جس میں سرقہ یا حرابہ سے توبہ کا اعلان ہو، پھر نیا بہ عامہ اس بات کی تحقیق کرے اور جیل میں اس کے چال چلن کے بارے میں متعلقہ لوگوں سے پوچھ تاچھ کرے، اور یہ بھی کہ کیا اس کو رہا کرنے سے اصلاح کی امید ہے یا نہیں؟ (ان تحقیقات و استفسارات کے بعد) پبلک پراسیکیوٹر اپنی تحقیقات کے اوراق اپنی رائے کے ساتھ اس عدالت میں پیش کرے

۱۔ دراصل توبہ خدا اور بندہ کے درمیان ہوتی ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے گناہ سے نفرت ہو جاتی ہے اور گناہ نگار گناہ سے باز رہنے کا عہد کرتا ہے، لیکن قانونی طور پر اس کی تحقیق اور یقین ضروری ہے اور شریعت کے اصولوں اور مصلحت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصود سوسائٹی اور فرد کی اصلاح ہے۔

جہاں سے مجرم کی سزا کا فیصلہ صادر ہوا تھا۔

۳۔ عدالت مجرم کو سزا کرنے کا فیصلہ صادر کرے گی اگر اس کے نزدیک مجرم کی توبہ ثابت (محقق) ہوگئی، عدالت کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ جیل سے رہائی کے بعد کچھ مدت کے لئے اس کی نگرانی کی شرط بھی لگا دے، مراقبہ (نگرانی) کی یہ مدت اس باقی مدت سے زیادہ نہیں ہوگی جتنی جیل کا فیصلہ عدالت نے مجرم کے حق میں پہلے صادر کیا تھا، (عدالت مجرم سے باز رکھنے کیلئے) دوسری حفاظتی تدابیر کا حکم بھی دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ حریت (انسانی آزادی) کو مقید نہ کرتی ہوں۔

۴۔ اگر عدالت نے (توبہ کی) درخواست نامنظور کر دی تو نامنظوری کی تاریخ سے (پہلے) ایک سال تک دوبارہ (مجرم) درخواست پیش نہیں کر سکتا۔

۵۔ عدالت سے صادر شدہ فیصلہ جو مجرم کی توبہ قبول کرنے کے بعد اس کو رہا کرنے کے لئے اس کے حق میں ہو یا (اس کے خلاف) توبہ کی درخواست کو نامنظور کرنے کی شکل میں ہو، (دونوں صورتوں میں) اس فیصلہ پر طعن (اعتراض یا اس کی اپیل) کسی بھی اپیل کے (رائج) طریقوں کی رو سے جائز نہ ہوگی، (یعنی عدالت کا فیصلہ اس باب میں آخری ہوگا اور کسی دوسری عدالت میں اس کے خلاف اپیل دائر نہ ہو سکے گی)۔

دفعہ ۱۵

حد والے جرم مدت گزرنے سے ساقط ہو جائیں گے۔

۱۵۔ ایسی مقنن نے مدت گزرنے سے حد ساقط ہو جانے کا نظریہ فقہ حنفی سے اخذ کیا ہے، کیونکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مدت گزر جانے کی وجہ سے گواہی میں شک پڑ جاتا ہے، اور یہ شک حد کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے لیکن مال کا ضمان ہوگا، وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جب کسی چور کو چوری کرتے دیکھتا ہے تو اس پر دو حالتوں میں سے کسی میں ایک حالت پر عمل کرنا درست ہے، ایک توبہ کہ ”من ستر مسلماً ستره اللہ“ (بقیہ ماشیہ اگلے صفحہ پر)



یہ دونوں جرم جن پر اس قانون کی رو سے حد واجب ہوگی، یہ حد ساقط ہو جائے گی جس دن جرم کیا گیا اس سے پورے دس سال گزر جانے کے بعد، اور یہ اس صورت میں کہ مجرم خود اعتراف جرم نہ

(بقیہ ماشیہ منقذہ گذشتہ) کے پیش نظر وہ اس کی اطلاع نہ کرے اس حالت میں بھی وہ گناہگار نہیں، دوسری یہ کہ چوری کی کثرت ہو جانے، یا چوری سے نفرت ہونے یا سوسائٹی کو برائیوں سے پاک کرنے کی غرض سے فوراً اس کی اطلاع کرے اور اپنی گواہی دے، اس صورت میں بھی وہ گناہگار نہیں اور ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اس نے اختیار کر لی گویا وہ اپنے واجب سے سبکدوش ہو گیا، لیکن اس وقت تو چور کی چوری کو چھپایا اور اطلاع اور گواہی نہ دی لیکن مدت گزر جانے کے بعد اس کی اطلاع دی تو یہ شک واقع ہوتا ہے کہ گواہ نے اب یہ عمل نہ اس شخص کے فائدہ کے لئے کیا ہے جس کی چوری ہوئی اور نہ جب مجرم کے مترکی غرض سے چھپایا تھا، اور اب کسی عقد و حسد، مخالفت یا عداوت کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ گواہی دے رہا ہے حالانکہ اگر اس کو چوری کا خاتمہ یا سوسائٹی کی اصلاح مقصود ہوتی تو اس وقت اطلاع دیتا، الغرض اس طرح گواہی میں شبہ پڑتا ہے، اور حدود چھوٹے سے چھوٹے شبہ سے بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا مقنن نے مدت کی تحدید امام ابوحنیفہ کے اس قول سے کی ہے کہ قاضی کو ہر زمانہ اور ہر جگہ عرف و حالات کے مطابق یہ مدت مقرر کرنے کا حق ہے۔ فقہ حنفی میں شرح نفع القدر کے بیان کے مطابق امام محمد کا قول ایک ماہ کا ہو اور لکھا ہے کہ ایک روایت امام ابوحنیفہ و ابو یوسف سے بھی یہ ہے اور لکھا ہے کہ ”وہو الاصح“ امام محمد نے الجامع الصغیر میں مدت چھ ماہ رکھی ہے اور یہ بھی اقرب الی الصحیح اور معقول ہے، عصورِ اولیٰ میں اسلامی نظامِ قضا میں وہ سستی اور طول اور تعویقات نہیں تھیں جو یورپ سے آئے ہوئے نظامِ عدالت میں ہیں جن کی رو سے ایک ایک دعویٰ ساہا سال تک عدالتوں کے چکر کاٹتا رہتا ہے اس لیے اب یہ چھ ماہ کی مدت بھی کافی نہیں اس لئے مجتہد اور مقنن کو مدت کے تعین کا حق ضرور ہے جیسا کہ امام اعظم کے قول میں موجود ہے کیونکہ پولیس، پبلک پراسیکیوٹر، جج، عدالتیں، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ کا طویل طریقہ موجود ہے لیکن گواہی اور گواہوں سے متعلق احکامات کی (بقیہ ماشیہ منقذہ)

کرے، اور یہ مدت پوری ہوگی ان احکام کے مطابق جو (یہی) قانون عقوبات میں مقرر ہیں۔

دفعہ ۱۶

حدود کی سزائیں مدت گزر جانے سے ساقط ہو جائیں گی۔

۱۔ وہ حدود جو اس قانون میں بیان کی گئیں ساقط ہو جائیں گی بیس سال گزر جانے سے لیکن صرف قتل کی سزائیں سال بعد ساقط ہوگی، اور یہ سب اس صورت میں جب کہ (عدالت) کا صادر شدہ فیصلہ مجرم کے اقرار و اعتراف سے نہ ہو (مطلب یہ ہوا کہ مجرم کے اقرار سے ثابت شدہ حد ساقط نہ ہوگی)۔

۲۔ حد ساقط ہونے کی مدت (عدالت کے) آخری فیصلے کے بعد سے شروع ہوگی۔

۳۔ ہر وہ مانع جو (حد) کو نافذ کرنے کی راہ میں مانع ہو گیا ہو وہ مدت میں محسوب نہ ہوگا۔

دفعہ ۱۷

عقوبات حدود کی قطعیت اور لزوم۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عقل اور واقعاتی دلیل کی رو سے مدت بہت زیادہ نہ ہونی چاہئے۔

۱۔ ان کا ترجمہ بھی بعد میں پیش کروں گا۔

۲۔ اعتراف کی صورت میں حد مدت گزرنے سے ساقط نہ ہوگی، یہ جمہور فقہاء امت کا

قول ہے۔

۳۔ یہ تین صورتیں ہیں، پولیس یا عدالت تک کیس ہی نہ پہنچا، تو جرم دس سال میں ختم

ہو جائے گا، فیصلہ صادر ہوا مجرم کی عدم موجودگی میں یا مجرم فیصلے کے بعد بھاگ

گیا تو قتل کے سوا سزا بیس سال میں ختم ہو جائے گی، تیسری شکل یہ کہ

بیماری وغیرہ جیسے کسی مانع کی رو سے سزا میں تاخیر ہوئی تو تاخیر کی یہ مدت

محسوب نہ ہوگی۔



اس قانون میں مخصوص حدود کی سزاؤں کو نافذ کرنے سے روکنے یا ان کو بدلنے یا ان میں کمی کرنے اور معاف کرنے کا فیصلہ (کسی کی طرف سے بھی) جائز نہیں ہے۔

دفعہ ۱۸

فیصلہ کو عدالت عالیہ میں پیش کرنا۔

احکام جنائیہ میں مقرر اپیل کے طریقوں اور قاعدوں میں استثنائے کے ساتھ۔

۱۔ اگر مجرم کی موجودگی میں حد کا فیصلہ صادر ہوا ہے، ان دونوں جرموں میں سے کسی ایک پر جو اس قانون کی دفعہ نمبر ۱۴ میں بیان ہوئے ہیں، تو عدالت عالیہ کے سامنے اس کیس کے تمام اوراق فیصلہ کے چالیس دن کے اندر پیش کرنے ضروری ہیں، اور عدالت مجرم کے لئے وکیل کا بند و بست بھی کرے اگر اس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور پبلک پراسیکیوٹر اپنی رائے اور رپورٹ کیس پیش کرنے کے بعد پندرہ دن کے اندر پیش کرے، اور مجرم کے وکیل کو اس کے پندرہ دن بعد اپنا دفاع پیش کرنا ہوگا۔

۲۔ عدالت عالیہ اس قضیہ میں قانونی اور موضوعی (قانون کی دیکھ بھال اور اس خصوصی کیس کی مکمل تفصیلی تحقیق کے بعد) فیصلہ کرے گی اور اس کا یہ فیصلہ آخری ہوگا۔

دفعہ ۱۹

حد کی تنفیذ

حد کا حکم اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ عدالت عالیہ اس قضیہ میں فیصلہ

۱۔ یہ مقررہ طریقے بعد میں بیان کروں گا، یہاں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ براہ راست عدالت عالیہ میں اپیل کے کاغذات پیش کرنا ایسی مقنن نے ضروری قرار دیا ہے اگرچہ کہ مجرم اپیل نہ بھی کرے کیونکہ یہ حد کا معاملہ ہے اور عدالت عالیہ کی تصدیق یا فیصلہ کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔

نہ کر دے۔

دفعہ ۲۰

حد کی صورت میں قتل اور جیل کی تنفیذ کی صورت  
قتل اور جیل کی تنفیذ جو اس قانون میں منصوص شدہ ان اصولوں اور طریقوں پر ہوگی جو  
(ایسی قانون میں) موت کی سزا اور جیل سے متعلق نافذ ہیں۔

دفعہ ۲۱

قطع (ہاتھ یا پیر کاٹنے) کی سزا کی تنفیذ۔  
اس قانون کی دفعہ نمبر ۲ و ۵ میں وارد قطع کی سزا اس طرح نافذ کی جائے گی۔  
۱۔ (حد) کی تنفیذ سے پہلے (یعنی جس دن حد نافذ ہونے والی ہو اس کے مقررہ وقت سے  
بالکل متصل) محکوم علیہ کا طبی معاینہ ضروری ہے جو سرکاری ڈاکٹر کے گاتاکہ وہ یہ رپورٹ پیش  
کے کہ تنفیذ حکم کی وجہ سے کوئی خطرناک صورت تو پیش نہیں آسکتی، کسی بیماری کی وجہ سے،  
یا حاملہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، اور اگر ڈاکٹر کی رائے یہ ہو کہ تنفیذ حکم میں  
تاخیر ہو تو اسے تاخیر کی مدت کا تعین کرنا ضروری ہوگا۔  
۲۔ قطع کا حکم جیل کے ہاسپٹل یا عمومی ہاسپٹل (کسی بھی سرکاری حکومت کے ہاسپٹل میں) نافذ  
اسپیشلسٹ ڈاکٹر (سرجن) کے ذریعہ اور آپریشن کے طریقے پر، اور ان مناسب طبی طریقوں (سہولتوں)  
کے استعمال کے ساتھ جس میں محکوم علیہ کو بے حس (ANAESTHETISING) کرنا بھی شامل ہے۔<sup>۳</sup>

۱۔ ان طریقوں کو بھی تفصیلی بحث میں پیش کر دیا گیا۔  
۲۔ یہ احتیاط شریعت مظہرہ کے اصولوں اور مصلحت عامہ کے تمام عقلی و فطری تقاضوں کی رو سے انتہائی  
ضروری اور معقول ہے۔

۳۔ مقنن نے یہ سہولتیں اس لیے رکھی ہیں کہ حد کا مقصود برائی سے روکنا، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)



۳۔ ہاتھ دستہ (گٹے، پہنچے) پر سے کاٹا جائے گا، جہاں ہاتھ کا جوڑ ہوتا ہے، اور پیر  
مفضل (ٹخنے) پر سے۔

۴۔ مقطوع شخص طبی نگرانی میں اس وقت تک رہے گا جو مدت وہ سرجن متعین کرے جس نے  
آپریشن کیا ہے یہ نگرانی ہسپتال میں یا اس کے باہر دونوں جگہ ہوگی، اس کے لئے تمام احتیاطی  
تدابیر کی جائیں گی، اور ضروری علاج فراہم کیا جائے گا کہ دوسری محتمل تکلیفیں یا نقصانات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور ڈرانا ہے، ہلاک کرنا یا تلف کرنا نہیں ہے، المعنی لابن قدامہ میں لکھا ہے کہ حد آسان  
اور سہل ترین طریقے پر نافذ ہوگی، یہ سہولت اور آسانی شرعی طور پر بالکل صحیح ہے یقیناً  
لے ہسپتال میں حد کا نفاذ رکھا ہے، اس بات کی تصریح قانون یا یادداشت  
میں مجھے نہیں ملی کہ کیا عوام الناس اس پر قیام حد کو دیکھیں گے یا نہیں، چاہے  
وہ ہسپتال ہی میں کیوں نہ جمع ہوں، کیونکہ قیام حد جس طرح مجرم کو دوبارہ اس فعل  
مشیع سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے اسی طرح وہ پوری سوسائٹی اور عوام الناس کو  
بھی بُرائی سے روکنے اور باز رکھنے کا فطری طریقہ ہے اور محض قطع کی خبر اخبار میں  
پڑھنے یا ریڈیو پر سننے سے شاید وہ تاثر اور چوری سے خوف، نفرت اور نفسیاتی انفعال  
نہ ہو جو بذات خود اس کا مشاہدہ کرنے سے ہو، لیکن بہت ممکن ہے کہ عصر حاضر میں ٹیلی ویژن  
مادی اصلاحی فلمیں اور سینما اس تاثر، انفعال اور خوف و زجر کے جذبات پیدا کرنے میں مدد کرے  
اور اس طرح شریعت کا منشا پورا ہو۔

۱۔ یہ تقریباً ہور نقہائے اہل سنت کی رائے ہے۔ ابو ثور اور امام احمد کا ایک قول قرطبی نے  
نقل کیا ہے کہ پیراس طرح کاٹا جائے گا کہ اٹری کا حصہ بچ جائے، مزید تفصیل سرقہ و حرابہ کی مفصل  
بحث میں کروں گا۔

پیش نہ آجائیں۔

۱۔ یہ تمام احتیاطی تدبیریں ضروری اور شرعی ہیں، حضور النور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود ہے ”فاقطعوا  
واحسمو“ جسم کے معنی یہ ہیں کہ خون بہنے والی رگوں کو گرم نہ رہے سے داغا جائے یا السنن لابن قدامہ میں ہے  
کہ گرم تیل میں ڈالا جائے تاکہ خون نہ بہے، امام شافعی اور احمد کے نزدیک جسم کو ناستحب ہے لیکن امام  
ابو حنیفہ کے نزدیک واجب ہے اور اس کی دلیل اور ضرورت فقہ حنفی کی کتابوں میں اس طرح درج ہے کہ  
”اگر جسم نہ کیا جائے گا تو ہلاکت اور تلف کی نوبت آجائے گی اور حد ناجز ہوتی ہے نہ کہ تلف“، اس قول  
اور دلیل کی رد سے احتیاطی تدبیر نہ صرف یہ کہ مستحسن ہیں بلکہ واجب ہیں تاکہ مزید نقصان، امراض یا  
سوت واقع نہ ہو جائے، ایسی مقنن نے اس انسانی اور شرعی حکمت کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا ہے۔  
اولیٰ میں خون روکنے اور نقصانات سے بچانے کا بہترین طریقہ وہی رائج تھا جو اد پر بیان کیا گیا،  
روح شریعت، مصلحت شریعت اور تقاضائے شریعت یہی ہے کہ ہر عمر میں بہترین اور ماڈرن  
احتیاطی طریقے استعمال کیے جائیں، اس لئے ڈاکٹر، سرجن، ہاسپٹل، دوائیں اور نگرانی سب شرعی  
حیثیت سے نہ صرف یہ کہ مستحسن اور مستحب ہیں بلکہ ضروری اور واجب ہیں، لیسیا میں علاج مفت ہر  
اور ہر باشندہ کو مفت علاج کی سہولتیں مہیا ہیں، جن ملکوں میں یہ سہولتیں عوام کے لئے مفت نہ بھی ہوں،  
ہاں بھی ان طبی احتیاطوں اور دوائیوں کی قیمت حکومت ہی پر ہونی چاہئے، خدا بھلا کرے ائمہ فقہ کا  
جزئیات تک پر بحث کر چکے ہیں، جسم کرنے کے سلسلے میں داغنے یا تیل وغیرہ کی قیمت کون ادا کرے  
گا؟ احناف کے نزدیک اس کی قیمت چودا کرے گا کیونکہ مجرم وہ ہے، اور امام شافعی و احمد کا  
قول یہ ہے کہ بیت المال اور حکومت ادا کرے گی، حالانکہ جسم ان کے نزدیک واجب نہیں صرف  
مستحسن ہے اور احناف کے نزدیک واجب ہے، دونوں اقل اپنے مخصوص زاویہ نظر اور تفکر  
کی وجہ سے صحیح ہیں، لیکن دوسرا قول فطری اور انسانی جذبات کی روشنی میں اسے ہے۔

طبی سہولتوں کا تذکرہ یہاں آگیا اس لیے راقم ایک اجتہادی مسئلہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)



### قطع سے متعلق خاص احکام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مختصر طور پر فقہاء و مہدیین امت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے، وہ مسئلہ یہ کہ یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہے؟ اور اس کا کیا کیا جائے؟ کیا یہ حکومت کی ملکیت ہے کہ اس کو بازار یا مسجد کے دروازہ پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو؟ یا دفن کر دیا جائے کہ جسم انسانی کی حرمت کا تقاضہ پیدا ہو؟ یا یہ مقطوع کی گردن میں ڈال دیا جائے کہ حاضرین جو قطع کے مشاہدہ کے بعد تاثر اور انفعال کی کیفیت سے بر نیز ہو چکے ہوں وہ اس مقطوع ہاتھ کو اس کی گردن میں لٹکا ہوا دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں؟ اور یہ ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہو؟

مالکی مفسر ابو عبد اللہ القرطبی لکھتے ہیں: "وعلق ید السارق فی عنقه، قال عبد اللہ بن محیرز سألت فضالہ عن تعلیق ید السارق فی عنقه، امن السنة هو؟ فقال، حیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسارق فقطعت یدہ ثم امر بہا فعلق فی عنقه، اخرجہ الترمذی وابدو اؤد النسائی" (تفسیر القرطبی ۶-۱۲) امام شافعی اور احمد کے نزدیک بھی یہ سنت ہے، اس کی طرف اشارہ اور احناف کا مسلک ابن ہمام اس طرح واضح کرتے ہیں: "ولیس تعلیق یدہ فی عنقه لاند علیہ السلام امر بہ وراہ ابو داؤد وابن ماجہ، وعندنا ذلک مطلق للامام ان ساء ولم یثبت عنہ علیہ الصلاۃ والسلام فی کل من قطعہ لیکون سنۃ" (شرح فتح القدیر ۴-۲۸۴) اس اختلاف فقہی کا حاصل یا نتیجہ یہ نکلا کہ احناف کے نزدیک قطع سے زجر مکمل ہو گیا، اب مزید زجر گردن میں ہاتھ لٹکانے سے واجب یا سنت مؤکدہ نہیں، دوسری بات یہ کہ اگر امام چاہے تو مزید زجر کے لیے گردن میں ہاتھ حدیث کی رو سے لٹکاتا ہے لیکن دونوں صورتوں میں عکس کو بھی مان لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے قطع یا دار اس کو گردن میں حائل کر دینے کے بعد اب کسی زجر کی ضرورت ہے نہ حکمت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اگرچہ کہ وہ مشلول ہی کیوں نہ ہو، یا انگوٹھا کاٹا ہوا ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اب سوال طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کسی بھی صورت سے زجر مکمل ہو جانے کے بعد یہ مقطوع ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا۔

عصوام اولیٰ میں اس ملکیت اور عدم ملکیت سے نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی۔ نفس کی موجودگی میں اور شریعت کی روح کے خلاف اجتہاد ناجائز بھی ہے، لیکن روح شریعت کے موافق اجتہاد اور تفکیر نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مستحسن اور بعض اوقات ضروری ہے۔ حد کے متعلق یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ وہ گناہ سے باز رکھنے اور تادیب و تخویف اور زجر کے لئے رکھی گئی ہے، چور کی تادیب اس طرح ہوگئی کہ اس کا ہاتھ کٹ گیا، اور عوام الناس کے لئے تخویف و تاثر کا باعث یہ ہو گیا کہ انہوں نے اس کے قطع کا اندوہناک اور اثر انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اس کا ہاتھ خدا کی حد کو توڑنے اور عصیاں کی وجہ سے اس کی گردن میں پڑا ہوا بھی انہیں نظر آ گیا اور اس کا دعویٰ سے کھل طور پر شریعت کا مقصد پورا ہو گیا۔

علم طب کی روز افزوں ترقیاں اور آپریشن کے جدید طریقوں میں بحیر العقول — لیکن بحیر القلوب نہیں — بلکہ مقلب القلوب تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اور ”سنز عجم آیاتنا فی الافاق و فی الفہم حق یتبین لہم انہ الحق“ (فصلت ۵۳) کی قرآنی صداقت سائنس اور طب کی تجلیوں میں نمودار ہونے کے لئے بے قرار ہے، اور اسلام علم کے سارے فوائد اور سائنس و طب کی تمام مہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں مسلمانوں کے لئے کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے اصولوں اور شریعت کی روح کے مخالف اور منافی نہ ہوں۔

اس صورت حال کے پیش نظر ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی کی بیان کردہ اس حدیث اور مسئلہ پر نظر ڈالیں جو را قم نے فتح القدیر اور قرطبی سے نقل کیا ہے، اور اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ مقطوع ہاتھ اس شخص کی ملکیت ہے جس کے جسم سے وہ کاٹا گیا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ)



یا انگلیاں کٹی ہوئی ہوں، اگر شلل کی وجہ سے اس کے کاٹنے سے ہلاک ہو جانے کا خطرہ نہ ہو۔

۱۔ یہ احناف کا قول ہے۔

(بقیہ ماشیہ صفحہ گذشتہ) تو پھر اس کے لیے طب کی ان سہولتوں اور کم باب سہی لیکن کامیاب تجربوں سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں؟ جن کی رو سے کٹے ہوئے ہاتھ، پیر دوبارہ جوڑے جانے اور سیدھا ہاتھ الٹی جگہ اور الٹا ہاتھ سیدھی جگہ پر جوڑے جانے کے کامیاب تجربے اور قصے جو ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں؟ قطع کے سلسلے کی ساری طبی سہولتیں تو گورنمنٹ کو دینی ضروری ہیں، لیکن اگر یہ طبی آپریشن نفی طور پر جائز ہو تو اس پر خرچ کی جانے والی رقم یا سہولتیں حکومت پر ہرگز ضروری نہیں ہوں گی، بلکہ یہ رقم مجرم کو اپنے پاس سے خرچ کرنی ہوگی یا اس کے اعزہ، اقرباء اور دوست احباب اگر چاہیں تو اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ممکن ہے کہ اس طرح مجرم اور سوسائٹی دونوں میں جرم سے اجتناب اور خوف کم ہو جائے گا، اور اس طرح شریعت کی حکمت پوری نہیں ہو سکے گی، یعنی حد ناجز نہ رہ جائے گی لیکن راقم کے نزدیک یہ محض ایک فرضی اعتراض ہوگا، کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ شریعت کی پہلی حکمت یعنی مجرم کو سزا دہ تو پوری ہوگئی، دوسری حکمت یعنی سوسائٹی اس سے سبق سیکھے وہ بھی پوری ہوگئی، تیسری بات یہ کہ یہ آپریشن تو ابھی کامیاب ہے اور تجربہ کی دنیا میں ہے اور بہت مخصوص ملکوں میں ہے، لیکن کوئی سا بھی معمولی سے معمولی آپریشن سو فیصد کامیاب ہونے کی گارنٹی اپنے اندر نہیں رکھتا، اور یہ کہنا کہ اس طرح چوبار بار چوڑی کرے گا اور آپریشن کرا لیا کرے گا، ایک محال مفروضہ ہے، کیونکہ عام انسان ان آپریشنوں تک کو بلا وجہ بلا ضرورت اور بلا خوف نہیں کراتے جن کی کامیابی کا علم تجربہ کی رو سے بار بار ثابت ہوتا رہتا ہے، اور یہ بھی مشاہدہ ہے کہ معمولی سے آپریشن تک میں جان تک جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے، اس لیے چور محض اس آپریشن کی تسلی میں دوبارہ چوری کرنے کی جرأت قلم کے خیال میں ہرگز عام حالات میں نہیں کر سکتا، اور یوں تو پھر ایک ہاتھ ضائع ہو جانے کے بعد بھی دوبارہ

(بقیہ ماشیہ صفحہ ۳۳۷)

## ۲۔ چور کا ہاتھ حسب ذیل صورتوں میں نہ کٹے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چوری کرنے والے اور دوبارہ ان پر قطع کے عذاب ہونے والے ہزاروں ہزار میں ایک دو مل ہی سکتے ہیں اور میرے خیال میں نہ کوئی دوسرا سوائے کا وہ شخص جو چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس سہولت کی وجہ سے چوری کا ارادہ کرے گا کیونکہ اس سہولت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی جسے چوری کرنی ہوتی ہے وہ قطع پر عیسٰی سخت سزا کی موجودگی میں بھی یہ کام کرتا ہے، اور نہ کوئی صالح شخص اس آپریشن کی سہولت چاہتا ہونے کے بعد خوشی اور بلا خوف یہ کام شروع کر دے گا، علاوہ فطرت بشری کے اصولوں کے بھی یہ بات قابل غور ہے کہ یہ آپریشن نہ ہر صورت میں کامیاب ہو سکتا، نہ ہر ملک میں ہو سکتا، اور اس پر ہزاروں کے مصارف ہو سکتے ہیں، کسی بھی چور کے لئے سو فیصد کامیابی کا یقین کیسے ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہزاروں روپیہ برباد کرنے کے بعد بھی مشتبہ و مشکوک، خطرناک اور غیر یقینی کامیابی کا سہارا لے کر کوئی شخص بہ ہوش و حواس چوری کا ارادہ کر سکتا ہے؟ ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ناقلوا“ کی نص میں قطع کا حکم دیا گیا ہے یہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس ظاہر نص کی روشنی میں ہمیشہ فقہاء نے حدیث و اقوال صحابہ کی مدد سے احکام کے استنباط کیے ہیں، اس کے علاوہ یہ بات صحیح ہے کہ نص میں قطع کا قطعی حکم ہے اور اس کی قطعیت سے انکار لغو باللہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اور عالم کے حکم سے جب قطع ہو گیا تو اس حکم کا منشاء پورا ہو گیا، ایک وقیع اشکال راقم کے نزدیک یہ ضرور ہے کہ اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ چور ہمیشہ اپنے ہاتھ سے محروم رہے تاکہ یہ اس کے لیے نکال اور عبت ہو اور جو شخص اس کو دیکھے اس کے لئے بھی چوری سے باز رہنے کا ذریعہ ہو، اگر ایسا ہو تو پھر یہ آپریشن صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن آیت قرآنی قطع کو بدلہ بتاتی ہے ”جزاء بما کسبوا، نکالاً من اللہ“ اور نکال کے معنی ترقی یہ لکھتے ہیں۔ نکلت باثنا نعلت به ما یوجب ان یکل به عن ذلک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)



(الف) اگر اس کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا ہے، یا مشلول ہے، یا انگوٹھا کٹا ہوا ہے، یا اگر انگوٹھا

القیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

(الفعل) (۶-۱۲) ایسا فعل کرنا جس سے اس فعل سے باز رہے، اور یقیناً قطع ید ایسی سخت سزا ہے جو بیک وقت جزا اور مکمل کام دیتی ہے، آیت کے آخر میں ہے ”من تاب من بعد ظلمه واصبح فان الله يتوب عليه“ تابعی عطاء اور امام شافعی کے ایک قول میں توبہ قطع تک کو ساقط کر دیتی ہے تو کیا، جزا، نکال اور توبہ و اصلاح کے بعد یہ آپریشن .....  
.....: صحیح نہیں ہو سکتا؛ بہر حال اگر قطع کی حکمت یہ ہو کہ تاحیات چھ پر حد کا اثر باقی رہے تو پھر اس مسئلہ پر بحث ہی نہیں کی جاسکتی، لیکن راقم کے سامنے یہ نظیر ہے کہ عام حدود کے زاجر ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تاحیات ان کا اثر باقی رہے، زنا چوری سے زیادہ فحش کام ہے، اس کی حد کوڑے لگانا ہیں جن کا کوئی اثر تاحیات باقی نہیں رہتا، اگر تاحیات حد کا اثر باقی رکھنا ہی حد کی حکمت ہوتی تو پھر اس جرم میں عضو تناسل، خصیتین، یا اگر اس سے تناسل و تولید کی حکمت ختم ہونے کا خطرہ ہوتا تو کسی اور ایسے ظاہر عضو کو کٹوا دیا جاتا جس کو دیکھ کر دوسروں کو تاحیات عبرت حاصل ہوتی رہتی! شراب ام الخبائث ہے اس کی حد بھی کوڑے ہیں جن کا اثر تاحیات کچھ بھی باقی نہیں رہتا، اور کسی کے لئے بھی اس سے تاحیات عبرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حدود اسلامیہ کے عبرت آموز اور اثر انگیز ہونے کے لئے ان کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے، اور ان کا نفاذ مسلمانوں کے مجمع میں ایک بار اس کی پوری ضمانت ہوتا ہے کہ ان کا اثر دلوں میں جاگزیں ہو گیا ہے۔

بہر حال راقم نہ تو اس مسئلہ کو جائز کرنے ہی کے درپے ہے، اور نہ اس سلسلے میں کوئی فتویٰ دینا چاہتا ہے کہ یہ مجھ جیسے ناقص علم و تجربہ والے کا کام نہیں، اور نہ کسی ایک عالم کے لکھنے سے اس مسئلہ میں ولقیہ حاشیہ الاصول

کٹا ہوا نہ ہو تو (کوئی سی بھی) دو انگلیاں کٹی ہوئی ہوں۔

(ب) اگر اس کا دایاں پیر کٹا ہوا ہے، یا مشلول ہے یا اس میں ایسا لنگ ہے جس کی وجہ سے اس پر چلا نہیں جاسکتا۔

(ج) اگر اس کا دایاں ہاتھ چوری کے بعد کسی بھی حادثہ کی وجہ سے جاتا رہا ہو رکٹ گیا یا ٹوٹ گیا ہو۔

۳۔ (مذکورہ بالا صورتوں میں کسی بھی وجہ سے) اگر قلعہ نہ ہو سکے تو مجرم کو سزا تعزیر کے طور پر قانون عقوبات (لیبلیم) کے ماتحت دی جائے گی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ،

کوئی قول فیصل ہو سکتا، بلکہ یہ علمائے امت کی اکثریت کی رائے اور اجتہاد کی روشنی میں معرض بحث میں آسکتا ہے، راقم مسئلہ صرف اسی لئے درج کر رہا ہے کہ مشاہیر اہل علم و فضل جن میں اجتہاد کی اہمیت اور شرعی شرطیں پائی جاتی ہوں وہ مسئلے کو واضح کریں۔

۱۔ یہ بھی احناف کا قول ہے کہ اس طرح منفعت ختم ہو جائے گی، ہاتھوں سے پکڑنے کی صحت جاتی رہے گی۔

۲۔ یہ بھی احناف ہی کا قول ہے کہ اس طرح پیر سے چلنے کی منفعت ختم ہو جائے گی کہ جسم کی ایک شق یعنی ایک جانب سے ہاتھ اور پیر کا ٹخنے سے چلنا دو بھر ہو جائے گا اور شریعت کی یہ حکمت مدح راہ میں ظاہر ہوتی ہے جہاں قلعہ میں اختلاف کا حکم دیا گیا ہے یعنی دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔

۳۔ قانون عقوبات میں وارد سزاؤں کا ترجمہ تفصیل مضمون میں کدوں کا۔



دفعہ ۲۳ -

جزئیات میں رجوع کہاں کیا جائے ؟  
 امام مالکؒ کے مذہب میں مشہور قول کی تطبیق کی جائے ان چیزوں میں جن کے متعلق نص  
 (حکم) اس قانون میں وارد نہیں ہوئی ہے، سرقہ اور حزابہ کے سلسلے میں جن پر حد واجب ہوگی، اور اگر  
 مشہور (مذہب) میں نص نہ پائی جائے تو قانون عقوبات (لیبیہ) کی تطبیق کی جائے (۱)۔  
 اور (حد کے) جاری کرنے کے طریقوں کے بارے میں اس قانون میں جہاں نص نہ ہو وہاں  
 قانون اجانات جنابہ (لیبیہ) کی تطبیق کی جائے (۲)  
 اس قانون کے احکام قانون عقوبات یا کسی دوسرے قانون کے احکام کو لغو نہیں کرتے، ان چیزوں  
 کو چھوڑ کر جن کے بارے میں اس قانون میں نص موجود ہے۔

دفعہ ۲۴ -

تمام وزیروں کو چاہیے کہ اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اس قانون کی تنفیذ کریں، اور اس  
 قانون پر عمل کیا جائے سرکاری گزٹ میں چھپنے کے تیس دن بعد سے۔ (۳)

انقلابی کونسل

عبدالسلام احمد جلود، وزیر اعظم

محمد علی الجدی

۴ رمضان ۱۳۹۲ھ

وزیر انصاف

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء

(۱) راقم تفصیلی مضمون "سرقہ و حزابہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں" کے اندر دونوں جرموں کی جزوی تفصیلات

و مسائل مذاہب اربعہ و اقوال علمائے امت بیان کرے گا۔

(۲) اس کی تفصیل بھی بعد کو بیان کی جائے گی۔

(۳) یہ قانون سرکاری گزٹ میں ۱۸ ذوالقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۷۲ء کو وزیر عدلیہ (انصاف)

راقم ملاحظہ فرمائیے

کے حکم سے شماره ۶۰ سال نمبر ۱ میں نشر کیا گیا ہے، تو منجی یادداشت بھی اسی شماره میں نشر کی گئی ہے۔ جس کا ترجمہ راقم عنقریب پیش کرے گا۔ اس طرح اس قانون کا اجراء الحمد للہ ثلث المحدثہ لیبیا کی اسلامی سرزمین میں ۱۸ فروردیہ ۱۳۹۲ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۷۳ء سے ہو گیا ہے۔ راقم کی اطلاع کے مطابق تا دم تحریر دیکم اپریل ۱۹۷۳ء ابھی تک کسی کے ہاتھ کٹنے کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ تین چوری کی وارداتیں پبلک پراسیکیوٹر کے پاس آئی ہیں، جن میں تحقیق جاری ہے کہ کیا ان میں حد کی شرط پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر شرطیں نہ پائی گئیں تو تعزیری طور پر دوسری سزائیں ملیں گی، اور اگر شرطیں منطبق ہوتیں تو کیس عدالت میں پیش کئے جائیں گے، اور آخری فیصلے کے بعد اجراء ممکن ہوگا۔

جیسا کہ مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں کہ لیبیا میں چوری کی وارداتیں دوسرے ملکوں کے بالمقابل بہت ہی کم ہیں، لیکن گزشتہ چند سالوں سے کچھ بڑھ رہی تھیں، انشاء اللہ قانون شریعت کے اجراء اور حدود کے اجراء بلکہ اعلان ہی کے بعد بہت جلد یہ کم واقعات بھی معدوم ہو جائیں گے اور ایک حد کا قیام چالیس دن کی بارش اور اس سے جو خیر و برکت نازل ہوتی ہے اس سے بہتر ہے (تفسیر قرطبی ۱۲-۱۶) کا مفہوم قلب مومن تو ہمیشہ سے سمجھتا ہے اور مانتا ہے، لیکن عام انسانوں اور مالی قانون جنایات کے ماہرین کی عقل و نظر بھی اس کی حقانیت کی محفوظ ہو جائے گی، اور پھر جب کامل اسلامی نظام و قانون کی عکاسی سارے اسلامی ملکوں میں زبان اور عمل سے شروع ہو جائے گی، کتاب و سنت کی پیروی مقصد حیات بن جائے گی اور خدا کی توحید اور رسولؐ کی محبت رگ جان میں پیوست ہو جائے گی تو پھر فرحت و انبساط ہر خطہ میں نظر آئے گا۔ انسانی آبادی کو پُر امن زندگی گزارنے کی کھوئی ہوئی سعادت پھر واپس مل جائے گی اور چوری، سینہ زوری اور تمام اخلاقی گراؤوں، اقتصادی پریشانیوں اور نفسیاتی آفتوں سے وہ محفوظ ہو جائے گی۔ اُمت اسلامیہ کو قوت، عظمت اور نصرت سب دوبارہ واپس مل جائے گی، اور خدا کی زمین فخر شریعت سے معمور ہو کر قلوب انسانی فحشیات کا طور بنائیگی۔ "یوم تنزی المؤمنین والمؤمنات یسعی نورا ہم جلیں ایما یمکم وبایما تم یمکم" (سورہ نور ۲۴:۳۱) اس دن تم مومنین اور مومنات کو دیکھو گے کان کا نور ان کے آگے ادا ہے جسے طبیب (پچھو) پوچھا، لیکن شاید انہیں اس برحق طاقت کے بھاری یعنی وہ منافقین جو مسلمانوں میں مل کر اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں، جن کے



قول و فعل میں تضاد ہے، جن کے باطن اسلامی شریعت سے بیر رکھتے ہیں، خدا پر اعتقاد نہیں رکھتے، رسول کی اطاعت نہیں کرتے اور قانون الہی کے نفاذ سے پریشان ہوتے ہیں۔ وہ سب اس دن نفسیاتی کشمکش کا شکار ہوں گے، آیت قرآنی میں ان سے خطاب یوم قیامت کے سیاق میں کس قدر متاثر کر دینے والے پیرائے میں کیا گیا ہے، اور جس طرح وہ زندگی میں نفاق کرتے تھے اور ظلمت حیات نور مستقیم کے مقابلہ میں انھوں نے اختیار کیا تھا اسی کی مناسبت سے انھیں نور اور رحمت سے محرومی کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ اور آخر میں پھر ایمان کامل کی دعوت، خشوع الہی کی ضرورت اور منزل من اللہ قانون کی پیروی کی اہمیت پر اہل ایمان کو اس طرح ابھارا ہے۔ "یوم یقول المنافقین والمنافقات للذین آمنوا انظرونا نقبیس من لؤکم قبل ارجعوا ذرا رکم فالتسوا النور انضرب بینہم بسورۃ باب باطنہ فیہ الرحمۃ و ظاہرہ من قبۃ العذاب ینادونہم الم نکن معکم قالوا بلی و لکنکم فتنتم انفسکم و تر بستم و ارتبتم الا مانی حتی جاہ امر انشد و غرکم بالشد الغرور، فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ ولا من الذین کفروا ما داکم النار ہی مولکم و بیس المصیر، الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبہم لذكر اللہ و ما نزل من الحق؟ (حدیدہ - ۱۳ - ۱۶) ترجمہ "جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو ہم تمہارے فذ سے (کچھ) اقتباس کر لیں (پل صراط کے اندھیرے میں) ان سے کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹو اور روشنی ڈھونڈو (یعنی دنیا میں واپس جا سکو تو پہلے جاؤ کیونکہ وہ دارالعمل تھی، روشنی وہاں عمل سے جمع کی جا سکتی تھی، یعنی یہ کہ اب روشنی ملنی ممکن نہیں جیسے کہ دنیا میں واپس جانا ممکن نہیں) پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی گئی، جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب، وہ ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے، وہ جواب دیں گے کیوں نہ تھے لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا، اور گھات میں (مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں) لگے رہے تم، اور شک میں پڑے رہے تم، اور (باطل) امیدوں نے تم کو دھوکہ میں رکھا، یہاں تک کہ امر الہی (موت یا عذاب) آ پہنچا اور ہم کیا تم کو اللہ سے غرور (شیطان یا دنیا) نے، سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ کفار سے، تمہارا ٹھکانہ آگ ہے، یہی تمہاری رفیق ہے، اور بُرا انجام ہے یہ، کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آگیا کہ ان کے دل نکال دیں (خفا و یادی) حاصل کریں اور اس سے جو حق (سچا وین یا قرآن) آتا۔

## اجتہادی تحریک

(از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان صاحب)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو توانائی عطا کی ہے اسے مصروف کے لحاظ سے دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک پیداواری اور دوسرا تفریحی۔ لیکن پیداواری اور تفریحی زمروں میں تصرف اوقات کا تناسب دال اور نمک کے متماثل ہے۔ اور جب یہ تناسب ایک فرد کے روزمرہ کے کاموں میں بدلتا ہے تو وہ فرد روز و رات بوجھتا ہے۔ یہی حال پوری قوموں کا ہوتا ہے۔ پیداواری اور تفریحی طریقوں میں ہمیشہ فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔ جب ایک طریقہ پیداوار ایک علاقے کی آبادی کو متمول اور خوشحال نہیں رکھ سکتا ہے تو اس علاقے کے لوگوں کو تفریح کے لئے بہت کم وقت مل پاتا ہے۔ اگر اس علاقے کے لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو کسی نئے ترقی یافتہ طریقہ پیداوار کو اختیار کر کے متمول نہیں رکھ سکتے تو یہ آبادی ضروریات زندگی کے معیار میں کمی کر کے اپنے وجود کو کچھ دنوں کے لئے برقرار رکھ سکتی ہے اگر وہ سابقہ معیار زندگی اختیار کئے رہنے پر مصر رہتی ہے تو جلد برباد ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ انسان فطری طور سے جدت پسند واقع ہوا ہے اس لئے وہ مدت نئے پیداواری طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک انسان اس سرزمین پر بہتر سے بہتر معیار زندگی اختیار کرنے کے باوجود زندہ ہے اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے پچاس سالہ برس پہلے سلطنتِ برطانیہ میں کبھی سونے و زرب



ہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جہالت اور بے روزگاری کا شکار تھا۔ کیونکہ پوری قوم پیداواری اور تفریحی ذروں کا تناسب کھو چکی تھی۔ لیکن آج برطانوی سیاسی اقتدار عملاً اپنی قومی حدود میں سمیت کمرہ گیا ہے وہاں نہ صرف یہ کہ جہالت بھوک اور بیروزگاری کا خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ وہاں کے عام لوگوں کا معیار زندگی بیس پچیس سال پہلے کے مقابلہ میں کافی بہتر ہے۔ اب یہ ملک اس پوزیشن میں ہے کہ ہزاروں لاکھ غیر برطانوی لوگوں کو اپنی معیشت میں کھپا سکے۔ جرمنی اور جاپان کے کارنامے تو اس معاملے میں برطانیہ سے بھی زیادہ نمایاں ہیں۔ ان سب ملکوں کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے پیداوار کے نئے طریقہ ایجاد اختیار کئے ہیں جنہیں عام طور سے جدید مکنالوجی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پرتگال ایک سلطنت ہونے کے باوجود ایک سپانڈہ ملک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے آپ کو عصرِ جدید کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ پرتگیزی لوگ یورپ کی غریب ترین قوم ہیں۔ حالانکہ ان کے قدرتی وسائل ڈنمارک و ہالینڈ وغیرہ کے مقابلے میں لپٹے خاصے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی آبادی یا قوم ضرورت کے ساتھ ساتھ طریقہ پیداوار میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب برقرار رکھتی ہے تو وہ اپنی حاکمانہ حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے حاکمانہ حیثیت کا اظہار سیاسی اقتدار کی شکل میں ہوتا تھا۔ اور اب اس نے اقتصادی اقتدار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ امریکہ، جرمنی اور جاپان کے اقتصادی اقتدار کی عالمگیر نوعیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

تقریباً ہی بات پوری انسانیت کے لئے بحیثیت مجموعی کہی جا سکتی ہے۔ اگر

انسان ضرورت کے مطابق طریقہ پیداواری میں تبدیلی کرتا رہا اور پیداواری و تفریحی اوقات کا تناسب باقی رکھ سکا تو اس زمین پر اس کی حاکمانہ حیثیت یا خلیفہ ارض کی حیثیت برقرار رہے گی۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ اپنے آبا و اجداد کے طریقہ پیداوار پر فخر کرتے ہیں اور محض اس کے احیاء کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں تو ان کا معیار زندگی پست سے پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر وہ عملاً نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ پورا دقت پیداواری ہی میں کیوں نہ صرف کرے۔ لہذا جو بھی کوئی قوم زندہ و خوش حال رہنا چاہتی ہے۔ اسے بدلے ہوئے حالات میں زیادہ ترقی یافتہ پیداواری طریقہ اختیار کرنے چاہئیں۔

ہر طریقہ پیداوار کے ساتھ ایک نیا تفریحی ڈھنگ بھی ایجاد ہوتا ہے۔ جو نئی تہذیب کا ایک جزو ہوتا ہے۔ مگر جب کوئی زوال یافتہ یا رو بہ زوال قوم نئی ترقی یافتہ تہذیب کی طرف راغب ہوتی ہے تو عام طور سے اس کا رجحان پیداواری طریقوں کے بجائے تفریحی طریقوں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ زوال یافتہ قوم کا طریقہ تعلیم ہوتا ہے۔ جو پوری قوم کو قناعت اور سہل روی کی طرف مائل کرتا ہے اور انہیں سختی و جفاکشی کے راستے سے دور رکھتا ہے۔ یہ دنیا کے مقابلے میں عقبی کی بہتری کا غلط تصور دیکر انہیں مقابلہ سے کترانے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ قصہ مختصر کسی زوال پذیر قوم کی تعلیم گاہیں، قتل گاہیں یا اصلاحیتوں کے قبرستان کے مترادف ہوتی ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جب عرب کے نواح میں پھیلی تو ان کو جہاں روم کی مضبوط و منظم فوج کا سامنا پیش آیا۔ وہیں ان کو یونان کے اس فلسفہ کا سامنا کرنا پڑا جس میں الجھ کر لونیالی قوم علی ہونے کے بجائے علمی ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کو محض علمی حیثیت سے حاصل کیا۔ اور اس کو اسلامی رنگ



میں رنگ دیا۔ یہ محض جفاکشی اور علی دینا سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت کا نتیجہ تھا لیکن اس زمانے کا علم کلام آج بھی اسی طرح بیڑھایا جاتا ہے اور اس کو معراج تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں فلسفہ کے میدان میں اس علم کلام کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ حدیث کی تحقیق میں ہمارے قدیم محدثین نے جو جفاکشی کی اس کا عشرِ عشر بھی آج کے علماء میں ناپید ہے۔ فقہانے جو فقہ آج سے ایک ہزار سال پہلے مرتب کی آج کل کے علماء اس کا اعادہ کر دینا ہی کمال سمجھتے ہیں۔ اس کے برخلاف دینی تحقیق کے معاملے میں مغربی علما (مستشرقین) وہی رول ادا کر رہے ہیں جو مسلم متکلمین نے اسلامی عروج کے دور میں کیا تھا۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی نئے زمانے میں قدامت پسندوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا بلکہ اس کے برخلاف مجددین نے ہی ہمیشہ اہم کام انجام دیے۔ مثال کے طور پر خود ہندوستان کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک جدید دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے دو تحریکیں ساتھ ساتھ ابھریں۔ ایک علی گڑھ اور دوسری دیوبند کے نام سے مشہور ہے۔ اول الذکر کا مقصد مجتہد پیدا کرنے تھے اور موخر الذکر کا مقصد اسلاف کی تقلید پر زور دینا تھا۔

زمانے سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے تقلیدی تحریک بڑی حد تک متمول خاندانوں میں پھیل سکی بلکہ محض غریب و نادار خاندانوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے سکی۔ اجتہادی تحریک گھر سے بلند یا یہ مجتہد پیدا نہ کر سکی پھر بھی اس نے ہندوستانی مسلمانوں پر کافی معاشی معاشرتی اور سیاسی اثرات ڈالے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے تقلید کی زنجیر توڑ کر اجتہاد کے لئے زمین ہموار کی۔ اور ہندوستانی مسلمانوں میں مقابلے سے کترانے کے بجائے مقابلے کے لئے للکارنے کی ہمت پیدا کی۔ جو ہمیشہ زندہ قوموں

کا شعار رہا ہے۔ مگر اب علی گڑھ اجتہادی تحریک کا گہوارہ ہونے کے بجائے تقلیدی تحریک کا مرکز ہوتا جا رہا ہے۔ تبلیغی جماعت کے روز افزوں اثرات کی اس کے علاوہ اور کیا توجیہ کی جاسکتی ہے۔ القصہ مختصر ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی موثر اجتہادی تحریک نہ ابھری تو یہ پوری قوم یا تو اپنی موت آپ مر جائے گی یا انگریزوں کی رہی تو اس کا مقام پست ترین زمروں میں رہ جائے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سے جو لوگ دینی اور دنیاوی امور پر یکساں گہری نظر رکھتے ہیں وہ آگے آئیں۔ اور اجتہاد کے بند دروازے کو پھر سے کھولیں۔ لیکن یہ کام جتنا اہم ہے اسی قدر نازک و پیچیدہ بھی ہے۔ نئی اجتہادی تحریک کا آغاز ایک ایسے ادارہ کی شکل میں کیا جاسکتا ہے جہاں پری یونیورسٹی سے لیکر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ Ph. D تک ہر معنوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔ جہاں پر بلند پایہ اساتذہ کا تقرر اور معیاری طلباء کا داخلہ ہو۔ جہاں مقابلہ سے کترانے کے بجائے مقابلہ کیلئے لٹکارنے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کی جائے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں اس فلا کو پورا کرنے کے لئے آغاز ایک کالج سے کیا گیا تھا مگر بیسویں صدی کے آخری دور میں اس کی ابتدا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (Research Institute) سے کی جانی چاہئے۔ اور دھیرے دھیرے پری یونیورسٹی کی طرف جانا چاہئے۔ یعنی زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ابتدا ہی مخالف سمت سے کرنی پڑے گی۔

کیا امت مسلمہ اس گمراہی کو اٹھانے کے لئے تیار ہے جو اس کی زندگی و ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔



## استدراک نفاث المآثر ۹۷۳ھ

برہان۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء جلد ۱، شمارہ ۴ میں ”مولانا آزاد لائبریری“ کے عنوان کے تحت ص ۲۸۲ (۶۶) پر نفاث المآثر کے ضمن میں دو فروگزاشتیں قابلِ توجہ ہیں۔  
(۱)۔ مصنف کے نام کے ساتھ نامی ”چھپ گیا ہے جو دراصل ”کافی“ ہے  
یہ میر علاؤ الدولہ کا تخلص ہے۔

(۲)۔ ”اس تذکرے کے کسی اور نسخہ کا بھی علم نہیں“ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مکمل نسخے کا علم نہیں۔ آٹھ کتابخانوں میں غیر مکمل نسخے پائے جاتے ہیں۔ رامپور، برطانیہ، ازبکستان، اومر، لاہور، لکھنؤ، راس اور رہاتسک۔ (تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان ص ۱۰۸)

نفاث المآثر۔ تاریخی نام ہے۔ یہ شروع تصنیف کی تاریخ ہے۔ خاتمہ ۹۷۹ھ پر ہوا ہے۔ تاریخی حصہ ۹۸۲ھ میں ختم ہوا ہے مگر نسخے میں ۹۹۸ھ تک کے حالات ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جا بجا اہم واقعات کا اضافہ بعد میں کیا ہے۔  
نسخہ مولانا آزاد لائبریری

بخط نسخہ خوشخط، اوراق ۲۷۴ + ۶ = ۲۸۰، سطر ۱۹، ۳۱، سائز ۹x۷

مکتوبہ ۱۰۸۵ھ شروع میں ۶، اوراق پر فہرستِ شعرا ہے۔ ابتدائے کتاب میں ویساچہ ہے جو ۱۱، اوراق پر حمد و نعت، سببِ تالیف کتابِ ابجاث متعلقہ شعر اور تعریف اکبر بادشاہ پر مشتمل ہے۔ ۲۱۳ اوراق پر ۲۸۱ شعرا فارسی (از اوحدی تا یوسفی) کا تذکرہ اور ۵۰ اوراق پر تین شاہانِ مغلیہ (بابر و ہمایوں و اکبر) کے حالات ہیں۔

### مصنف کتاب

میر علاؤ الدولہ کامی قزوینی موجودہ ۱۰۰۴ھ، قزوین کے اہل علم خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس کے والد میر کئی بن عبد اللطیف الحسینی بڑے مورخ و صاحب تصانیف تھے۔ ہمایوں بادشاہ نے ان کی ذہانت و طبائعی کی تعریف کی ہے۔ مصنف کے دونوں بھائی میر عبد اللطیف اور قاضی صفی الدین عیسیٰ بھی ممتاز اہل علم سے تھے۔ اور بھائی کی طرح یہ دونوں بھی قزوین سے آکر دربارِ اکبری سے متعلق رہے۔ مصنف کا بھتیجا غیاث الدین علی احمد عرف نقیب خاں بن میر عبد اللطیف بھی اکبر شاہ کے ندیموں میں تھا۔ اس نے ابوالفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی طرح مہاراجپوت کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا قابلِ قدر نسخہ مکتوبہ ۱۱۱۲ھ مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔

محمد عبدالشاہد خاں شروانی۔ اسٹنٹ لائبریری (خطوط) مولانا آزاد لائبریری

## پندرہ روزہ تعمیر حیات

- تعمیر حیات :- شعبہ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا ہے۔
- تعمیر حیات :- ہر پڑھنے والے کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرتا ہے۔
- تعمیر حیات :- اہل دل کے ایمان افزہ حالات و مطلقات پیش کرتا ہے۔
- تعمیر حیات :- جذبہ ایمانی اور اسلام کی داعیہ خصوصیات بکثرت ہے۔
- تعمیر حیات :- مسلمان ملکوں کے حالات و واقعات سے باخبر رکھتا ہے۔

### مستقل عنوانات پر ایک نظر

قرآن کا پیام • کلام خیر الانام • ایسی چنگاری بی یارب اپنے خاکستر میں تھی • کتب خانہ کی سیر • تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ • دارالعلوم (حالات و واقعات) • نعت و نظم • آسان زبان، دلکش بیان، مفید معلومات، ویدہ زیب تصویریں و ورق

خط و کتابت کا پیشہ :- منیچ تعمیر حیات، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔



## ایک تبصرہ

نثار احمد فاروقی صاحب

دیوان بیرم خاں خان خاناں

ہر تیبہ : ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی

سید حسام الدین راشدی

ڈاکٹر محمد صابر

ناشر : انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی - ۱۹۷۱ء

قیمت : پندرہ روپے

صفحات : ۱۲۰

انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی نے ایران کے "جشن دومہزار" پانصد سالہ شہنشاہی کے موقع پر قدیم متون کی ترتیب و اشاعت کا قابل قدر کام شروع کیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ متون کی دوسری کڑی ہے۔

کتاب کے ساتھ بیس صفحات کا مقدمہ انگریزی زبان میں ہے۔ اسے ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی نے لکھا ہے۔ بیرم خاں کے فارسی دیوان کا متن سید حسام الدین راشدی نے اور ترکی دیوان کا ڈاکٹر محمد صابر نے مرتب کیا ہے۔

دیوان فارسی میں پانچ قصیدے ہیں : پہلا قصیدہ حضرت علی ابن ابی طالب اور دوسرا

حضرت امام رضا (علیہما السلام) کی منقبت میں ہے۔ تیسرا ہمایوں بادشاہ کی مدح میں، چوتھا جلال الدین اکبر اعظم کی شناس میں اور پانچواں کسی شخص ”دریا خاں“ کی تعریف میں ہے جسے بیرم خاں ”محبوب خویش“ بتاتا ہے۔

ان کے علاوہ غزلیں، فردیات، قطعات اور رباعیات ہیں۔ ایک ”فتح نامہ قندھار“ اور دوسری سوری خانہ ان پر ہمایوں کے فتح پانے کی تاریخ ہے جسے محمد عوفی نے خود ہمایوں سے منسوب کیا ہے، لیکن یہ دیوان بیرم کے مخطوطات میں پایا گیا ہے اس لیے بخوبی ممکن ہے کہ اس کا مصنف وہی ہو۔

دیوان ترکی میں کوئی قصیدہ نہیں ہے۔ غزلوں کے علاوہ چند قطعات، رباعیات اور کچھ فردیات ہیں۔ دیوان کے مرتبین نے ممکن حد تک ترتیب متن کے جدید تر تقاضوں کی تکمیل کا لحاظ کیا ہے۔ متن کی اس اس وہ مہابوہ نسخہ ہے جو ایشیا نمک سوسائٹی آف بنگال کی طرف سے سر ڈینیسن راس (SAR DENISON ROSS) نے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے چھاپا تھا۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم کا ایک مخطوطہ بھی مقابلے کے لیے پیش نظر رہا ہے۔ کتب خانہ حبیب گنج (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) میں بھی ایک بیاض ہے جس میں بیرم خاں کا کلام پایا جاتا ہے۔ اس پر ایک سیر حاصل منمون ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا تھا جو سماہی ”فکر و نظر“ (جنوری ۱۹۶۳ء) میں چھپا تھا۔ مرتب نے اسی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کلام کی تصحیح اور متن کی تعیین میں معاصر تاریخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

دیوان ترکی کے متن کی تصحیح میں ڈاکٹر محمد سابر نے نسخہ کلکتہ (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) کے علاوہ دو اور مخطوطات سے مقابلہ کیا ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ کلکتہ ایڈیشن میں اشعار کی کل تعداد ۲۶۶ تھی۔ اب اس میں ۲۲ نئے اشعار کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد سابر ترکی زبان سے بخوبی واقف ہیں، انہوں نے متن کی تعیین میں ترکی زبان کے پنجابی لہجے کا اتباع کیا ہے اور حواشی میں جا بجا ایسے اشارات درج کیے ہیں جن سے کلاسیکی ترکی اور جدید زبان کے فرق کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر اس صدی میں ہونے والی تحقیقات سے بھی انہوں نے صحبت متن کی تکمیل کی کوشش کی ہے۔



کتاب کے اس حصے کی داد بجا طور پر وہی حضرات دے سکتے ہیں جو ترکی زبان سے واقف ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس کے ساتھ ہی ترکی اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی شامل کر دیا جاتا تو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے والوں کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا۔ مثلاً سر ڈینیسن اس کو شعر نمبر ۲۰۲ اور شعر نمبر ۳۰۳ کے پڑھنے میں دشواری پیش آئی تھی اور ان کا متن مبہم رہ گیا تھا۔ اب ڈاکٹر محمد صابر نے ان اشعار کی صحیح قراءت درج کی ہے اور ان دونوں کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے مقدمے میں درج کر دیا ہے۔ اس میں ایک شعر (نمبر ۳۰۳) کا مفہوم حیرت انگیز حد تک غالب کے اس شعر سے متواضع ہے :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟  
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اگر اس شعر کا انگریزی ترجمہ نہ ہوتا تو تبصرہ نگار کے لیے اس توارد کا اندازہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح اگر ترکی الفاظ کی ایک مختصر فرہنگ بھی ”الفبائی ترتیب“ سے شامل ہوتی تو بہت سے لوگ محض اُکل سے بعض اشعار کا مفہوم سمجھ سکتے تھے۔

ترکی متن سے اس بزرگ میں لطف اندوز ہونے والے معدودے چند ہی ہوں گے۔ لیکن سانیاتی نقطہ نظر سے اس دیوان کی اشاعت بہت اہم ہے۔ اس سے یہ علم ہو جاتا ہے کہ عہدِ مہایوں و اکبر میں رائج ترکی اور فارسی زبان کا ذخیرہ الفاظ کیا تھا اور ان میں کتنے الفاظ مشترک تھے اور پھر کون کون سے اردو زبان کو ورثے میں ملے۔ اس طرح بہت سے الفاظ کی قدیم ترین سند دریافت ہو جاتی ہے۔

سانیات کے طالب علموں کو بھی اس میں بہت کچھ دلچسپی کا سامان ملے گا۔ مثلاً ایک مصرع ہے :

اشجار دا ہر برگ تری حمدینکا گویا

نظاہر یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ درختوں کا ہر پتہ تری حمد و ثناء بیان کر رہا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو یہاں ”دا“ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ کیا پنجابی لہجے میں یہ حرف ترکی زبان سے

داخل ہوا ہے؟

بیرم خاں کا انتقال بہت افسوسناک حالات میں ہوا۔ یہ تاریخ کا معلوم واقعہ ہے کہ وہ عہد اکبری میں معتب ہوا تھا۔ اُسے مقامات مقدسہ کی زیارت اور حج کے بہانے ہندستان سے باہر جانے کی رخصت دی گئی تھی اور وہ غالباً مستقل ہجرت کے ارادے سے اپنا ساز و سامان ساتھ لے کر چلا تھا۔ اس کے ہمراہ سلیم شاہ سودی کی بیوہ بھی تھی جو اپنی لڑکی کو بیرم خاں کے بیٹے سے منسوب کرنے کا ارادہ لے کر حجاز جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک افغان نے اس منصوبے کو خاک میں ملانے کے لیے بیرم خاں کو گجرات کے شہر پٹن میں قتل کر دیا۔ اس کی لاش وہاں ایک مقامی قبرستان میں دفن کر دی گئی تھی پھر اُسے دہلی منتقل کیا گیا اور سترہ سال کے بعد (۱۵۷۷ء) اس کا تابوت شہید مقدس میں سپرد خاک کرنے کے لیے دہلی سے بھیجا گیا۔

یہاں یہ تذکرہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بیرم خاں شیعہ عقائد رکھتا تھا اور اسی نے ہمایوں بادشاہ کو بھی ان عقائد کی طرف مائل کیا تھا۔ یہ اس لحاظ سے ایک کامیاب ڈپلومیسی تھی کہ اس طرح ہمایوں کو شاہ طہاسپ صفوی کی پوری ہمدردی حاصل ہوئی اور بیس سال کے بعد ایرانی فوج کی عملی مدد سے ہندستان کو دوبارہ فتح کر کے مغل سلطنت کی نئی بنیاد گزاری ممکن ہوئی۔ اکبر اعظم نے بعد کو بیرم خاں کی بیوہ سے عقد کر لیا تھا اور اسی وجہ سے عبدالرحیم خاں خاناں نے شاہی محل میں پرورش پائی تھی۔

امام موسیٰ رضا علیہ السلام کے آستانے سے بیرم کو خصوصی عقیدت تھی اور وہ ہمیشہ نہایت بیش قیمت تحائف وہاں کے مجاہدوں کو بھیجتا رہتا تھا۔ خود آستان مقدس پر اس نے جاہرات سے جڑا ہوا ایک علم چڑھایا تھا۔ اسی روضے کے جوار میں اس کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اور قبر کے سرہانے ایک پتھر پر بیرم خاں کا لکھا ہوا قصیدہ ”دردِ حضرت علی ابن ابی طالبؑ“ کندہ کر کے لگا دیا گیا جس کے یہ چند اشعار اپنے لطف و اثر اور شکوہ و جزالت کے اعتبار سے یہاں درج کرنے کے قابل ہیں :

شہد کہ بگذرد از من سپہر افسراد

اگر غلام علی بخت خاک بر سر او



در مدینہ علم آنکہ از کمال شرف  
فتادہ اند سراں بھجو خاک برد او  
بہرہ بیچ پیسہ کسے نبود کہ بود  
برادر و خسرو ابن عم — پیسہ برادر

آخر میں بطور دعا کہتا ہے :

شہا — غلام تو بیرم کہ از عنایت تست  
کہ گشتہ سلطنت ظاہری میسر او  
ولے بجاک جناب تو روئے خویش نسود  
ازاں چہ سود کہ بر چرخ سود افسر او

غرض دیوان بیرم خاں کا یہ ایڈیشن بہت سلیقے سے مرتب ہوا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف  
برصغیر کے فارسی و ترکی ادبیات کا ایک قابل قدر خزینہ ہے بلکہ عہد مغلیہ کی تاریخ، ہند ایرانی  
روابط اور ادبی موضوعات کے ارتقاء پر کام کرنے والوں، یا اردو زبان کے قدیم ترین  
ورثے کا لسانیاتی تجربہ کرنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

## اخبار التنزیل

قرآن اور حدیث کی پیشین گوئیاں

تالیف : مولانا الحاج محمد اسماعیل صاحب سنہ ۱۳۴۱ھ

اس کتاب میں قرآن پاک اور فرمودات نبوی کی پیشین گوئیاں پُر اثر انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔ قرآن مجید  
اخبار غیب کا حامل ہے اس کی ہی خصوصیت اس کے کلام الہی ہونے کے دلائل میں ایک روشن دلیل  
بلکہ برہان قاطع ہے۔ ان کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی، پختگی اور قرآن کے کلام الہی اور نبی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں یقین و اذعان پختہ ہوگا۔ تقطیع متوسط ۲۲۱۸ صفحات

۱۴۴ قیمت بلا جلد - ۵/ مجلد - ۶/

لئے کاپی : ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

## تبصرے

سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ از مولانا محمد میاں صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی۔ کتابت  
علی اور طباعت بہتر۔ ضخامت ۲۳۷ صفحات۔ قیمت مجلد ۲۵/- پتہ: کتابستان، قاسم جان  
اسٹریٹ دہلی - ۶

یہ کتاب جو سلسلہ کی جلد اول ہے، اگرچہ موضوع اس کا سیرت مبارکہ ہی ہے لیکن اس کی ترتیب  
خالص تبلیغی اور دعوتی ہے۔ چنانچہ پہلے انسان - زندگی اور موت کی حقیقت پر ایک بے تکلف مقالہ  
کی شکل میں گفتگو کرنے کے بعد مذہب اور پیغمبروں کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور اس کے بعد مشہور  
پیغمبروں اور کتب سماویہ کے حالات قرآن اور تخیل مقدس کے بیانات کی روشنی میں دیکھے گئے ہیں پھر  
عرب قبل اسلام پر ایک خاصا طویل باب ہے اور اس کے بعد سیرت شروع ہو جاتی ہے، اس سلسلہ میں  
مولانا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی - خاندانی اور خانگی حالات و سوانح اہل آپ کی تعلیمات  
اور اخلاق و فضائل ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح غلط ملط کر دیا گیا ہے کہ بحیثیت  
ایک اعلیٰ ترین انسان کے آپ کی شخصیت کا پیکر ابھر کر ایک غیر مسلم کو بھی متاثر کر سکے، اس لحاظ سے یہ  
بڑی عمدہ اور مقصد میں کامیاب کتاب ہے، زبان سلیس اور انداز بیان سگفتہ و دل نشین ہے  
اگر مولانا کے سامنے علامہ کتانی کی الترتیب لاداریہ اور جواد علی کی العرب قبل اسلام ہوتیں تو وہ  
کتاب کو اور دنیا و بہتر بنا سکتے تھے، بہر حال کتاب جو متعدد مطبوعہ مقالات پر اس طرح مشتمل  
ہے کہ ان مقالات کے نام پیش ہیج اور فہرست مضامین اور چند اشتہارات بھی درمیان میں آگئے  
ہیں۔ قابل قدر لائق مطالعہ ہے، لیکن بعض جگہ عربی عبارت کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے، مثلاً - ۱۶  
نوٹ ص ۱۶۱ میں لکھا ہے کہ: "وہ جو کہ لکھا گیا ہے"



علا بھی اس کا شکار ہو گئے، واقعہ ہے کہ بہادری، سخاوت، فیاضی اور غیرت و حمیت وغیرہ جو اوصاف عرب قبل از اسلام کے بیان کئے جاتے ہیں وہ حد اعتدال اور قدرِ حقیقی سے متجاوز ہونے کے باعث اخلاقِ حمیدہ ہیں ہی نہیں اور اس بنا پر فلسفہ اخلاق کی رو سے وہ ”فضائل“ میں نہیں۔ بلکہ رذائل میں شمار ہونے کے لائق! چنانچہ ان کی بہادری کو ہم فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں شجاعت نہیں، بلکہ شہوان کی سخاوت کو جو نہ نہیں بلکہ اسراف و تبذیر اور ان کی غیرت کو غیرت نہیں، بلکہ کبر نفس کہیں گے قس علیٰ ہذا۔ دوسری قسم کی اعتقادی اور عملی گمراہیوں کے ساتھ مل کر یہی رذائل ہیں جنہوں نے ان عربوں کو ”فی ضلال مبین“ کا مصداق بنا دیا تھا، آخر میں یہی عرض کر دوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کے متعلق عام طور پر جو روایات مشہور ہیں وہ بہت زیادہ محل نظر ہیں اور اس کے وجہ یہ ہیں :

(۱) قرآن میں ہے: ”وَجَدَكَ عَائِلًا مَغْنًیًا“ اللہ نے آپ کو تنگ دست پایا تو آپ کو فنی بنا دیا۔

(۲) ہزاروں انسان تھے جو پر واناں کی طرح آپ پر فدا تھے اور یہ سب اصحابِ صفہ ہی تو نہ تھے بلکہ ان میں ابو بکر، عثمان غنی اور عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہم) جیسے دولت مند اور اربابِ ثروت بھی تو تھے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ کاشانہ نبوت میں فاقے پہ فاقے ہوں اور ان حضرات کو خبر بھی نہ ہو۔

(۳) اہل و عیال کے لئے نان نفقہ کا بند و بست فرض ہے، اس لئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کا بند و بست ضرور کیا ہوگا، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ حضور نے ان سب کے لئے یہ انتظام کر دیا، مگر خود بھوکے رہے۔

(۴) بھوکا رہنا اسلام میں محمود نہیں۔ مذموم ہے اور اللہ کی ناشکری ہے۔

(۵) آخر حضور کے لئے کیا چیز نہیں تھی جس کے باعث آپ کو مسلسل فاقوں کی فوبت

آئے۔ درحقیقت اس طرح کی باتیں ہمارے صوفیاء اور واعظوں نے مشہور کر رکھی ہیں۔ چنانچہ

ابن الحامونہ "کا ترجمہ کہاں ہیں ہمارے حمایتی" صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ "نا" ضمیر جمع مکمل نہیں ہے، بلکہ محامون جمع محامی کی ہے اور الفت اشباع کا ہے اسی طرح اس شعر میں "معشر" کا ترجمہ "گروہ" ہونا چاہیے نہ کہ "معاشرہ" دونوں میں بہت فرق ہے۔ ج ۱ ص ۱۱ پر "تکسب المعلوم" کا ترجمہ: "آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظر نہیں ملتی" کے بجائے صحیح ترجمہ یہ ہو گا کہ "جو لوگ کچھ آمدنی نہیں رکھتے آپ ان کے لئے آمدنی کا ذریعہ ہم پہنچاتے ہیں" علاوہ انہیں "تقری الصیف" کا بھی صحیح ترجمہ یہ ہو گا "کہ آپ جہان کی خاطر مدارات کرتے ہیں" نہ یہ کہ "باہر کے مسافر جو بے ٹھکانہ ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں" ص ۱۱ پر "عصمة الادامل" کا ترجمہ "بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ" کی جگہ "بیوہ عورتوں کی حفاظت گاہ" زیادہ موزوں رہے گا۔ عام مفسرین کی طرح جن آیات میں حضور کو خطاب کیا گیا ہے مولانا نے بھی وہاں لفظ "تو" اور واحد مخاطب کا صیغہ استعمال کیا ہے، لیکن درحقیقت دل کو یہ بڑا شاق گذرتا ہے پھر مولانا نے عرب قبل اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱ پر آپ نے عربوں کو اخلاق و عادات اور اوصاف و کمالات کے اعتبار سے اس زمانہ کی بے نظیر قوم قرار دیا ہے "سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مولانا کا یہ بیان صحیح ہے تو قرآن میں ان کے متعلق "وان کاوا من قبل لغی ضلال مبین" کیوں فرمایا گیا چنانچہ آگے چل کر مولانا خود لکھتے ہیں جن سے سابقہ بیان کی تردید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ

تدن میں اپنا مقام رکھتے تھے، مگر روح تدن سے وہ بھی محروم تھے لن کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی" ص ۱۱، علاوہ انہیں اخلاقی معائب کی آپ نے ایک جگہ ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے عرب ان تمام بیماریوں کے طاعن.... ص ۱۱

کہ اس معاملہ میں مستشرقین کے ایک طبقے نے عرب قبل از اسلام کے متعلق ایک بہت غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے پھر عرب قومیت کے علمبرداروں نے اسے اور ہوادی اندہ ہمارے عقیدہ



اس سلسلہ میں ایک روایت ”الفقر فخری“ ہر شخص کی زبان پر ہے لیکن محقق علما اور محدثین نے اس روایت کو موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا محمد میل صاحب نے اس فقرہ فخری کی بات کو بڑے طعنا سے اور بڑھا چڑھا کر کئی صفحوں میں لکھا ہے، ص ۱۲۴ پر مولانا نے نجاشی کے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مگر اس کی دلیل کیا ہے؟ تاریخ سے اس کا ثبوت میرے علم میں نہیں ہے، کتاب بحیثیت مجموعی بہت مفید اور معلومات افزا ہے، اس کا مطالعہ کرنا باعث ثواب ہوگا۔

(۱) غالب کی کہانی ۱۲۸ صفحات قیمت ۵/۲	از جناب محمد شفیع الدین صاحب تیرہ۔
(۲) وطنی نظمیں ۸۰ صفحات قیمت ۵/۸	سائز خورد، کاغذ کتابت و طباعت
(۳) منی کا تحفہ ۹۶ صفحات قیمت ۱/۲۵	سب اعلیٰ اور معیاری، گٹ اپ
(۴) منی کے گیت ۶۴ صفحات قیمت ۷۵/-	خوبصورت اور دل کش،
(۵) گھر کا آئینہ ۳۲ صفحات قیمت ۳۲/-	پتہ :- نیر کتاب گھر، جامونگر،
(۶) چنگو منگو ۳۲ صفحات قیمت ۵۵/-	نئی دہلی - ۲۵

نیر صاحب بچوں کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی عمر ہی بچوں کے پڑھانے اور ان کے ساتھ رہنے سہنے اور بات چیت کرنے میں گزری ہے، اس لئے ان کی طبیعت نفسیات اور ان کی تعلیم و تربیت کے مسائل و معاملات پر ان کی نظر ایک ماہر فن کی ہے، پھر ان میں ہر بچے کے ساتھ بے اختیار محبت کرنے کا طبعی اور فطری جذبہ اور زبان اور اس کے محاورات پر قدرت کے باعث آسان زبان میں نثر و نظم لکھنے کا ایک ایسا ملکہ اور سلیقہ بھی ہے جس نے بلا مبالغہ انھیں مولانا محمد اسماعیل دیرپھی مرحوم کا مثنی بنا دیا ہے، مذکورہ بالا کتابوں میں سے پہلی کتاب میں غالب کے حالات اور ان کی شاعری اور ان کے اخلاق و عادات پر ایسی سہل اور شگفتہ زبان میں گفتگو کی گئی ہے کہ ساتویں آٹھویں جماعت کے بچے اس کو دل لگا کر پڑھ سکتے اور خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، غالب ایسے نثر گو شاعر کو اس طرح بچوں سے مشارت کرنا کمال صناعتی ہے دوسری کتاب میں ایسی نظمیں اور گیت ہیں جن میں وطن کا حسن و جمال باہمی اتحاد و اتفاق

اور وطن کی خدمت کے لئے بچوں کی اعلیٰ تعلیمی اور اخلاقی تربیت وغیرہ مضامین بیان کئے گئے ہیں، تیسری اور چوتھی کتاب علی الترتیب نظموں اور گیتوں کے لئے مخصوص ہیں، ان کے موضوعات بچوں کے رجحانات اور ان کے روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کے مطابق ہیں، نظم اور گیت دونوں میں زیر و بم کے ذریعہ ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بچے اور بچیاں آسانی سے یاد کر سکیں، پانچویں کتاب نشر میں چند کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں گھر کی صفائی، تھرائی، عمدہ اخلاق اور دین مہن کے طور طریق پر دلچسپ اور سبق آموز گفتگو اور آخری کتاب میں دور بچپن کی سرگزشت حیات دلچسپ افسانہ کہہ سکتے ہیں بیان کی گئی ہے، غرض کہ بچوں کے لٹریچر میں یہ سب کتابیں گل سرسب کا حکم رکھتی ہیں، لیکن یہ دیکھ کر سخت دکھ اور افسوس ہوا کہ یہ کتابیں دس یا وہ برس کی مدت میں صرف دو ہزار، اور وطنی نظیں ۲۸ برس کی مدت میں صرف پانچ ہزار کل سکی ہیں۔ یہ اردو زبان کی کس پرسی ویکسی اور اہل زبان کی بے غیرتی و بے حسی کی نہایت افسوسناک دلیل ہے، اگر اس پایہ کی کتابیں انگریزی یا ہندی یا بنگالی یا مرٹھی میں ہوتیں تو مصنف کبھی کا لکھتی بن گیا ہوتا اور ایک شامدار کوٹھی اور کار کا مالک ہوتا۔ لیکن آہ اردو!

جس کے تم دبیر جو جس دل میں تمھاری یاد ہو  
وہ ہمیشہ خاک چھانے اور سدا برباد ہو

فہرست کتب اور ادارہ کے قواعد و ضوابط

مفت طلب فرمائیے

منیجر۔ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶





# 250,000 روپے

## کے انعامات

### ڈاکھانے کے سیونگزنک کے ذریعے

**پہلا انعام 2,50,000 روپے**

دوسرے نمبر کے 5 انعامات 1,00,000 روپے ہر ایک  
تیسرے نمبر کے 10 انعامات 50,000 روپے ہر ایک  
چوتھے نمبر کے 100 انعامات 10,000 روپے ہر ایک  
پانچویں نمبر کے 1,000 انعامات 500 روپے ہر ایک  
چھٹے نمبر کے 10,000 انعامات 50 روپے ہر ایک

اپنے بچے یا دوست کے ساتھ مل کر  
کھیلنے کے لیے آپ اپنے بچے کو  
بچے کی بچکانہ ایک ڈاکھانے میں  
ایک سے زائد کھیل نہیں کھیل  
ہو سکتے۔ تمام کھیلوں میں کھیلنا  
نمبر 25,000 روپے عنایت  
کے لیے ہر دن ہفتے کی ایک ڈاکھانے  
بچکانہ کھیلنا ہو سکتا ہے۔  
پہلی باری 1974 میں کھیلنا  
جاری کیے۔ اپنے بچے کے ہونے کیلئے  
ڈاکھانے کھیلنا ہو سکتا ہے۔

بچکانہ کھیلوں میں  
بچے کے ساتھ کھیلنا ہو سکتا ہے 1973  
1974 میں کھیلنا ہو سکتا ہے  
نمبر 25,000 روپے  
پاس سے زیادہ ہو سکتا ہے  
بچکانہ کھیلوں کے  
کھیلوں میں کھیلنا ہو سکتا ہے۔  
بچکانہ کھیلوں کے لیے بچکانہ  
کھیلنا ہو سکتا ہے۔  
بچکانہ کھیلوں کے لیے بچکانہ  
کھیلنا ہو سکتا ہے۔

نیشنل سیونگزنک کمیٹی  
پوسٹ بکس 1111



# برہان

جلد ۷۷ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء شمارہ ۶

- |   |   |     |
|---|---|-----|
| ۱۔ نظرات  | سید احمد اکبر آبادی                     | ۳۶۲ |
| مقالات  |   |     |
| ۲۔ عہد نبوی کا تاریخی جائزہ                                       | جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب        | ۳۶۶ |
|   | پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی دہلی        |     |
| ۳۔ ڈراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت اور صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقاء | جناب سید امین الدین صاحب                | ۳۷۹ |
|   | جلالی شاہ بھانپوری                      |     |
| ۴۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تقسیم کے بعد                            | سید احمد اکبر آبادی                     | ۳۹۶ |
| ۵۔ ادبی روایت سے بغاوت تک   | جناب عنوان چشتی صاحب لکھنؤ              | ۴۱۳ |
|   | جامعہ طیبہ اسلامیہ - جامعہ مگر نئی دہلی |     |



## نظرات

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور مسلمانوں کے لئے تو علم دین اور علم کائنات دونوں ہی ضروری ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو عظیم ادبار پڑا تھا اس سے نجات پانے اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی راہ تعلیم کے ذریعہ ہی ہموار ہوئی تھی۔ سرسید نے جب کالج قائم کیا تو ساتھ ہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی۔ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان جو تعلیم میں بہت پسماندہ تھے بلکہ اس سے نفور تھے اور علوم جدیدہ کو اپنے لئے شجر ممنوعہ سمجھتے تھے، ان کو تعلیم جدید کی اہمیت و ضرورت کا احساس اور اس کی طرف رغبت و شوق دلایا جائے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کے نمونہ پر پورے ملک میں جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج بنائے جائیں۔ چنانچہ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ کانفرنس نے ان دونوں میدانوں میں بڑی سرگرمی اور جوش سے کام کیا۔ علی گڑھ کالج اگر ”گل“ تھا تو کانفرنس نسیم و چمن تھی جس نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں صور کا کام کیا اور انھیں نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی۔ لیکن تقسیم کے بعد جو حالات (خصوصاً شمالی ہند میں) پیش آئے ان کا اثر کانفرنس پر بھی پڑا اور وہ صرف زیر لب ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ فعال و متحرک ہونے کی ضرورت تھی۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تعلیم کے معاملہ میں جنوبی ہند کے مسلمان شمالی ہند کے مسلمانوں

کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بیدار مغز، روشن خیال اور عملاً متحرک و فعال ہیں۔ چنانچہ وہاں ان کی کئی انجمنیں ہیں جنہوں نے اس سلسلہ میں شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ کیرالا کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اب تک ۳۵ ہائی اسکول، چند کالج (جن میں میڈیکل اور انجینئرنگ کالج بھی شامل ہیں) متعدد زچہ خانے، یتیم خانے، اساتذہ کے لئے ٹریننگ اسکول اور شبینہ مدارس وغیرہ قائم کر چکی ہے اور مزید برآں تین لاکھ روپیہ سالانہ کے وظائف مستحق اور ضرورت مند طلباء کو تقسیم کرتی ہے۔ مدراس میں ساؤتھ انڈین ایجوکیشن ٹرسٹ (SIET) کے ماتحت اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا ہے برہان میں اس کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے۔

جنوبی ہند کی ان تعلیمی سوسائٹیوں کا کام ان کی چار ریاستوں تک ہی محدود تھا لیکن ملک کے حالات کا اقتضا تھا کہ آل انڈیا تحریک کی حیثیت سے اس اہم اور ضروری کام کو سرگرمی اور جوش کے ساتھ شروع کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں جب کالیکٹ میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کی ایک عظیم تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تو وہاں "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی" بھی قائم کی گئی اور رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت اسے رجسٹرڈ بھی کرایا گیا۔ اس سوسائٹی کے قیام کے بعد اس کا پہلا اجلاس "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں بمبئی میں ہوا اور دوسرا اجلاس گذشتہ ماہ نومبر میں پٹنہ میں ہوا جس کا افتتاح شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔ محترمہ لیڈی انیس امام نے خطبہ استقبالیہ پڑھا اور جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے صدارت کی۔ ملک کے اطراف و اکناف سے آٹھ سو کے قریب نمائندوں اور مندوبین نے شرکت کی۔ کانفرنس ۱۶ سے ۱۸ نومبر تک تین دن رہی۔ ہر اجلاس عام میں خواص اور عوام نے بتعداد کثیر جس جوش و خروش سے شرکت کی اس سے تحریک خلافت کے جلسوں کی یاد تازہ ہو گئی، ان تین دنوں میں متعدد سمینار بھی تعلیم نسواں، عام تعلیم، مکمل ایجوکیشن، بنیادی مذہبی تعلیم، اعلیٰ مذہبی تعلیم، اور مسلمانوں کے سماجی اور اقتصادی معاملات و مسائل



الگ الگ منعقد ہوئے جن میں مقالات پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں۔ مزدوین میں ایک خاصی تعداد خواتین کی بھی تھی۔ ان کا اجلاس الگ منعقد ہوا۔ تجاویز منظور کی گئیں۔ قیام و طعام کا انتظام خاطر خواہ تھا۔ پٹنہ کے باہر مسلمان لائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اتنی بڑی کانفرنس کا اہتمام و انتظام کیا، خصوصاً یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ بہار کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑی بیداری اور مخلصانہ کام کرنے کا بڑا جذبہ ہے۔ انہوں نے اپنی الگ ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کے ماتحت وہ مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاح کے سلسلہ میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن ان کو ضرورت صحیح رہنمائی کی ہے۔ ہمارے علماء کی یہ ایک بڑی انسٹانک کوتاہی اور عاقبت نااندیشی ہے کہ انہوں نے وعظ و تقریر یا پیری مریدی کی راہ سے عام مسلمانوں سے تو ربط رکھا، لیکن تعلیم جدید کے نوجوان طبقہ سے ربط پیدا کرنے اور ان کے مسائل و معاملات پر غور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علماء کا دائرہ اثر و اقتدار صرف عوام تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ ان کے اثر سے آزاد ہوتا جا رہا ہے، البتہ جماعت اسلامی نہایت منظم طریقہ پر اور دل کی لگن سے اس خلا کو پر کر رہی ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اس کا نفوذ و اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، یہ صورت حال جہاں بجائے خود خوش آئند اور امید افزا ہے وہاں علماء کے لئے بھی ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتی اور ان کو احتساب نفس کی دعوت دیتی ہے۔ فَلَاحٌ مِّنْ مَّذْکُور۔

انہیں دونوں لکھنؤ میں اردو زبان کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی اور پھر اردو زبان کے اخبارات کے اڈیٹروں کی کانفرنسیں بھی پڑے پیمانہ پر منعقد ہوئیں اور کامیاب رہیں۔ ان دونوں کانفرنسوں سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا دن کے وقت سورج کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اور تو اور بعض مسلمان بھی مسلمانوں کے لئے لسانی اقلیت اور اردو کے لئے اقلیتی زبان کی اصطلاح استعمال کرنے

لگے ہیں، چنانچہ وزارت داخلہ کے نائب وزیر جناب محسن صاحب نے بھی پچھلے دنوں اپنے ایک بیان میں اردو کو اقلیت کی زبان کہا ہے، بے شبہ مسلمان ایک مذہبی اقلیت ہیں، کیونکہ مذہب میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ لیکن وہ لسانی اقلیت کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ اسی زبان میں ان کے ساتھ ان کے برادران وطن بھی شریک ہیں، صرف یہی ایک غلط تصور ہے جو اردو کی موجودہ مشکلات کا سبب بنا ہوا ہے، اس بنا پر اردو کا مسئلہ ایک اقلیتی مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ خالص قومی اور جمہوری مسئلہ ہے اور اس کو اسی نظر سے دیکھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

## ”برہان اور ندوۃ المصنفین ضغطے میں“

افسوس اور پریشانی کے عالم میں یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ ان دنوں ”ندوۃ المصنفین“ اور اس کا ترجمان ”برہان“ دونوں بحران کا شکار ہیں۔ قارئین برہان اور ندوۃ المصنفین کے حلقے کے احباب جانتے ہیں کہ اپنی روش نہ الحاح و زاری کہے نہ حکوہ اور شکایت کی۔ ۱۹۳۷ء کی قیامت سر سے گذر گئی مگر ہم نے آف نہیں کی حالانکہ ادارہ کی جان اس قیامت خیز برہان کے جد ہی کل چکی تھی۔ ”برہان“ کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا ۳۶ سال کی اس طویل مدت میں اس رسالہ پر ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس کی آمدنی اور مصارف کا توازن قائم رہ سکا ہو۔ مگر یہ نقصان ادارہ کی مطبوعات کی فروخت سے پورا کیا جاتا رہا۔ ۱۹۷۵ء سے پاکستان سے کاروبار بند ہوا تو ادارہ کی چولیں بھی ہل گئیں اور بڑی کشاکش سے یہ وقت گزرا۔ گزشتہ تین چار مہینوں سے مصارف ناقابل برداشت ہو گئے اور اسباب ظاہری کے اعتبار سے کوئی شکل ایسی باقی نہیں رہی کہ برہان کو جاری رکھا جاسکے، قیمت میں اضافہ کتنا کیا جائے؟ اور کہاں تک کیا جائے؟ عام طور پر قارئین رسالہ غیر مستطیع ہیں ”برہان“ جیسے علمی اور دینی رسالوں کا حلقہ اشاعت محدود ہی ہوتا ہے۔ ادارہ کی حالت یہ ہے کہ تمام بچنے والے کتابوں کا میل ٹوٹ گیا ہے اور سردست ان کے شائع ہونے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ ۱۹۷۹ء سے ادارہ کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال اپنے معاوضوں کو چار جدید کتابیں دیتا رہا ہے۔ اس سال اب تک جدید کتب کی طباعت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے ادارہ کے پاس کبھی کوئی محفوظ سرمایہ نہیں رہا۔ جرأت زندانہ ہی سے کام چلتا تھا افسوس ہے اب یہ جرأت بھی جواب دے رہی ہے۔ کاغذ کی قیمت پہلے ہی کیا کم تھی کہ ان دو مہینوں میں دگنی ہو گئی۔ اس وقت جو کاغذ برہان میں لگایا جاتا ہے اس کی قیمت ۵۸ روپے فی رم ہے، اس نسبت سے کتابت، طباعت اور دوسرے مصارف میں اضافہ ہو گیا ہے ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اندازہ یہ ہے کہ جنوری ۱۹۸۰ء سے برہان کی اشاعت ملتوی کرنی پڑے گی۔ اور جب ادارہ سے جدید کتابیں شائع نہیں ہوں گی تو معاوضوں سے فیس کیسے وصول کی جائے گی۔ اس لیے بحالت موجودہ نہ صرف برہان بلکہ ادارہ کا وجود بھی خطرے میں ہے یہ سطوریں اس لیے تحریر کی گئی ہیں کہ قارئین حالات کی نزاکت سے باخبر رہیں۔



# عہد نبوی کا تاریخی جائزہ

(۵)

از جناب ڈاکٹر غور شید احمد فارق صاحب پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی

## جنگ بدر

ساتویں مہم کے قائد رسول اللہؐ تھے، ان کے ساتھ کوئی دو ڈیڑھ سو مہاجر تھے اور سواری کے لئے کل بیس اونٹ، ان کا مقصد قریش کا تجارتی قافلہ پکڑنا تھا جو شام جا رہا تھا۔ ناکافی اونٹوں سے پیدا ہونے والی سست رفتاری کے باعث رسول اللہؐ مقررہ جگہ یعنی مکہ سے شام جانے والی تجارتی شاہراہ پر واقع ذوالنخیرہ نامی کاروان اسٹیشن جو مدینہ سے اسی نوے میل مغرب میں تھا، اتنی دیر میں پہنچے کہ قافلہ نکل چکا تھا۔ دو ڈھائی ماہ بعد یہ قافلہ ابوسفیان کی نگران اعلیٰ اور بیس آلیس دو سو بڑے قریشی تاجروں کی معیت میں حجاز کے بازاروں کے مطلب کا بہت سا سامان لے کر شام سے واپس ہوا تو رسول اللہؐ کے جاسوسوں نے خبر دی کہ قافلہ بدر سے ہو کر گزرنے والا ہے جو تجارتی شاہراہ پر مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں شاہراہ کا مدینہ سے قریب ترین اسٹیشن تھا۔ رسول اللہؐ نے ایک تقریر میں مال غنیمت کی امید دلا کر مہاجرین و انصار دونوں سے اپیل کی کہ قافلہ پکڑنے کے لئے بلا تاخیر مسلح ہو کر ان کے ساتھ چلیں۔ پے درپے ناکامیوں اور بے سرو سامانی حتیٰ کہ سواری تک نہ ہونے سے پیدا ہونے والی گونا گوں تکلیفوں کے باعث مہاجرین کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور مزید قسمت آزمائی کی ان میں نہ ہمت تھی نہ اسے سود مند سمجھتے تھے۔ انھوں نے رسول اللہؐ کے

سامنے صورت حال کا جائزہ لیکر انھیں ہم موقوف کرنے کا مشورہ دیا لیکن رسول اللہؐ ہر بار سے زیادہ  
 پر امید تھے، ان کی مسلسل ترغیب و اصرار سے کئی درجن مہاجر چلنے کے لئے تیار ہو گئے، باقی نے  
 معذوریوں کی آڑ لی۔ انصار کے اوس و خزرج قبیلوں کی اکثریت ہم لے جانے کے خلاف  
 تھی۔ سورۃ انفال کی اس آیت میں مہاجرین و انصار کے اسی منفی رجحان کی طرف اشارہ ہے۔  
 وَإِنْ فَرِقْنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ لَكَارِهُونَ، يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَكُمَا  
 يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ۔ مسلمانوں کی ایک جماعت تائفہ پھڑنے کیلئے نہیں جانا  
 چاہتی تھی، یہ لوگ ہم لے جانے کی حقانیت کے بارے میں جو واضح ہو چکی تھی تم سے بحث و مباحثہ  
 کرتے تھے اور ہم پر جانے سے ایسا ڈرتے تھے گویا سامنے کھڑی موت کی طرف لے جائے  
 جا رہے ہوں۔ اس آیت کے اجمال پر عربی روایت نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔  
 وَتَخَلَّفَ عَنِ النَّبِيِّ بَشَرٌ كَثِيرٌ مِنْ أَصْحَابِهِ كَبُرَ هُوَ أَخْرُوجَهُ وَكَانَ فِيهِ كَلَامٌ كَثِيرٌ وَ  
 اخْتِلَافٌ۔ رسول اللہؐ کے بہت سے ساتھی ان کے ساتھ نہیں گئے، وہ ہم لے جانے کے  
 خلاف تھے اور اس باب میں ان کے درمیان خوب بحث و مباحثہ ہوا اور سخت اختلاف پائے  
 پایا جاتا تھا۔ انصار کی ایک چھوٹی سی جوان اور جوشیلی اقلیت جس کے دوسرے اور تیسرے درجہ  
 کے لیڈر رسول اللہؐ کی خوشنودی حاصل کر کے اپنا رسوخ بڑھانا چاہتے تھے، ہم کے حق میں  
 تھی۔ یہ اقلیت جس میں دوسو اکتیس آدمی تھے۔ ایک سو ستر خزرجی اور اکٹھ اوسی، دونوں  
 قبیلوں کے غریب و گمنام طبقہ پر مشتمل تھی جس کے پاس نہ صحیح ہتھیار تھے نہ سواری کے لئے اونٹ،  
 جسے اس کے جوان اور بامنگ لیڈروں نے تجارتی تائفہ کی غنیمت سے مالا مال ہونے کی امید  
 دلا کر چلنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا، اوس و خزرج کے دونوں قبیلوں میں اس وقت گیارہ نقیب  
 تھے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے زیر اثر خاندانوں کو رسول اللہؐ کی اطاعت کرانے کا ذمہ دار



تھا لیکن چونکہ بیشتر اسی و خراجی لیڈر قافلہ کی گرفتاری ناقابل وقوع اور رسول اللہؐ کی دسترس سے باہر تصور کرتے تھے، اس لئے اُن کے ہم قوم اس ہم پر جانے سے کترارہے تھے، یہی وجہ تھی کہ بلینے کوشش کے باوجود ہر نقیب مجوزہ ہم کے لئے بیس اکیس سے زیادہ جوان فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسو اکتیس انصاریوں کے مقابلہ میں مہاجرین کی تعداد ستر اور بقول بعض چالیس ہی تھی، مدینہ میں ان کی آبادی سے بہت کم۔ رسول اللہؐ کی اس مختصر فوج میں صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے جن پر تین تین چار چار آدمی سوار ہوتے تھے۔ قریشی قافلہ کی طرف روانہ ہوتے وقت رسول اللہؐ کی زبان پر یہ دعا تھی: مالک میرے ساتھیوں کے پیروں میں میں چھالے پڑ گئے ہیں، انھیں سواری عطا کر، ان کے پاس کپڑا نہیں، انھیں کپڑا دے، وہ بھوکے ہیں، انھیں پیٹ بھر کھانا دے، وہ مفلس ہیں، انھیں دولت عطا کر۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّہُمْ حُفَاةٌ فَاجْمِلْہُمْ، اَللّٰهُمَّ اِنِّہُمْ عُرَاةٌ فَاکْسِہُمْ، اَللّٰهُمَّ اِنِّہُمْ جِیَاعٌ فَاشْبَعْہُمْ وَعَالَۃٌ فَاغْنِہُمْ

شام سے واپس کے وقت ابوسفیانؓ کو جو قافلہ کا نگران اعلیٰ تھا جاسوسوں نے خبر دی کہ محمدؐ کا ارادہ قافلہ پر چھاپہ مارنے کا ہے۔ ابوسفیانؓ نے فوراً قریشی اکابر کے پاس قاصد بھیج کر مدد طلب کی۔ اس قافلہ میں مکہ کے ہر چھوٹے بڑے تاجر کا سامان تھا جس کی مجموعی قیمت عزا داوی ڈھائی لاکھ روپے (پچاس ہزار دینارؓ) بتاتے ہیں۔ قریش کے تقریباً سارے اکابر لگ بھگ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، ان کی فوج میں سات سو اونٹوں، گھوڑوں کے علاوہ خاصی مقدار میں تجارتی سامان بھی تھا جسے بدر کے ہاٹ میں بیچنے کے لئے انھوں نے

۱۔ انساب الاشراف ۱/۲۹۰

۲۔ ابن سعد ۲/۲۰، مغازی ص ۱۹

۳۔ مغازی ص ۲۱

ساتھ لے لیا تھا۔ اکابر نے ابوسفیان سے کہلا بھیجا کہ ہم مدد کے لئے آرہے ہیں اور بدر کے میدان میں تم سے ملیں گے، وہاں پہنچ جاؤ۔ ابوسفیان بدر کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ مکہ کی فوج ابھی نہیں آئی ہے نیز یہ کہ مدینہ کے جاسوس پوچھ گچھ کرنے بدر آئے تھے۔ ابوسفیان گھبرا گیا اور تیزی سے قافلہ بدر کے پڑوس سے نکال لے گیا۔ محفوظ جگہ پہنچ کر اس نے قریشی اکابر کو مطلع کیا کہ میں بخیریت قافلہ لے کر ساحلی راستہ سے مکہ کی طرف گامزن ہوں، اب بدر جانے کی ضرورت نہیں ہے، سب لوگ مکہ واپس چلے جائیں۔ اکثر قریشی اکابر واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے لیکن ان کی ایک چھوٹی سی جماعت جس کی قیادت صف اول کا زعمیم اور رسول اللہ کے سب سے بڑا مخالف عمرو بن ہشامؓ جس کی کنیت ابو عکرمہ بدل کر رسول اللہؐ نے ابو جہل کا لقب دیا تھا، جانے سے انکار کر دیا، اس کی اور اس کے ہم خیال جماعت کی رائے تھی کہ محمدؐ کے ساتھیوں نے دو ماہ پہلے حج کے مقدس مہینہ رجب میں دھوکہ دیکر بطنِ نخلہ میں ان کا جو تجارتی قافلہ لوٹا تھا اور ان کے حلیف عمرو بن حضری کو قتل کیا تھا، اس کا انتقام لینا اور محمدؐ کے جارحانہ رجحانات کی روک تھام ضروری ہے تاکہ قریش کے تجارتی قافلوں پر آئندہ ہاتھ ڈالنے کی انہیں جرأت نہ ہو۔ قریشی اکابر میں پھوٹ پڑ گئی، ان کی اکثریت واپس و ترک جنگ کے حق میں تھی، اقلیت انتقام اور آئندہ اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لئے جنگ ضروری قرار دیتی تھی، قریشی اکابر آپس میں رد و قدح کرتے بڑھتے چلے گئے۔ ان کے دو بار سوخ لیڈر انتقام اور جنگ کو قریش کے بڑے مفادات کے لئے مفہم تصور کر کے اپنے اپنے خاندانوں۔ زہرہ اور عذیہ کے تنو سے اوپر آدمیوں کو لیکر مکہ چلے گئے۔ اس اثناء میں ابوسفیان بھی اکابر سے آگاہ اس نے کہا کہ جس مقصد کے لئے تم لوگ نکلے تھے وہ پورا ہو چکا ہے اور قافلہ بخیریت اپنی منزل جا پہنچا ہے لہذا گھروٹ چلو اور محمدؐ سے بلا ضرورت الجھکر اپنی قیمتی جانیں مت گنواؤ۔ جنگ کے حامیوں نے ابوسفیان کا مشورہ بھی مسترد کر دیا۔ قریشی اکابر اپنی قوم کے ساتھ بدر کے وسیع میدان میں ریت کے ایک ٹیلے کی اوٹ میں خیمہ زن ہوئے۔ جب دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہونے لگیں تو جنگ کے مخالف اکابر نے پھر ایک بھر پور کوشش



کہا کہ ابو جہل اور اس کے ہم خیال بغیر لڑے مکہ لوٹ جائیں لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی، ان کے متر پختہ کار، مالدار اور معزز لیڈر عتبہ بن ربیعہ نے جو اکثریت کا ترجمان تھا ایک پر زور اپیل میں کہا کہ میں بطنِ نخل میں لٹنے والے تافلے کا معاوضہ اور مقتول قرشی حلیف عمرو بن حضرمی کی دیت اپنے پاس سے ادا کرنے کو تیار ہوں، محمدؐ اور ان کے بہت سے ساتھی ہمارے رشتے دار ہیں، وہ ہمیں قتل کریں یا ہم انھیں بہر حال اس سے ایک دوسرے کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور ایک دوسرے کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگے گی، محمدؐ سے بڑا نہیں زیب نہیں دیتا، عربوں کو ان سے لڑنے کے لئے چھوڑ دینا چاہئے، اگر محمدؐ نے حکومت حاصل کر لی تو اس سے بحیثیت رشتہ دار ہماری اپنی شان بھی بڑھے گی اور اگر وہ مارے گئے تو بغیر لڑے بھڑے ہمارے پہلو کا نشانہ بن جائے گا۔

..... ابو جہل اور اس کے

ہمنوا ساتھیوں پر اس اپیل کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، ابو جہل نے عتبہ کو آڑ سے ہاتھوں لیا، اسے طعنہ دیا کہ تم ڈر کر بھاگنا چاہتے ہو، محمدؐ تمہارا چچا زاد بھائی ہے اور تمہارا لڑکا (ابو حذیفہ) اس کے ساتھ ہے اس لئے تم دونوں کی سلامتی کی خاطر جنگ سے گریز کر رہے ہو، محمدؐ کی چھوٹی سی زوجہ دیکھ کر تمہارے ہاتھ پیر پھوٹے جا رہے ہیں، جبکہ دشمن سامنے کھڑا ہے تم ہمیں چھوڑ کر فرار ہونا چاہتے ہو اور ہمارے حوصلے پست کر رہے ہو، بخدا ہم بغیر لڑے نہیں جائیں گے۔ اپنے ہم قوموں کو میدانِ جنگ میں چھوڑنے کی عار اور اس کے قبائلی و خاندانی بُرے نتائج کے پیش نظر جنگ کے مخالف اکابر قریش جنگ میں شرکت کے لئے مجبور ہو گئے، لیکن ان کے اور ان کے زیر اثر سیکڑوں سپاہیوں کے حوصلے پست تھے۔ رمضان ۲ء کے اواسط میں جنگ شروع ہوئی تو رسول اللہؐ کے جوان اور جو شیلے سپاہیوں نے جن جن کر بہت سے پیرانہ سال اور مضمحل قوی اکابر کو قتل کر ڈالا،

ان میں عُقبہ اور ابو جہل بھی شامل تھے۔ قرشی فوج کے حوصلے پہلے ہی مخالفین جنگ کی موڑا پیلوں سے پسپت ہو چکے تھے، اپنے صفِ اول کے لیڈروں کی موت سے ان کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی، عالمِ مایوسی میں وہ جان بچانے کے لئے میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مکہ کا رخ کیا۔ قریش کے شتر سے کچھ اوپر آدمی مارے گئے، اتنی ہی تعداد میں گرفتار ہوئے۔ رسول اللہ کے چھ ہاجر اور آٹھ انصاری کام آئے۔ رسول اللہ کے ساتھی دشمن کے خیمہ میں گھس گئے اور جو چیز جس کے ہاتھ آئی اس نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ سے چیزیں چھیننے اور چھپانے کے بہت سے قضیے پیدا ہو گئے، جو لوگ لڑے تھے انہوں نے ان لوگوں کو مالِ غنیمت دینے سے انکار کر دیا جو رسول اللہ کے پاس چوکیداری کر رہے تھے یا جن کی تلوار سے دشمن کا کوئی آدمی قتل نہیں ہوا تھا یا جو دشمن کی صفوں سے دور رہے تھے۔ رسول اللہ کو یہ باتیں سخت ناگوار ہوئیں، وہ چاہتے تھے کہ سارا مالِ غنیمت ان کے پاس لایا جائے اور وہ اپنی صوابدید سے اسے تقسیم کرائیں، اس وقت وحی کے ذریعہ مالِ غنیمت تقسیم کرنے کا یہ ضابطہ مقرر ہوا کہ اس کے پانچ حصوں میں سے چار مساویانہ فوج میں تقسیم کر دئے جائیں اور پانچواں حصہ رسول اللہ کو دیدیا جائے۔ دو ماہ پہلے بطنِ نخلہ میں حاصل ہونے والے اولین مالِ غنیمت کی تقسیم اسی طرح ہوئی تھی لیکن اس وقت وحی سے اس کی توثیق نہیں ہوئی تھی اس ضابطہ کی روشنی میں بدر کا سارا مالِ غنیمت قبضہ کرنے والوں کو رسول اللہ کے پاس جمع کرنا پڑا اور حسبِ ضابطہ ان میں تقسیم کیا گیا۔ ابو امامہ باہلی، عیینہ، عبادہ بن صامت (انصاری) سے مالِ غنیمت سے متعلق قرآنی آیتوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا یہ آیتیں ہمارے معنی اصحاً بدر کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جب ہم مالِ غنیمت کے استحقاق اور تقسیم کے بارے میں

۱۔ ابن کثیر ۳/۲، طبری ۲/۲۸۶

۲۔ ابن ہشام ص ۲۵۶



جھگڑنے لگے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آئے تھے، اس کے نتیجے میں  
خدا نے مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ سے نکال لیا اور رسول اللہ کے حوالے کر دیا اور انہوں نے  
اسے ہمارے درمیان مساویانہ تقسیم کر دیا۔ سَأَلْتُ عِبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ عَنِ الْأَنْفَالِ،  
فَقَالَ فِينَا مَعْشَرَ أَصْحَابِ بَدْرٍ نَزَلَتْ حِينَ اخْتَلَفْنَا فِي النَّفْلِ وَسَاءَتْ فِيهِ اخْلَاقُنَا  
فَنَزَعَهُ اللَّهُ مِنْ أَيْدِيْنَا فَجَعَلَهُ إِبْرَاهِيمَ بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ الْمُسْلِمِينَ عَنْ بَوَائِدِ مَالِ غَنِيمَتِ  
مِثْلَ سَوِيٍّ أَوْ نِصْفِ مِثْلِ سَوِيٍّ، تِسْعِينَ كَنْزًا، بَيْتًا مِنْ بَيْتِ بَدْرٍ، بَعْضُ مِقْدَارِ مِثْلِ كَمَالِ شَيْءٍ،  
بِاسْمِ اللَّهِ وَرِثَةِ سَامَانَ كَادَهُ زَيْفُو شَامِلٌ تَحَاوَاكَ بَرَقَرِيشِ بَدْرٍ كَيْسَ مِثْلِ مِثْلِ سَوِيٍّ  
لَا يُعْطَى تَحْتَهُ خَمْسَ كَنْزَاتٍ عِلَاقَةٍ جَوْ قُرْآنِي مُنَاطِلَةٍ كَيْسَ مِثْلِ مِثْلِ سَوِيٍّ كَوْنِ مِثْلِ سَوِيٍّ  
لِأَعْرَابِ دَسْتُورِ كَيْسَ مِثْلِ مِثْلِ سَوِيٍّ مَالِ غَنِيمَتِ سَوِيٍّ كَوْنِ مِثْلِ سَوِيٍّ لِيَسْتَكْرِ لِيَتَا تَحَا.  
كَنْزًا، أَوْ نِصْفِ مِثْلِ سَوِيٍّ، غِلَامٌ، كَنْزٌ، رَسُولُ اللَّهِ لَمْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ  
كَنْزًا، أَوْ نِصْفِ مِثْلِ سَوِيٍّ، غِلَامٌ، كَنْزٌ، رَسُولُ اللَّهِ لَمْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ  
رَسُولُ اللَّهِ لَمْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ يَكُنْ  
كَيْسَ مِثْلِ مِثْلِ سَوِيٍّ كَوْنِ مِثْلِ سَوِيٍّ لِيَسْتَكْرِ لِيَتَا تَحَا.  
تَحْتَهُ

### زیر مخلصی

قریش کے شر سے اوپر قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں مسلمان مختلف رائے تھے، ایک

۱ ابن ہشام ص ۳۵۶

۲ مغازی ص ۹۰، انساب الاشراف ۱/۲۹۰

۳ ابن سعد ۲/۱۸، ۱۹

۴ ایضاً ۲/۲۰

جماعت کی جس کے سرگرم ترجمان مہاجرین میں عمر فاروق اور انصار میں سعد بن معاذ تھے، رائے یہ تھی کہ ان سب کو اسلام اور رسول اللہ کی مخالفت کی پاداش میں قتل کر دینا چاہئے، دوسری جماعت جس کے پرچوش وکیل ابوبکر صدیق تھے سب کو چھوڑنے کے حق میں تھی، ان کی دلیل یہ تھی کہ قیدی رشتہ دار ہیں، ان میں سے کوئی رشتہ کا باپ ہے، کوئی چچا، کوئی تایا، کوئی بھائی اور کوئی بھتیجا، اس لئے مارنے کی بجائے ان سے زر مخلص لے لیا جائے اور یہ روپیہ نادار مہاجرین اور غریب نو مسلموں نیز رسول اللہ کے مخالفوں کی سرکوبی کے لئے اسلحہ اور دوسرا جنگی سامان فراہم کرنے پر صرف کیا جائے۔ رسول اللہ نے اس تجویز پر جو ان کی مرضی کے مطابق بھی تھی، عمل کیا۔ زر مخلص کے چار گریڈ مقرر ہوئے۔ دو ہزار روپے (چار ہزار درہم)، ڈیڑھ ہزار، ہزار اور پانچ سو، جس حیثیت کا آدمی ہوتا اس سے اسی حیثیت کا زر مخلص لیا جاتا، اس کے عزیز و اقارب مکہ سے آکر مقررہ رقم ادا کر کے اسے لے جاتے تھے۔ ستر سے اوپر ان قیدیوں میں سے تین کو رسول اللہ نے قتل کر دیا۔ عقبہ بن ابی معیط، نضربن حارث اور طعیمہ بن عدی، ان کی ذات سے مکہ میں رسول اللہ کو زیادہ اذیت پہنچی تھی، دو آدمیوں کو جو ان کے بھائی رشتہ دار تھے اور زر مخلص ادا کرنے سے قاصر رہا کر دیا، معدودے چند جو زر مخلص ادا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے دس دس انصاری بچوں کو لکھنا سکھا کر آزاد کر دئے گئے۔ زر مخلص کی مجموعی مقدار کے بارے میں ہمارے مآخذوں نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اندازاً اسے چالیس پچاس ہزار قرار دیا جاسکتا ہے۔

## فتح کی خبر کا اہل مدینہ پر اثر

فتحیاب ہوتے ہی رسول اللہ نے بلا تاخیر خوشخبری دینے کے لئے دو قاصد مدینہ بھیجے،

۱۔ ابن سعد ۲/۲۲، ۱۸

۲۔ مغازی ۱۳۴

۳۔ ابن سعد ۲/۲۲



ایک شہر کے بالائی محلوں اور دوسرا زیریں محلوں میں، ان میں سے ایک قاصد رسول اللہ کے لئے پانک زید بن حارثہ ان کی اونٹنی تصور پر سوار ہو کر آئے تھے، انھوں نے فتح کا اعلان کر کے قریشی اکابر کے نام لے لیکر کہا کہ یہ سب جنگ میں مارے گئے۔ مدینہ کے مہاجر، انصار، اوس و خزرج کے غیر مسلم، عبداللہ بن ابی کے تابع نائشی مسلمان اور یہودیوں کے لئے یہ خبر اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ اُسے باور کرنے کو تیار نہیں ہوئے، عام خیال یہ تھا کہ رسول اللہ کو شکست ہوئی ہے، زید بن حارثہ ان کی اونٹنی تصور پر میدان جنگ سے بھاگ کر آئے ہیں اور باقی ہزیمت خوردہ مسلمان عنقریب ان کے پیچھے پیچھے آتے ہوں گے۔ اوس و خزرج کے غیر مسلم، متذبذب نائشی مسلمان اور یہودی اس خیال سے بہت خوش تھے اور گلی کوچوں اور بازاروں میں اس کا چرچا کرتے پھرتے تھے۔ نائشی مسلمانوں کے لیڈر اس تصور سے محظوظ ہو رہے تھے کہ رسول اللہ میں نبوت کا زعم کم ہو جائے گا، وہ اپنی بے چون و چرا اطاعت پر اصرار نہیں کریں گے اور ان کی رائے کا پہلے سے زیادہ احترام کرنے لگیں گے، یہودی اکابر یہ سوچ کر مسرور ہو رہے تھے کہ شکست کے بعد رسول اللہ کی دعاگ نبوت ختم ہو جائے گی، اوس و خزرج کے قبیلے ان سے بظن ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور یہودی آزادی و سالمیت کو لاحق وہ خطرہ ٹل جائے گا جو رسول اللہ کی ہجرت سے یہودیوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

### بنو قینقاع کی جلاوطنی

نوید فتح پاکر بیشتر اہل مدینہ کے تاثرات کا بدر سے واپسی پر رسول اللہ کو علم ہوا تو ان کی طبیعت سخت مکدر ہوئی، ان کی رائے میں مدینہ کے غیر مسلم، متذبذب اور نائشی مسلمانوں میں اپنی نبوت کے عدم اعتراف یا بے چون و چرا اطاعت سے انحراف کی ساری ذمہ داری یہودیوں

پر تھی جنہوں نے انہیں نبی ماننے سے انکار کر دیا تھا، جو قرآنی آیتوں کا مذاق اڑاتے تھے، یہودی و عیسائی مذاہب اور انبیاء کے بارے میں قرآن کی بیان کردہ تصریحات غلط قرار دیتے تھے، جو رسول اللہ کے کاموں پر نقد کرتے، ان کے قول و فعل میں تناقض دکھاتے تھے، انہیں جھوٹا اور طالب حکومت بتاتے تھے اور اوس و خزرج کے اکابر سے ان کے خلاف ریشہ دو انیاں کرتے تھے۔ فتح بدر کو شکست تصور کر کے یہودیوں کی عالیہ شادمانی نے رسول اللہ کو بے حد مشتعل کر دیا۔ مدینہ کے تین یہودی قبیلوں میں سے دو۔ نصیر اور قرنطہ جن کے پاس وسیع زراعتی فارم اور نخلستان تھے، شہر سے باہر رہتے تھے اور تیسرا قبیلہ قینقاع جس کے پاس فارم اور نخلستان بہت کم تھے، مدینہ کے جنوب مشرق میں شہر سے بالکل متصل آباد تھا، قینقاعی یہودی تجارت اور دستکاری کے ذریعہ روزی کھاتے تھے، رسول اللہ نے قینقاع کے اکابر کو بلا کر کہا کہ میری نبوت کا اقرار کر کے اسلام لے آؤ ورنہ تمہارا انجام اس سے کہیں زیادہ برا ہوگا جیسا کہ بدر میں قریش کا ہوا ہے۔ اکابر نے کہا کہ ہم اپنے مذہب سے ہر طرح مطمئن ہیں اور کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑ سکتے، کسی کو زبردستی دوسروں کا مذہب بدلوانے کا کیا حق ہے۔ تمہاری یہ دھمکی کہ قریش سے زیادہ ہمیں نقصان پہنچاؤ تو یہ محض تمہاری خوش گمانی ہے، قریش کی نسبت ہمیں رٹائی کی زیادہ بصیرت اور تجربہ ہے۔ اس طاقا سے رسول اللہ اور یہودیوں کے تعلقات اور زیادہ تلخ ہو گئے، چند دن بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ قینقاع کو اپنا گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا۔ کوئی انصاری عورت ایک قینقاعی سنار کے پاس بیٹھی ہوئی زیور کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی کہ ایک یہودی نے ٹکیلی لکڑی لیکر پیچھے سے اس کی قمیص کا بند ڈھیلہ کر دیا، جب وہ اٹھی تو بند کھل گیا اور اس کا سینہ عیاں ہو گیا، یہودی اور اس کے ساتھی ہنسنے لگے۔ عورت نے شور مچایا، انصاری مسلمان آگئے اور ان میں سے ایک نے طیش میں آکر بند ڈھیلہ کرنے والے یہودی کو قتل کر دیا، اس کی چیخ پکار سے آس پاس کے یہودی



جمع ہو گئے اور انہوں نے مسلمان قاتل کو مار ڈالا۔ دونوں طرف بھیڑ لگ گئی اور بدکلامی ہونے لگی مسلمان یہودیوں کو دھکی دیتے اور یہودی مسلمانوں کو۔ بیعت عقبہ کے بعد جس کا دوسرا نام بیعت حرب بھی تھا، رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہودی قبیلوں (قینقاع، نضیر اور قرظہ) کو خطہ لاحق ہوا کہ جب وہ رسول اللہ کو بنی ماننے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں گے تو رسول اللہ انہیں قریش کی طرح اپنا دشمن قرار دے کر موقع پاتے ہی اوس و خرج کی مدد سے ان پر حملہ کر دیں گے، اس لئے انہوں نے رسول اللہ سے معاہدہ کر لیا کہ یہودی ان کے خلاف اور وہ یہودیوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کریں گے، نہ ایک دوسرے کے دشمنوں سے کسی جارحانہ کارروائی کے لئے ساز باز کریں گے۔ اپنے ہم مذہب کے قتل کے بعد یہودیوں نے مسلمانوں کو دھکی دی تو رسول اللہ نے محسوس کیا کہ قینقاع کے اکابر کی نیت خراب ہے اور وہ کسی وقت شہر کے غیر مسلم، متذہب اور نمائش مسلمانوں کا سہارا لے کر یا قریش کی مدد سے ان پر حملہ کر سکتے ہیں، رسول اللہ نے یہ صورت حال پیدا ہونے سے پہلے بنو قینقاع کا استیصال ضروری خیال کیا، ان کی موابدیک کی توثیق بذریعہ وحی ان الفاظ میں ہو گئی۔ **وَمَا تَخَافُ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَاِنْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰی سَوَاءٍ (انفال)** مگر تمہیں کسی معاہدہ قوم سے بد عہدی کا اندیشہ ہو تو تم بھی عہد و پیمان توڑ دو۔ رسول اللہ نے قینقاع کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، قبیلہ کے سب لوگ اپنی گڑھیوں میں جہاں خطرہ کے وقت پناہ لی جاتی تھی، بغیر لڑے محصور ہو گئے، اس کے بعد بھی انہوں نے کوئی فوجی کارروائی نہیں کی، بنو قینقاع کا خزیج کے اکابر سے باہمی مدد کا معاہدہ تھا، با اثر خزیجی لیڈر اور نمائش مسلمانوں کے سرگروہ عبداللہ بن ابی بن سلول سے قینقاعی اکابر کے خوشگوار تعلقات تھے، اس نے مصالحت کی کوشش کی لیکن رسول اللہ اور انصار کا جوان، جوشیلا اور ابھرنے کا آرزو مند طبقہ جو جنگ بدر میں رسول اللہ کے ساتھ لڑا تھا، مصالحت کے لئے تیار نہیں ہوا، دونوں کا مطالبہ تھا کہ بنو قینقاع غیر مشروط طور پر ہتھیار

ڈالیں، ان کے بالغوں کو قتل کر دیا جائے، بال بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی منقولہ وغیرہ منقولہ دولت آپس میں بانٹ لی جائے۔ قینقاعی اکابر کو بھرپور ستا کر ان کے حلیف و بہر و غیر مسلم خاندان نمائشی مسلمان نیز ان کے ہم مذہب نصیر و قرینہ ان کی مسلح مدد کریں گے لیکن ان میں سے کسی نے بھی جان اور ہتھیاروں سے ان کی مدد نہیں کی، غیر مسلم اور نمائشی مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے مسلح مدد کی تو شہر کی مسلمان اکثریت ان کا قلع قمع کر دے گی، نصیر و قرینہ کو معاہدہ توڑ کر مسلح مدد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، دس بارہ دن تک جب قینقاع کی مدد کے لئے ان کا کوئی حلیف، بہر و اور ہم مذہب نہیں آیا تو ان پر مایوسی چھا گئی، انھوں نے رسول اللہ کو مطلع کیا کہ ہم گھر بار چھوڑ کر جانے کو تیار ہیں، ہمیں بلا تعزین جلا وطن ہونے کی ضمانت دی جائے۔ رسول اللہ نے کہلا بھیجا کہ بلا شرط ہتھیار ڈالنے کے سوا تمھاری کوئی تجویز نہیں مانی جاسکتی۔ قینقاع کے حلیف اور بار سوخ خزر جی لیڈر عبداللہ بن ابی نے قینقاعی اکابر کو بلا شرط ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا اور اطمینان دلایا کہ وہ محمد کے ہاتھوں انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے دیں گے، قینقاعی اکابر نے گڑھیوں کے دروازے کھول دیے، ان کے بالغ مردوں کو جو سات سو تھے، گرفتار کر کے ہاتھ کندھوں کے پیچھے باندھ دیے گئے، رسول اللہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا، عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ سے سفارش کی کہ قینقاع کے بالغوں کو چھوڑ دیں، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئے، عبداللہ نے پیچھے سے ان کی زرہ بکتر کے کالر میں ہاتھ ڈال کر انھیں روکا اور کہا: محمد میرے حلیفوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، رسول اللہ کا چہرہ غصہ سے تھما اٹھا، انھوں نے مڑ کر کہا: چھوڑو مجھے، تمھارا برا ہو۔ عبداللہ: میں اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم میرے حلیفوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا وعدہ نہیں کر لو گے، یہ سانسو آدمی ہیں، تین سو زرہ پوش اور چار سو بغیر زرہ، انھوں نے عدایق اور بُعاث کی جنگوں میں ہر کالے گورے کے مقابلہ میں میری مدد کی تھی، تم بیک وقت ان سب کی گردن اڑانا چاہتے ہو، محمد اس کا انجام برا ہو گا۔ رسول اللہ: چھوڑ دو قیدیوں کو اُن پر اور اس پر



خدا کی لعنت۔ جلا وطن ہونے کے لئے رسول اللہؐ نے قینقاع کو تین دن کی مہلت دی، شہر کے لوگوں کے پاس ان کے قرضے تھے جن کی وصولی کے لئے قینقاعی اکابر نے مہلت میں توسیع چاہی جو منظور نہیں کی گئی۔ تین دن کی مقررہ میعاد ختم ہونے پر انھیں شہر بدر کر دیا گیا۔ رسول اللہؐ نے انھیں اپنے ہتھیار، زروسیم اور بیشتر سامان لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس دولت کا خمس لے کر مابقی رسول اللہؐ نے محاصرہ کرنے والوں میں تقسیم کر دیا، مال و دولت کی تقسیم سے پہلے انھوں نے سہم صبی کے نام سے ..... چیزیں اپنے لئے منتخب کیں۔ تین کمانیں، دو زرہیں، تین تلواریں اور تین نیزے۔ بنو قینقاع کا قافلہ مدینہ سے چل کر ستراسی میل شمال مغرب میں وادی القریٰ کی یہودی بستی میں اترا، مقامی یہودیوں نے چندہ کر کے ان کے ضرورت مندوں کے لئے سواری اور زاد راہ کا انتظام کیا، کچھ دن ٹہرتے کے بعد بنو قینقاع اپنے آبائی وطن شام چلے گئے۔

(باقی)

۲۸ مغازی سنہ

## اخبار التنزل

قرآن اور حدیث کی پیشین گوئیاں

تالیف : مولانا الحاج محمد اسماعیل صاحب سنہلی

اس کتاب میں قرآن پاک اور فرمودات نبویؐ کی پیشین گوئیاں ہزار انداز میں جمع کر دی گئی ہیں۔ قرآن مجید اخبار غیب کا حامل ہے اس کی یہی خصوصیت اس کے کلام الہی ہونے کے دلائل میں ایک روشن دلیل بلکہ برہان قاطع ہے۔ ان کے مطالعہ سے ایمان میں تازگی، خشک اور قرآن کے کلام الہی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں یقین و اذعان پختہ ہوگا۔ تقطیع متوسط ۱۸/۲۲، صفحات ۱۳۴

قیمت بلا جلد - ۵/- مجلد - ۶/-

ملنے کا پتہ : ندوۃ المصنفین اردو بان اس جامع مسجد دہلی ۷

# ڈراوڑی دور میں تہذیب و ثقافت

اور

## صنعت و تجارت کا تدریجی ارتقار

(۱)

از جناب سید امین الدین صاحب جلالی شاہ جہا پوری

ہندو قدیم نے تہذیب و ثقافت، علوم و فنون اور صنعت و تجارت میں جو تدریجی ارتقا حاصل کیا اس کو متعدد ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ابتدائی اور بنیادی دور، ڈراوڑی دور کے نام سے موسوم ہے۔ مغربی مورخین کی اکثریت نے دنیا کو یہ باور کرائے میں پورا زور قلم صرف کر دیا کہ ایرین سے پہلے یہاں کی نضامیں جہل و بربریت کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہر طرف صحرائیت و بدویت کے آثار نمایاں تھے لیکن انیسویں صدی عیسوی کی کھدائیوں نے ان کے سوچے سمجھے مقصد کی تکذیب کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ایرین سے پہلے ڈراوڑ نام کی ایک تمدن قوم یہاں آباد تھی جس کا معیاری تمدن ایرین تمدن بھی بعض صورتوں میں افغ اور اہل تھا اسی بنا پر بعد کی ہمہ گیر ترقیوں کا سلسلہ انہی خطوط پر قائم ہوا جن کی بنیاد، تمدن دوست ڈراوڑوں نے ڈالی تھی، یالیوں سمجھئے کہ ان کا ذوق صنعت و تجارت اور برجانات تہذیب و ثقافت آنے والوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

قدیم ڈراوڑوں یا اہل تامل کے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے دلچسپی کے جو تھوڑے بہت حالات، ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق و تلاش کے علاوہ یونانی و رومی مورخین کے اشارات و حوالہ جات



اور خصوصاً جنوبی ہند کی بعض دستیاب شدہ کتابوں سے ہم تک پہنچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وراٹر قوم ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کی مالک تھی، ان کے تاجر سمیریہ، بابل اور مصر وغیرہ سے تجارت کرتے تھے اور ان کے شہر و قصبات بارونق اور خوب صورت تھے، مصنف تاریخ گجرات پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی کے الفاظ میں ”یہ مہذب قوم جس نے ایرین کی آمد سے بہت قبل گجرات، سوراٹر اور ملک کے دوسرے ساحلی مقامات کی بندرگاہوں سے اپنا تجارتی سلسلہ دور دور تک پھیلا رکھا تھا اگرچہ ہر لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم تھی لیکن ایرین کی سماجی نا انصافیوں کے باوجود وہ یہ خود اپنے کو ذلیل و خوار سمجھنے لگی تھی۔“ ڈاکٹر بلر کی تحقیق کے بموجب جس وقت ہندی علاقوں کے موتی، مرجان اور گرم مسالے وغیرہ اقطاع عالم کے تاجروں کو ہند آنے کی دعوت دے رہے تھے اس وقت یہ قوم تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج پر پہنچی ہوئی تھی، اس کے یہاں علمی، فنی اور ادبی تصانیف کا گراں بہا ذخیرہ موجود تھا اور بقول موصوف اگر آج وہ کتابیں موجود ہوتیں تو ظن و تخمین کے بجائے اس قوم کے تمدن کا پتہ اسی آسانی سے لگایا جاسکتا تھا جیسے رگ وید کے مطالعہ سے ایرین تمدن کا حال معلوم کیا گیا ہے، چونکہ قدیم تامل زبان معدوم ہو چکی تھی اس لئے اس زبان کی کتابوں کا معدوم ہو جانا بھی ایک نظری امر تھا لیکن آج اس تمدن کے مدفون خزانے زمین اگل رہی ہے جن سے اس برباد شدہ تمدن کے صحیح خدو خال نظروں کے سامنے آ جانے کی پختہ امید کی جاسکتی ہے۔ وراٹر لوگوں کی آبادیاں وادی سندھ سے لے کر ہند کے تقریباً سب ہی حصوں میں پھیلی ہوئی تھیں جو متفق علیہ طور پر ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی مالک تھیں ان کے تمدنی آثار اور تہذیبی نشانیاں ایرین کی آمد کے کافی عرصہ بعد تک موجود رہیں لیکن دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح ایرین نے بھی ان کی تہذیبی عمارت منہدم کر کے ایک نئی تہذیبی عمارت کی بنیاد رکھی جس کے نتیجے میں پیشرو کے تمام تہذیبی آثار نظروں سے ایسے اوجھل ہوئے کہ دنیا کو یقین آگیا کہ ایرین سے پہلے یہاں تمدن آشنا اور تہذیب دوست قوم آباد ہی نہ تھی

اس مغالطہ وہی میں مغربی ممالک خصوصاً برطانوی دور کی درسیہ تاریخوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک پوری دنیا مذکورہ مغالطہ پر قائم رہی حتیٰ کہ یہ مغالطہ ایک حقیقت سا بن گیا۔ خدا بھلا کرے ماہرین آثار قدیمہ کا جنھوں نے کھدائیوں کے نتائج سے اس طلسم باطل کا پردہ چاک کر کے حقیقت کی رونمائی کی لیکن برطانوی دور کی تاریخوں کا پھیلایا ہوا زہر ذہن دشوور کو اتنا ماؤف کر چکا تھا کہ ابتداءً ان انکشافات و نتائج سے بھی صرف نظر کیا گیا مگر کھدائیوں کا تسلسل اور ان سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار، ان زہریلے اثرات کو زائل کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور آخر میں ان منکرین کو بھی اصل حقیقت و اصلیت کا اقرار و اعتراف کرنا پڑا۔

اس قدیم تہذیب کی دریافت کا اولیٰ سہرا سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ اور ان کے متعدد ملکی اور غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ کی ان تھک کوششوں کے سرے ہیں جن میں سر ایگنڈر گنگم، ایچ ایس والس، کے این ڈکسٹ، دیارام ساہنی اور مدار کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ڈراوڑی تہذیب و تمدن کی بیش بہا دولت ہنوز زیر زمین مدفون ہے، کھدائیوں کی تکمیل اور مدفون آثار برآمد ہونے کے بعد ہی کوئی جچا ہوا فیصلہ منظر عام پر آ سکتا ہے، بہر حال کھدائیاں مکمل ہوں یا نامکمل لیکن اس حقیقت سے سرمو انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ ایرین کی آمد سے صدیوں پہلے فضائے ہند پر ڈراوڑی تہذیب و تمدن کا مہر ہنوز پدی تابناکی سے روشن ہو چکا تھا بلکہ اس نے ایک نوع کی ارتقائی صورت بھی اختیار کر لی تھی۔

ہند کے یہ قدیم ترین باشندے یعنی ڈراوڑ کون تھے، کہاں سے آئے، کب آئے، کس نسل و قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ ان سوالوں کے جواب ہنوز تشہید تکمیل ہیں، صرف اتنا وثوق سے سے کہا جاسکتا ہے کہ ایرین سے ان کا کوئی سابقہ قبائلی رشتہ اور تعلق نہ تھا، ان کی قدیم تاریخ کا صحت مندانہ حال معلوم کرنا اس قدر مشکل ہے جس قدر خود ہند کی تاریخ کا پتہ چلانا۔ لیکن انسان کی تلاش و جستجو، فکر و طلب اور چھان بین کا تسلسل بہت سے طرز ہائے سربستہ کی گرو کشائی کر چکا ہے بنابرین اس میں بھی (اس نے بہت کچھ ایسی معلومات حاصل کر لیں جنہیں



کے تنگ دائرہ سے نکل کر یقین دادِ اعلان کی وسیع حدود میں آچکی ہیں بقول مصنف تاریخ گجرات مولانا سید ابوالوفیر ندوی پتھر اور لوہے کے زمانہ کے بعد اس ملک کی غالب اکثریت ڈراوڑ کی تھی۔ مصنف مذکور نے غالب اکثریت کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ موصوف کے نزدیک ڈراوڑ کے علاوہ اس ملک کے صحرائی اور پہاڑی خطوں میں اور بھی متعدد قومیں اقلیتی صورت میں موجود تھیں جن میں بھیل، گونڈ و اور سنتھال نام کی اقلیتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی جو ڈراوڑوں کے مقابلہ میں ہر پہنچ سے پس ماندہ، تہذیب و تمدن سے نا آشنا، علوم و فنون سے بے بہرہ تھیں لیکن اکثر مورخین کے نزدیک یہ سب قبائلی سلسلے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے یعنی لہذا یہ سب ڈراوڑ ہی تھے لیکن اپنی معاشرتی پس ماندگی کی بنا پر دسوں طبقوں میں منقسم ہو گئے تھے، چونکہ یہ زیادہ تر دشت و جبل میں بود و باش رکھتے تھے، زریور تعلیم سے عاری اور عقل و شعور میں کم مایہ اور خستہ حالی میں اپنی نظیر آپ تھے اس لئے ساحلی اور شاداب میدانی خطوں میں رہنے والے باشعور ڈراوڑوں نے خود ہی اپنے نسل و قبیلہ کے لاکھوں افراد کو ازراہ تحقیر مذکورہ ناموں سے پکارنا شروع کر دیا تھا اور بعض کے خیال میں ان کی بدویت اور پس ماندگی کی بنا پر زمانہ مابعد میں یہ نام رکھے گئے، مذکورہ برتری اور پس ماندگی کے فرق کو آج کے آئینہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، اول الذکر زریور تعلیم سے آراستگی کے باعث بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور موخر الذکر مہنوز پس ماندگی اور جہالت و غربت کی دلیل میں بھنسے ہوئے ہیں، اس صحرائیت اور جہالت کی منہ بولتی تصویر مدھیہ پردیش اور بندھیا پل کے پہاڑی دامن میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈراوڑوں کی صحیح تاریخ کا علم تو دور کی بات رہی، یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اُس عہد میں یہ حسن بدامان ملک کس نام سے موسوم تھا، تاریخ کی زبان بھی اس سلسلے میں ساکت و خاموش ہے اور نہ کھدائیوں نے اس سلسلہ میں کوئی رہ نائی کی ہاں کچھ صوبہ جاتی اور علاقائی ناموں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ایرین ڈراوڑوں کی بود و باش کی جگہوں کو ازراہ تمسخر ارنی کہتے تھے جس کے معنی جنگل اور صحرا کے ہیں چونکہ یہ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے میدانی اور مرغزاری علاقوں کو چھوڑ کر غیر آباد کوہستانی علاقوں

میں جا بے تھے اس لیے ایرین نے معنویت کے لحاظ سے ان کے علاقوں کی یہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ آج بھی بعض ریاستوں کے سررشتہ مال کے کچھ کاغذات سے اس کی تصدیق ہوتی یعنی صحرائی اور غیر زرخیز زمینوں کو ”آرنی محال“ کہا جاتا ہے۔ ایرین کی اس علاقائی تقسیم سے اس ملک کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایرین نے اپنے مفتوحہ علاقہ کا کیا نام دے رکھا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں جو سیر حاصل بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

”عربوں کی آمد سے قبل اس پورے ملک کا کوئی نام نہ تھا بلکہ ہر صوبہ کا نام الگ تھا اور بیرون ملک ہر ریاست کا نام اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا، اہل فارس نے جب سندھ پر قبضہ کیا تو دریائے سندھ کی موجودگی کی وجہ سے اس صوبہ کا نام سندھو رکھا۔ موصوف کے نزدیک سندھو کے بجائے ہندھو نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قدیم فارسی اور سنسکرت میں حرف ص اور کا کو آپس میں بدل لیتے ہیں اس لئے انھوں نے اس کو ہندھو کہہ کر پکارا، لیکن عربوں نے دریائے سندھ کی مناسبت سے اس صوبہ کو سندھ ہی کہا اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا اور آخر میں یہی نام پورے ملک کیلئے تمام دنیا میں مختلف صورتوں سے پھیل گیا اور کاحرف الف ہو کر فرنج میں انڈا، اور اس کی مختلف صورتیں ہو کر تمام دنیا میں مشہور ہو گیا اور خیر سے آنے والی قوموں نے ہندوستان نام سے اس کو پکارا جو فارسی تلفظ میں ہندوستان ہو گیا۔“

نتیجہ یہ اور سنہا ایڈیٹر روہیکھنڈا اخبار نے بھی جو کچھ سپرد قلم کیا ہے اس سے بھی مذکورہ سطور کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ ایڈیٹر موصوف لکھتے ہیں کہ

”اس ملک کو یہ نام عربوں ہی کا دیا ہوا ہے اگر وہ اس ملک میں نہ آئے ہوتے تو یہ ملک

۱۔ تاریخ گجرات از مولانا ابوظفر ندوی

۲۔ عرب و ہند کے تعلقات



ہندوستان کے بجائے جنوبی ایشیا یا ایسے ہی کسی نام سے پکارا جاتا اور اس میں بے شمار  
خود مختار اور آزاد ریاستیں ہوتیں۔“

تاریخی حیثیت کے ساتھ ڈراوڑوں کی اصلیت اور وطنیت کے بارے میں بھی علمائے تحقیق متفق رائے  
نہیں، کچھ محققین کا خیال ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں پائے جانے والے دروں سے یہاں  
آئے اور بعد کو جنوبی ہند پہنچے اس خیال و فکر کے سب سے بڑے مؤید ڈاکٹر ہنٹر ہیں بعض کے  
نزدیک یہ ہندوستان ہی کے اصل اور قدیم ترین باشندے ہیں اور جنوبی ہند ان کا اصل اور بنیادی  
وطن ہے اور یہیں سندھ دہلی، بلوچستان اور شمالی ہند میں پھیلے، دلیل یہ ہے کہ ڈراوڑ یا ڈراوڑ  
جنوبی ہند کے تامل علاقہ کا قدیم نام ہے جہاں کے رہنے والے تامل تیلگو، کنڑ اور ملیالم زبانیں  
بولتے ہیں۔ ایک اور نظریہ کے مطابق ان کی اصل آبادیاں خصوصی طور پر وادی سندھ، پنجاب  
اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور ایک مخصوص تہذیب کی مالک تھیں لیکن  
ایرین فتوحات کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے تحفظ کی خاطر مذکورہ علاقوں سے نقل مکانی کیے  
جنوبی ہند کے تمام علاقہ کو اپنا مسکن بنالیا اور اس جگہ چیرا، چولا اور پانڈیہ نام کی تین طاقتور  
حکومتیں بھی قائم کر لیں، یہ تجارتی میدان میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ روم، مصر اور مشرق  
وسطی کے علاقوں سے ان کا تجارتی رابطہ بھی قائم ہو گیا تھا اور اس رابطہ کو مستحکم بنانے کے لئے  
انھوں نے ایک مضبوط تجارتی بیڑہ بھی تیار کر لیا تھا۔ اشوک کے زمانہ تک ان حکومتوں کا وجود  
ملتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ نہ جنوبی ہند سے سندھ دہلی اور بلوچستان وغیرہ پہنچے  
اور نہ شمال مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے بلکہ یہ ایک ہی قوم و نسل تھی جو ہند کے  
دوسرے میدانی، کوہستانی اور ساحلی مقامات کی طرح سندھ دہلی، بلوچستان، پنجاب اور کاٹھیاواڑ  
میں قدیم سے آباد تھی، چونکہ ہر حصہ کے باشندوں کے مذہبی تصورات اور طرز معاشرت وغیرہ  
میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا رفرما تھی اس لئے مجموعی طور پر اس قوم کا نام ڈراوڑ رکھ دیا گیا اس  
نظریہ اور خیال کے بہت سے علمائے تحقیق مؤید نظر آتے ہیں۔ وادی سندھ کی حالیہ علاقائی

کھدائیوں سے مختلف قسم کے انسانی ڈھانچوں کی دستیابی نے علمائے تحقیق کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو اندازے قائم کئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف جنوبی ہند کے بسنے والے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کے ڈراوڑ، رومی اور آسٹریلین نسلوں کا مرکب ہیں کیونکہ دستیاب شدہ ڈھانچے علامات کے اعتبار سے بحر روم کے علاقائی خطوں کے باشندوں سے ملتے جلتے ہیں اور بعض آسٹریلین نسل کے باشندوں کی علامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کچھ اہل فکر و نظر نے اس سے مانا جلتا مگر زیادہ صاف اور واضح نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بحر روم کے علاقوں سے تعلق رکھنے والی نسل نے آسٹریلوی نسل پر حاکمانہ قبضہ و اقتدار حاصل کر لیا بعد کو یہ نسل جو اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی لائی تھی پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور آخر میں ان دونوں نسلوں کے باہمی اختلاط سے جو نسل عالم وجود میں آئی وہ ڈراوڑ نسل کے نام سے موسوم و مشہور ہوئی، اس نظریہ کے ساتھ دستیاب شدہ ڈھانچوں سے بعض مفکرین کا یہ فیصلہ بھی نظر کے سامنے آجاتا ہے کہ ہڑپا، موہنجو ڈارو، ڈراڈا اور حبٹ پٹ کے وسیع علاقوں کے رہنے والے آسٹریلین نسل سے اور وادی سندھ کے باشندے بحر رومی علاقوں کے باشندوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان تمام وطنی تفصیلات اور تخمینہ کاوشوں کے مقابلہ میں اکثریت کا یہ فیصلہ زیادہ صحت مندانہ اور قرین عقل ہے کہ ڈراوڑ ہند کے اصل باشندے ہیں اور جنوبی ہند کا علاقہ ان کا بنیادی وطن ہے اور یہیں سے ہند کے تمام علاقوں میں پھیل کر انھوں نے تہذیب و تمدن اور صنعت و تجارت کے تمام ارتقائی منازل طے کئے اور ڈاکٹر ہنڈ کا یہ نظریہ کہ ڈراوڑ تورانی النسل ہیں اور ایرین سے ہزاروں سال پہلے وہ شمالی مغربی دروں سے ہند میں داخل ہوئے قطعاً غلط تصورات پر مبنی ہے اور اسی کے ساتھ اس نظریہ کا بھی بطلان ہو جاتا ہے کہ قدیم آسٹریلین اور بحر رومی علاقوں کی سندھ دہلی میں آباد نسل کے باہمی اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی۔



تہذیب و تمدن کی خشت اول اسی وقت رکھی گئی تھی  
ڈراوڑی تہذیب و تمدن کی قدامت اور تقابل | جب انسان نے اس عالم رنگ و بو میں قدم رکھا  
 اور زندگی گزارنے کے مختلف اقدامات کئے جوں جوں انسانی شعور آگے بڑھتا گیا تہذیبی پورے  
 کی نشوونما میں تیزی آتی گئی۔

جدید جبریااتی دور کی تدبیر بھی ترقی میں ہر ملک نے کیساں پیش رفت نہیں کی، کوئی ملک ذہنی شعور  
 میں آگے بڑھ گیا اور کوئی پس ماندہ رہ گیا۔ مصر و بابل، چین و ایران اور یونان و روم میں سے ہر ایک  
 اولیت کا مدعی ہے لیکن اہل ہند کا اصرار ہے کہ عقل و شعور کی دنیا میں ان کے قدم سب سے آگے  
 ہیں یعنی تہذیب و تمدن کا مہر منور سب سے پہلے مطلع ہند پر نمودار ہوا۔ تہذیب کشکش حیات میں ایک  
 مستقل جدوجہد کا نام بھی ہے جس طرح زندگی بڑھاپے سے نبرد آزمائی کے لئے اپنے میں خاص توانائی  
 و تازگی بہم پہنچانے کی کوشش کرتی ہے اسی طرح تہذیب کو بھی اپنے بقا و استحکام کے لئے نئے خون اور نئے  
 مکان کی ضرورت پیش آتی ہے اگر وہ ایک جگہ سے سٹی ہے تو دوسری جگہ ابھرتی ہے، اگر حادث ایک جگہ  
 سے اس کو ظلمت و تاریکی کے گہرے بادلوں میں چھپا دیتے ہیں تو دوسری جگہ وہ اپنا حسین و دلکش چہرہ  
 بے نقاب کر دیتی ہے، غرض اس کے ابھرنے اور بٹٹنے کا چکر دنیا کی گردش کے ساتھ قائم رہا ہے،  
 یہ آغوش محبت میں پرورش پاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے، دشمنی اور عناد کی گود میں اس کا دم گھٹنے  
 لگتا ہے، اس کا نظر نواز چہرہ جب گرد و دُور سے متغیر ہو جاتا ہے تو یہ خوش آمدید کہنے والی آغوش  
 کی زینت بن جاتی ہے، جب اہل مصر کی نا اہلیت اس کی طبع نازک پر گراں گزری تو یہ اہل بابل کی زینت  
 آغوش بنی، جب یہاں قدر ناشناسی کا اظہار ہوا تو یہ کبیدہ خاطر ہو کر آشوریوں کی محبت بھری  
 آغوش میں جا بیٹھی، انھوں نے جب تک اس کی نازبرداری کی تو اس نے ارض آشور کو اپنی سدا بہار  
 رنگینیوں سے کف گل فروش اور دامن باغبان بنادیا۔ اسی طرح یہ دنیا کے ہر ملک میں پہنچی اور  
 قدر دان کے وقت تک موجود رہی اور ناقدری کا شکار ہوتے دیکھ کر اس نے اپنا روشن اور مسکراتا ہوا  
 چہرہ چھپا لیا۔ غرض یہ عروس ہزار عشق بڑی تنگ مزاج واقع ہوئی ہے، اس کی تنگ مزاجی کے

نازد و غزے جس نے خندہ پیشانی سے اٹھلے اس سے وفاداری کا تعلق اس نے کبھی نہ توڑا اور جس جانب سے ناقدی کا زامسا بھی اٹھا پایا اس طرف ٹکڑ بھی نہ دیکھا۔ ڈراوڑوں نے اس سے جو دشتہ الفت جوڑا تھا اس میں دن و دن رات چوگنی ترقی کے ساتھ استحکام بھی پیدا ہوتا گیا۔ ایرین نے اس تک مزاج ہزار عشوہ کو محبوبیت کے سارے انداز بخشے جس سے اس کے رخ زیب میں ہونے انداز دل ربائی پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ یہ اسی قدر شناسی اور محبت کا نتیجہ ہے کہ مرور زمانہ کے اثرات بد سے تہذیب ہندی کی عمارت نہ صرف محفوظ و مصون رہی بلکہ ہر دور میں اس عمارت کے نقش و نگار اور آراستگی میں اضافہ ہوتا گیا۔

دراوڑی تہذیب و تمدن کے آغاز کا زمانہ آثار تہذیبی کے مبعین نے تین ہزار سے پانچ ہزار قبل مسیح تک لگایا ہے، چونکہ دراوڑوں نے جدید حجری دور کے ختم ہی سے اس طرف عنان توجہ منعطف کر دی تھی اس لئے ہند میں تہذیب و تمدن کا آغاز چھ ہزار قبل مسیح متعین کیا گیا ہے غالباً انہی شواہد کی بنا پر پروفیسر ہالوں کبیر مرحوم نے ۱۹۰۷ء کے ایک شائع شدہ مضمون میں ہندی تہذیب کا بنیادی دور چھ ہزار قبل مسیح قرار دیا ہے، پروفیسر موصوف کی اس رائے کو دیگر اہل الرائے نے بھی جس میں سابق صدر جمہوریہ راجندر پرشاد آنجہانی بھی شامل ہیں حقیقت سے تعبیر کیا ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ جس وقت مصر کے شہنشاہ زوسر نے سب سے پہلے اہرام اود شہنشاہ خوفو نے خزہ میں بڑے اہرام کی بنیاد ڈالی تھی اس وقت یہاں تہذیب پیش روی نقطہ عروج پر تھی اور صنعتی و تجارتی ترقی شباب پر تھی۔

ثقافت بنیادی طور پر ایک ذہنی صفت ہے اور اسی کے ساتھ معاشرت علمی اور ثقافتی پیش رفت | تہذیب سے بشری فکر کا جوڑا جانچہ تیار ہوتا ہے اسے بھی ثقافت کا نام دیا جاسکتا ہے، تہذیب و معاشرت کا مرکز مادی اشیاء سے اور ثقافت کا مرکز ذہن و دماغ کی



فکری قوتوں سے ہے اور ان لکری قوتوں کے بطون سے شاعری، مصوری، نقاشی، ادب و تنقید، تلاش و تحقیق، سائنس و فلسفہ اور موسیقی وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔ ثقافت قوم کی تہذیبی اور نظریاتی بنیادوں کی مکمل عکاس ہوتی ہے حقیقت میں ثقافت ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں قوم کی اخلاقی کیفیت کا صحیح عکس نمایاں ہوتا ہے ثقافت کی تنظیم اگرچہ خود ریاست کی مقررہ حکمت عملی کے تحت ہوتی ہے لیکن اخلاقی اقدار کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اخلاقی اقدار کا فقدان کسی نظام حیات کو برباد کر سکتا ہے تو ثقافت کو بھی تباہی میں ڈال سکتا ہے کیونکہ قوم کے اخلاقی بگاڑ سے سب سے پہلے اس کی ثقافتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔

ڈراوڑوں کی ثقافتی اور علمی پیش رفت کا پتہ کھدائیوں کے نتائج، ظن و تخمین، زمانہ مابعد کے نوشتہ جات، قدیم یونانی و رومی اور عرب محققین کی تحقیق و تلاش کے علاوہ ڈراوڑوں کی قدیم ترین علمی تصانیف کی دستیابی سے بھی لگایا گیا ہے۔ بدیہی قرائن سے رسم الخط کی موجودگی کے ساتھ ان کی عام تحریری واقفیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ قرائن ان مہروں کی دستیابی سے یقیناً اذعان سے بدل جاتے ہیں جو ڈراوڑ برآمد ہونے والے کپڑوں پر اپنے ناموں کے بجائے لگایا کرتے تھے لیکن رسم الخط کی نوعیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس وقت کے ترقی یافتہ تہذیبی ملکوں میں دو قسم کے رسم الخط جاری تھے، تصادیری اور علامتی، اس لئے قیاس کہتا ہے کہ انہی دو میں سے کوئی ایک ہوگا، حروف تہجی پر مبنی رسم الخط کے بانی یا موجد فیثقی عرب کہے جاتے ہیں جو فلسطین اور شام و لبنان کے سواحل پر آباد تھے اور اپنی بحری تجارت کے اعتبار سے ایک طرف وہ افریشیائی علاقوں پر اثر انداز ہوتے تھے اور دوسری طرف ان کا تہذیبی رنگ یونان تک پھیلا ہوا تھا، بدیہی وجہ اہل قیاس کے نزدیک ڈراوڑی رسم الخط بھی ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ ان کے حروف تہجی کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس وقت کے حروف

تہجی کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی اس لئے آرڈی بنزجی اور سرجان مارشل کے متفقہ قیاس کے بموجب بابلیوں کے حروف تہجی کی طرح ڈراوڑی حروف تہجی کی تعداد بھی ڈھائی سو سے کم نہ تھی بابلیوں کا خط منحنی بھی اس تعداد کے ساتھ حمورابی کے زمانہ تک جاری رہا۔ اس سے ان دونوں ماہرین آثار قدیمہ نے یہ رائے قائم کی ہے جو بڑی حد تک قرین عقل ہے۔ دادی سندھ، گجرات جنوبی ہند اور بنگال کی حالیہ کھدائیوں سے جو مہر میں دستیاب ہوئی ہیں ان سے علامتی اور ابجدی دونوں رسم الخطوں کی نشاندہی ہوتی ہے اس سے بعض اہل قیاس نے اندازہ لگایا ہے کہ ابتدا میں علامتی رسم الخط مروج ہوگا اور بعد کو ابجدی سلسلہ شروع ہوا۔ فادر ایچ ایس ہیراس نے مختلف حصوں سے دستیاب شدہ مہروں کو پڑھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ ڈراوڑی رسم الخط ابتدا ہی سے حروف تہجی پر مبنی تھا اور ان کی زبان موجودہ تامل زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ ڈاکٹر بولہر نے بڑی تحقیق کے بعد جو مبصرانہ رائے قائم کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

”آئین کی آمد سے تین سو سال قبل تک ڈراوڑوں کی اصل زبان پھوٹ کر تامل، تیلیگو،

کنڑ اور ملیالم وغیرہ میں منقسم نہیں ہوئی تھی بلکہ سارے جنوبی ہند میں اس وقت صرف

ایک ڈراوڑی زبان بولی جاتی تھی جسے ہم سہولت کی خاطر تامل کہہ سکتے ہیں۔“

بعض مبصرین کے نزدیک ڈراوڑوں کی اصل زبانیں جغرافیائی حد بندیوں کے فرق کے ساتھ ہی تھیں

جو آج ترقی یافتہ شکل میں جنوبی ہند میں بولی جاتی ہیں لیکن مبصرین کی اکثریت ڈاکٹر بولہر کے ہم خیال و

ہم رائے ہے۔ چنانچہ فادر ایچ، ایس ہیراس نے ہڑپا کی مہروں کو پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہڑپا کے

وسیع علاقہ اور سندھ و دلی کی عام زبان صرف تامل تھی، ساتھ ہی موصوف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ سنسکرت

میں ڈراوڑی زبان کے متعدد حروف کی آوازیں شامل ہیں چنانچہ زمانہ مابعد کے علمائے تحقیق نے

ٹ، ڈ اور ڈک کی آوازوں کو متعین و مشخص بھی کر دیا ہے کہ یہ اصلاً ڈراوڑی آوازیں ہیں۔ اس تمام

تحقیق و تلاش کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ فنیقیوں کی مسلسل آمد و شد سے بہت

پہلے ڈراوڑ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف ہو چکے تھے اگرچہ تمام دستیاب شدہ اشیاء میں کسی



تصنیف کے دستیاب ہونے کا ثبوت نہیں ملتا لیکن مختلف علمائے تحقیق کی جو کاوشیں نظروں کے سامنے آئی ہیں ان کو ترتیب دینے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ فطرت کی صحیح فحشی کی بنا پر تصنیف کا آغاز اسی سرزمین علم و حکمت میں ہوا یعنی دنیا کی پہلی کتاب ارض ہند میں عالم تصنیف میں آئی چنانچہ مولانا غلام آزاد بلگرامی نے مشہور تصنیف ”غزلان ہند“ میں شیخ علی رومی کی تصنیف ”تھامرا لادائل و مسائر الاواخر“ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے :

”اول موضع وضعت فیہ الکتب والفجرت منه نیایع الحکمة

کان الہند۔“

یعنی سب سے پہلے جس سرزمین پر کتاب لکھی گئی اور جہاں سے علم و حکمت کا چشمہ پھوٹا وہ ہندستان ہے۔

حضرت امیر خسرو نے اپنی مثنوی ”نہ سپہر“ میں علمی اور ایجاد کی اولیت کے بیان میں تصنیفی اولیت کا سہرا اہل ہند کے سر باندھا ہے۔ تاریخی اوراق میں حضرت علی سے بھی منسوب ایک ایسا فقرہ ملتا ہے جس میں ہند کو اولین تصنیف کا گھر کہا گیا ہے۔ عرب کے مشہور مکلم اور مشہور فلاسفر ابن جلیظ نے اپنے مرتبہ رسالہ ”ساکنان عالم کے ذہن و دماغ کی کیفیات“ میں دلائل عقلیہ کی روشنی میں ذہن ہندی کی ایجاد اور تخلیقی قوتوں کو رنجم ثابت کیا ہے۔ ان بیانات کی روشنی میں پہلی تصنیف کا دعویٰ ایرین نہیں کر سکتے کیونکہ ایرین اپنے دسویں دور کے بعد ہی فن تحریر سے واقف ہو کر اپنے کاروبار کھاتے لکھنے کے قابل ہو سکے تھے۔ ایرین اور یونانی تہذیب کا نقطہ آغاز و عروج ایک ہی ہے اور ان دونوں تہذیبوں سے پہلے دجلہ و فرات کی شاداب وادی میں بابل نام کی ایک تمدن آشنا حکومت قائم تھی جس کے ایک مشہور حکمران حمورابی کا دوسرا بچا سی دغوات پر شتل ایک دستوری اور قانونی مسودہ تصنیفی سلسلہ کی موجودگی

ظاہر کرتا ہے اور اس سے بھی قبل پادری مان تھیو "MANTHEW" کی تصانیف اور قدیم یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کے بیان سے سرزمین فراعنہ میں متعدد علوم و فنون پر تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ ان تمام شواہد سے اہل فکر نے اندازہ لگایا ہے کہ ایرین دور سے بہت پہلے دنیا کے مختلف تمدن ممالک میں تصنیفی سلسلہ کا آغاز ہو چکا تھا اس کے باوصف ان تمدن آشنا ممالک کی کسی تصنیف کو اہل تحقیق نے دنیا کی اولین تصنیف میں شمار نہیں کیا اس سے بدیہی طور پر یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کی پہلی کتاب ڈراوڑی عہد میں تصنیف ہوئی لیکن اس کے موضوع فکر کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ڈراوڑوں کے علمی ذوق کا صحیح اندازہ جنوبی ہند کی مختلف ریاستوں کی علمی پیش رفت اور فن تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایرین کے فاتحانہ دباؤ کی وجہ سے ڈراوڑ جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں جمع ہو گئے تھے جہاں انہوں نے ایک زبردست شہنشاہیت کے بجائے متعدد حکومتیں قائم کر لی تھیں جن میں چولا، چیرا، پانڈیا، کوالا، کرناٹک اور کنٹالاریا زیادہ مشہور ہیں۔ اگرچہ ایرین کی حکمت عملی کی بنا پر یہ باہم دست و گریباں رہ کر اپنی تمام قوتیں برباد کرتی رہیں لیکن اس انتشار کے باوصف ان میں سے ہر ایک نے علوم و فنون کی پیش روی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیا۔ پانڈیہ ریاست کا دار الحکومت علم و مہر کا مرکز تھا یہاں مختلف ادوار میں زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون کی پیش روی کیلئے علماء و مصنفین کے تین علمی مرکز قائم تھے خصوصاً مدورا کے علمی مرکز کو نمایاں حیثیت حاصل تھی اس عظیم الشان علمی ادارہ کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اور اس کی سفارش پر مصنفین کو شاہی خزانہ سے انعام و اکرام سے نوازا بھی جاتا تھا۔ شعرو سخن کے سلسلہ میں بھی ڈراوڑوں کا پایہ بہت بلند کیا گیا ہے اور اس میں زبان ادب کی پوری چاشنی اور انداز بیان کی پوری کشش بیان کی گئی ہے۔ تامل زبان کی عروضی بحر سنکرت بحر سے بالکل مختلف تھے ان کی اثریت کے مقابلہ میں سنکرت کے عروضی بحر کو بے اثر کہا گیا ہے۔ چنانچہ اہل دنیا، کلیا اور نجیا نام کی بحر کو تامل زبان کی ایسی نشانیاں کہا جاتا ہے جن کی مثال سنکرت زبان میں نہیں ملتی۔

رزمیہ نظموں کے لحاظ سے بھی قدیم تامل ادبیات کو مالا مال کہا گیا ہے چنانچہ پانچ رزمیہ نظموں



کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی تھی جن میں سلیا تعیکارم اور مینی میکلانی کو اثریت اور مخاطب کے لحاظ سے ریا مائن اور مہاجارت کے ہم پلہ بتایا گیا ہے۔ اول الذکر میں مختلف ذاتوں اور پیشہ وروں کی ایک صحیح تصویر الفاظ کے ذریعہ کھینچی گئی تھی۔ اس تصویر کشی کے علاوہ اس خصوصیت نے اس کو قدیم ہندوستانی ادبیات میں ایک گورنہ ممتاز بنا دیا تھا کہ یہ حزنہ جذبات و عناصر سے معمور تھی، اس کے ہر فقرہ کو درد و اضطراب کی منہ بولتی تصویر کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے مطالعہ سے یونانی ٹریجیڈی کی اثریت کی طرح دل و دماغ پر ایک کرب آمیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رزمیہ نظموں کے پہلو بہ پہلو رزمیہ نظموں کی بھی قدیم تامل زبان میں کوئی کمی نہیں بتائی جاتی اس سلسلہ میں بہت سی کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں جن میں پورا نالور و، کلی تھوکائی اور پاتھوتو وغیرہ نامی تصانیف کو رزمیہ شاعری کی جان کہا گیا ہے۔ نظمیں تاریخی تخلیقات کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں قدیم ترین تامل فرماں رواؤں کے کارناموں کے ساتھ ملکی تہذیب و معاشرت، رسوم و رواج کی بھی مکمل عکاسی بتائی گئی ہے، ان میں دو کتابوں نالابار اور کور کا ذکر قدیم تذکروں میں پایا جاتا ہے، نالابار کو ایسی بے نظیر ذہنی تخلیق بتایا گیا ہے کہ سنسکرت زبان کے مفکر شعراء بھی اس کے طائر تخیل کی پرواز اور جذبات لطیفہ کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے، اسی بنا پر تامل زبان کی قدیم شعری ادبیات میں اس کو چوٹی کی تخلیق کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہ نظم تین حصوں پر مشتمل بتائی جاتی ہے۔ حصہ اول نیکی، دوسرا دولت، تیسرا سچی مسرت۔ قدیم مہرین کے نزدیک الفاظ کی شیرینی، طرز ادا کی دل آویزی، فکر و تخیل کی رفعت اور جذبات کی لطافت نے مل کر شاعر کے کلام میں تاثر کی ایک ایسی روح پھونک دی تھی کہ قاری و سامع کے دل و دماغ پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک یہ خوبی بھی اس تخلیق کی بتائی جاتی ہے کہ شاعر کا مستانہ مخاطب قوم و فرقہ اور رنگ و نسل سے ہٹ کر تمام نوع بشری کے لئے تھا۔

علم ہیئت و نجوم اور جوتش کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے بانی اور موجد ایرین ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایرین اثر قبول کرنے سے پیشتر ہی ڈراڈروں نے عملی ہیئت مرتب

کولی تھی، ڈاکٹر میک لین کے خیال کے مطابق جنوبی ہند کے دراوڑ ماہی گیروں نے چاند کے ٹھننے گھٹنے کا مشاہدہ کر کے وقت کی تقسیم کا قری حساب مرتب کر لیا تھا اور میدانی علاقوں کے مضافاتی علاقوں نے آفتاب کی حرکت سے مختلف فصلوں اور موسموں کا تعین بھی کر لیا تھا اسی کے ساتھ ڈاکٹر سلیٹر کا یہ بیان بھی شامل کر لیا جائے تو حقیقت کی تصویر اور بھی صاف نظر آنے لگتی یعنی تالموں کی تقسیم بالکل شمس تھی، ان کے مہینہ کے دن مقرر نہ تھے انھوں نے فلک کے بارہ حصے قائم کئے تھے جس وقت بھی آفتاب ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں داخل ہوتا تھا اسی وقت سے دوسرا مہینہ شروع ہو جاتا تھا۔ غرض مختلف علمائے ہند نے تامل تقویم کو مروجہ تقاویم سے زیادہ صحیح اور درست مانا ہے۔ فن موسیقی اور راگ راگینیوں کی ایجاد میں بھی ڈراوڑوں کو خاص درجہ دیا گیا ہے اگرچہ اس فن پر دسوں تصانیف حوادث روزگار کی نذر ہو چکی ہیں پھر بھی ان کے کچھ دھندلے سے نقوش ستیا تھیکارم میں محفوظ بتائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کا وہ حصہ بہت ہی مقبول کہا جاتا ہے جس میں ”ایلنگوا ڈیکل“ جیسے مشہور شاعر اور ماہر موسیقی نے مختلف سُر، دھنوں یا راگ راگینیوں کی تشریح و توضیح کی ہے۔

چونکہ ڈراوڑی تہذیب کا ارتقا تدریجاً اور منزل بہ منزل عمل میں آیا اس لئے ان مذہبی تصورات کے مذہبی معتقدات میں ادھام پرستی سے لے کر ثنائی تصورات کے تمام ارتقائی شواہد پائے جاتے ہیں، تمدن کے ابتدائی مراحل میں شجر و حجر، مہر و ماہ، بھوت پریت اور مختلف حیوانات کی پوجا پاٹ مذہبی تصورات کے جز تھے لیکن ذہن و شعور کے ارتقا کے ساتھ مذہبی تصورات میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں اور ان کے مذہبی دیو مالا میں ایسے پر شوکت دیوتا شامل ہو گئے کہ ایرین بھی نوامیس فطرت کے پرستار ہونے کے باعث ان کے دیو مالا میں شریک ہو گئے۔ ڈراوڑوں کے خاص دیوتا رودرا، اور کوروائی نام کے ہیں۔ سیو دیوتا بھی جزیرہ تامل ہند



کے ڈراوڑوں کا بھی ایک قدیم الایام دیوتا تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ کے نزدیک بھی یہ ڈراوڑوں کا ایک  
 علاقائی دس یعنی پہاڑی دیوتا تھا۔ ایرین کی بعض قدیم کتابوں میں سید کو دکشنا مورتی کا نام  
 دیا گیا ہے۔ لنگ پوجا بھی ڈراوڑوں کی خاص پوجا تھی، حالیہ کھدائیوں سے بہت سے غیر متاثرہ  
 پتھر کے لگم برآمد ہوئے ہیں جن سے قدیم ڈراوڑوں میں لنگ پوجا کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔  
 جنوبی ہند کی حالیہ کھدائیوں سے بھی کچھ مخروطی شکل کے چکنے پتھر دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس پوجا کی تصدیق  
 ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لنگا کاراجہ راون سیولنگ کی پوجا بڑے اہتمام سے کرتا تھا حتیٰ کہ یہ ڈراوڑ  
 راجہ سولے کا ایک لنگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ تاریخی اشاروں کی بنیاد پر سر جان مارشل  
 ڈاکٹر جنرل نے اس پوجا کو ڈراوڑوں کی قدیم ترین پوجا میں شمار کیا ہے۔ تناسخ یا آواگون کا عقیدہ  
 بھی ڈراوڑوں کا خاص عقیدہ تھا۔ تلاسوامی پلے کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ڈراوڑ  
 تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ دوسرے مفکرین کی نظر میں تناسخ ہند کا قدیم ترین تخیل ضرور ہے لیکن  
 ایرین بھی اس تخیل کو اپنے ساتھ لائے تھے اس لئے یہاں کی متعدد سوسائٹی اور سماج کے اثر نے اس  
 تخیل کو ایک عقیدہ کی شکل دے دی۔

ڈراوڑوں میں اکابر پرستی کا طریقہ قدیم الایام سے مروج تھا وہ اپنے پرکھوں  
 کی روحوں کو نذر و نیاز سے خوش کرتے تھے اور ان کی شاندار یادگاریں قائم  
 کر کے ان کے روشن کارناموں کو برہمیت پر زندہ رکھتے تھے۔ ان قومی ہیروں کے یادگاری سلسلوں  
 سے تجسیم الوہیت یعنی اوتار کے عقیدہ کا آغاز ہوا۔

اگرچہ اکابر پرستی کے نتیجے میں ڈراوڑوں میں تکثیر الوہیت شباب پر تھی۔ بظاہر  
 کثرت میں وحدت کا تخیل ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں بھی خدائے واحد کا ہلکا سا تصور بھی نہ  
 تھا لیکن عوامی ذہن سے ہٹ کر ایک ایسا باشعور طبقہ بھی ان میں نفاذ آتا ہے جس کو تکثیر الوہیت میں ذات  
 واحد کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے اور ان سب پر ذات کن نکاں کا ہاتھ غالب اور بالا معلوم ہوتا ہے  
 اس شعوری طبقہ کے تصور میں خالق ارض و سما کائنات کے ہر ذرہ میں جلوہ نما تھا بلکہ کائنات سے ہٹ کر

اُس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اس طبقہ کا یہ تخیل یقین و ایمان کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ دنیائے محسوسات کے ہر ذرہ میں اس روح اعظم کی تجلیات پر تو نگن ہیں یا روح اعظم نے اپنی وحدت کی جلوہ گری کے لئے کائنات میں ظہور کیا ہے یعنی ہر رنگ میں اسی شاہد حسن کا جلوہ ہر پھول میں اسی کی مہک اور اسی کے رُخ رنگین کی نمائش ہے، بلکہ فلسفیانہ تخیل نے اس راہ میں مزید کشادگی اس طبقہ کے دلوں میں پیدا کر دی تھی جس نے اس تصور کو عقیدہ کی شکل دیدی کہ وحدت مطلق کے سوا سب اعتبار محض ہے اور وحدت مطلق ایک حقیقت ثابتہ ہے باقی سب مجازی یا حقیقت کا پرتو ہیں اور یہ عالم ظاہر ذات و جوب کا منظر ہی نہیں بلکہ اشیاء عالم اس کی مجازی صورتیں ہیں اور ساتھ ہی اشیاء عالم اور ذات واجب میں سورج اور کوئوں کا تعلق ہے، ذات واجب آفتاب ہے اور شعاعیں اشیاء عالم۔ اس کثرت الوہیت میں ذات واجب کے تصور کو کثرت میں وحدت کی جلوہ گری کا نام دینا غلط نہ ہوگا۔

ذات واحد و ہستی و جوب کے لئے تامل زبان میں کدول کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے ایک ایسی قادر مطلق ہستی مراد لی گئی ہے جو تمام کائنات کی اصل ملک و مختار ہے اور اسی کے ساتھ انسانی فہم و ادراک سے بالاتر اور عقل و شعور کی رسائیوں سے ماوریٰ ہی نہیں بلکہ اس کے آستانہ عالیہ تک طائر تخیل اور مرغ تصور کی پرواز بھی ناممکن ہے تامل زبان کی قدیم تصنیف ”تول کاہیم“ میں کدول (خدا) کی یہ حقیقت بھی بالشریح بیان کی گئی ہے کہ وہ ”نرکار“ یعنی صورت تجسیم سے مبرا اور منزہ ہے اور ساتھ ہی حاضر و ناظر اور قادر علیٰ کل شئی ہے اس کی تجلیات ہر چیز میں اس طرح جلوہ نما ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں اس سے جدا نہیں کی جاسکتیں، ذات واحد کے لئے کدول کے علاوہ ایک لفظ کنکھائی بھی تامل زبان میں ملتا ہے جس سے وہ قوی اور توانا تر ہستی مراد لی گئی ہے جو ”توتوؤں“ سے بالاتر ہے۔ تولا سوامی پلے کی متصوفانہ تشریح و توضیح کے مطابق ”توتوا“ سے وہ بے شمار لباس مراد ہیں جن سے روح انسانی اپنے ارتقا کے دوران باوقات مختلفہ ملبوس رہتی ہے تا آنکہ حیات و ممات کے لائق ای پکر سے آزاد ہو کر روح اعظم یعنی اس قوی اور توانا تر ہستی میں جذب ہو جاتا ہے جسے کدول یا کنکھائی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(باقی)



# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

## تقسیم کے بعد

(۱۵)

از سعید احمد اکبر آبادی

بدرالدین طیب جی کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ ان کا گورنمنٹ میں عمل دخل کا فی تھا اور خصوصاً پنڈت جی کو ان پر بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کی قدر کرتے تھے اس بنا پر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کی کوشش کی کہ علی گڑھ کے نوجوان سرکاری ملازمتوں میں لئے جائیں اس کے علاوہ کپنیوں سے خط و کتابت کر کے بہت سے نوجوانوں کو وہاں بھی بھیجا۔ پنڈت جی سے کہہ سن کر سرکاری طور پر اس کی تحقیق کرائی کہ مسلمان ملازمتوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے کیوں بہت کم ہیں۔ مجھے خود اپنے ایک عزیز شاگرد کا واقعہ یاد ہے، یہ نہایت ذہین اور طباع۔ ساتھ ہی بہت نیک اور صالح نوجوان تھا۔ یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا امتحان لی ٹی۔ ایچ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ میں نے اپنے ہاں اس کو تھیالوجیکل سوسائٹی کا سکریٹری بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر ایک آل انڈیا مقابلہ کے سخت امتحان میں شریک ہوا اور اس شان سے کامیاب ہوا کہ نوسو کامیاب امیدواروں میں یہ اکیلا مسلمان تھا۔ اس کے بعد نو مہینہ کی ٹریننگ تھی اس میں بھی اعلیٰ درجہ میں کامیابی

حاصل کی، تمام افسران متعلقہ اسے بہت پسند کرتے تھے، لیکن جب تقرر کا وقت آیا تو پولس رپورٹ اس کے خلاف ہو گئی اور اس کا نام خارج ہو گیا، یہ سخت پریشان اور بدحواس ہو کر میرے پاس پہونچا۔ میں نے بدرالدین طیب جی سے ملایا تو انھوں نے پہلے یونیورسٹی کے کیرکٹر سٹیفکٹ کی روشنی میں مجھ سے اور پروووسٹ اور پراکٹر سے یہ تحقیق کی کہ پولس کی رپورٹ غلط تھی اور اس نوجوان کا تعلق کبھی کسی فرقہ دارانہ جماعت سے نہیں رہا۔ بدرالدین طیب جی کو جب اس بارہ میں اطمینان ہو گیا تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون اٹھایا اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بات چیت کر کے ان کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ پنڈت جی نے فوراً فائل منگوایا۔ جب پولس رپورٹ سامنے آئی تو حکم دیا کہ اس کا ثبوت فراہم کیا جائے، پولس کو دن میں تارے نظر آنے لگے، علی گڑھ آئی، کئی روز تک یہاں پڑی رہی لیکن اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور وہ اپنی رپورٹ کو صحیح ثابت نہ کر سکی، اس کے بعد پولس کے ان ذمہ دارانہوں کا حشر کیا ہوا، اس کا علم تو نہ ہو سکا لیکن یہ نوجوان اللہ کے فضل و کرم سے آج ایک بڑے عہدہ پر فائز ہے اور بڑی نیک نامی سے اپنے فرائض مفوضہ انجام دے رہا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ آج مسلمانوں کی وکالتی مشکل ہے جو دور نہیں ہو سکتی، بس ضرورت اس کی ہے کہ ان کی قیادت صحیح ہو۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو بدرالدین طیب جی کی طرح خالص تعمیری ذہن رکھتے ہوں، مخلص اور تجربہ کار ہوں اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ بیدار مغز اور نہایت جرئی بیباک ہوں۔

نواب علی یادرجنگ | جب یہ طے ہو گیا کہ بدرالدین طیب جی علی گڑھ میں نہیں رہیں گے تو ایک روز نواب سراج محمد سعید خاں صاحب آف چٹاری نے ہم چند اکڑ سکٹو کونسل کے مقامی ممبروں کو شام کی چائے پر مدعو کیا اور وہاں بتایا کہ اب علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے لئے نواب علی یادرجنگ کا نام درپیش ہے اور پھر موصوف کے تعارف میں بتایا کہ بڑے لائق اور قابل ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر اور گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے بڑے سفارتی عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ تو سب درست اور بجا! لیکن آپ



کاحیدر آباد سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے یہ بھی فرمایئے کہ نواب علی یاور جنگ کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی پاس اور لحاظ رہے گا! نواب صاحب چھتاری میرا یہ سوال سنتے ہی جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے، لیکن جلد ہی منجمل کر بولے: ”میں ذاتی طور پر خوب واقف ہوں، بہت شریف اور مسلمان آدمی ہیں۔“ منجولیمچڑپ اور خواہ مخواہ اپنی بات کی پیچ کرنے سے سخت نفرت ہے، اس لئے جب کسی شخص کی گفتگو کے بین السطور سے میں اس کا اصل مقصد تار لیتا ہوں تو اب اپنی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں اور مزید بحث و تکرار نہیں کرتا۔ چنانچہ اس وقت بھی میں خاموش ہو گیا۔ دوسرے حضرات کچھ کہتے سنتے رہے اور مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد مجلس منتشر ہو گئی، اس کے بعد راسخہ کے ایکٹ کے مطابق اکڑ کوٹہ کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میں تین آدمیوں کا ایک پنل بنا اور صدر جمہوریہ نے وزیٹر کی حیثیت سے سے اس پنل سے نواب علی یاور جنگ کا نام منتخب کر کے وائس چانسلر مقرر کر دیا۔

یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے زیادہ المناک واقعہ | نواب صاحب نے مارچ ۱۹۷۵ء میں اپنے عہدہ کا چارج لیا، نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۲۵ اپریل کو یونیورسٹی کی تاریخ کا وہ سب سے زیادہ المناک واقعہ پیش آیا جس نے یونیورسٹی کی ہیئت ہی بدل دی اور اس کو ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جن کے اثرات و نتائج سے یونیورسٹی کو اب تک نجات نہیں ملی۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ مشہور اور نہایت بدنام واقعہ ہے اور مختلف لوگوں نے اس کی تعبیر و تشریح میں مختلف باتیں کہی ہیں، لیکن چونکہ میں خود اس وقت موجود تھا اس لئے اپنے مشاہدات و احساسات کی روشنی میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، بدرالدین طیب جی نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے خود یونیورسٹی کے طلباء کے لئے ۷۵ فی صد کا کوٹہ مقرر کر دیا

تھا اور اس کی منظوری پہلے اکاڈمک کونسل اور پھر اگزیکٹو کونسل اور کورٹ سے لے لی تھی۔ نواب علی یاور جنگ نے چارج لینے کے بعد ہی اس چیز کو قومی مفاد کے خلاف سمجھا اور اسے ختم کرنے کے لئے انھوں نے اکاڈمک کونسل میں اس کی تحریک کی کہ اندرونی اور بیرونی طلبہ کے لئے ۵۷ اور ۲۵ کا تناسب ختم کر دیا جائے اور اسے یونیورسٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اکاڈمک کونسل نے اسے منظور کر لیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نواب صاحب کا یہ اقدام مسلمان طلبہ کے مفاد کے خلاف تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اندرونی اور بیرونی طلبہ میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں تھی اس لئے اگر اندرونی طلبہ کے لئے ۵۷ فی صد کا کوٹہ مقرر ہوتا ہے تو اس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے طلبہ کو فائدہ پہنچتا ہے اور بیرونی طلبہ کے لئے ۲۵ فی صد کے کوٹہ سے اگر ان کو نقصان پہنچتا ہے تو اس میں دوسری یونیورسٹیوں سے آنے والے مسلم اور غیر مسلم دونوں طلبہ شریک ہیں، چنانچہ مجھے معلوم ہے نواب صاحب نے اکاڈمک کونسل میں اپنی تجویز پیش کرنے سے قبل انجینئرنگ کالج کے پرنسپل جناب یار الدین صاحب انصاری اور کالج کے سینئر پروفیسروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ کیا ان کی اس تجویز سے مسلمان طلبہ کے داخلہ پر اثر پڑے گا تو ان حضرات نے کافی غور و خوض اور گزشتہ رکارڈ کو دیکھنے اور اس کے مطابق اندازے لگانے کے بعد بتایا کہ مسلمان طلبہ کے داخلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اندرونی طلبہ کی تعداد کم کرنے سے بیرونی طلبہ کی جو تعداد بڑھے گی اس میں مسلمان طلبہ بھی ہوں گے، اس بنا پر میرے نزدیک نواب صاحب کی تجویز کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھنا درست نہیں ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر یہ معاملہ مقامی اور یونیورسٹی کے اپنے طلبہ کے حق کا تھا، ہر یونیورسٹی کے طلبہ اپنا یہ ذاتی حق



سمجھتے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج اور دوسرے پروفیشنل تعلیم کے اداروں اور کالجوں میں داخلہ کے معاملہ میں ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے، چنانچہ اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں ایسا ہوتا بھی ہے، اس بنا پر اکاڈمک کونسل میں جب نواب صاحب کی تجویز منظور ہوئی تو طلباء میں اس سے بیزاری اور ناراضگی کا پیدا ہونا ایک امر طبعی تھا، چنانچہ انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، لیکن یہ احتجاج نہایت پر امن تھا۔ ۲۴ اپریل کو انوکٹو کونسل کی میٹنگ تھی۔ میں خود اس میں شریک تھا، جب میٹنگ ہو رہی تھی تو طلباء نے ایک جلوس نکالا اس وقت پراکٹر پالٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے ریڈر ناصر علی صاحب تھے، یہ نہایت مستعد، بیدار مغز اور طلباء کے بہادر دتھے، یہ ڈیوٹی پر تھے اور نگرانی کر رہے تھے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ انہوں نے طلباء کو سمجھا بھگا کر منتشر کر دیا اور میٹنگ چلتی رہی، میٹنگ میں نواب صاحب نے اپنی تجویز پر تقریر کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اس سے مسلم مفاد پر کوئی اثر نہ ہوگا، لیکن جسٹس بشیر احمد سعید اور دوسرے حضرات کو اس معاملہ میں اطمینان نہیں تھا اور وہ انجینئرنگ کالج میں گذشتہ چند برس کے داخلوں کی روئداد وغیرہ کی روشنی میں اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہتے تھے اس لئے محض غیر رسمی گفتگو کے بعد اس کو ملتوی کر دیا گیا اور اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۲۵ اپریل کو کورٹ کی میٹنگ تھی جو حسب معمول دستور حامد ہال (یا طلباء کی یونین کے ہال) میں منعقد ہوئی، قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق میٹنگ کا افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد نئے وائس چانسلر کے خیر مقدم میں تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا عبدالوہاب بخاری، سید کلب عباس صاحب اور بعض اور حضرات نے حصہ لیا۔ ان سب کے جواب میں وائس چانسلر نے مختصر تقریر کی جس میں شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ انہیں اس کا احساس ہے کہ اس یونیورسٹی کی تاریخی عظمت کیا ہے، اس کی روایات کیا ہیں، وہ کوشش کریں گے کہ اس کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں، اور اسی جذبہ سے وہ یہاں آئے ہیں۔

اس کے بعد ایجنڈے پر کارروائی شروع ہوئی۔ ابھی چند ہی آئٹم ہوئے تھے کہ طلباء کا ایک بڑا جلوس یونین کے صدر کے زیر قیادت وہاں پہنچ گیا اور اس نے یونین ہال کے شمالی دروازے کے سامنے دھرنا جما دیا۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ تھا کہ کورٹ اپنی اس میٹنگ میں اکاڈمک کونسل کی منظور کردہ تجویز متعلقہ کو رد کر دے اور اس کا اعلان کرے کہ سابقہ پوزیشن بحال رہے گی۔ طلباء کا یہ جلوس مسلم اور غیر مسلم دونوں طلباء پر مشتمل تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے اس جلوس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کرسی پر ممبران کورٹ کی طرف رخ کئے جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ حد یہ ہے کہ طلباء کی طرف گردن موڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کتنے طلباء ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بعض اساتذہ نے ہال سے باہر نکل کر ان سے گفتگو کی۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟ آخر کار جب شور و فل زیادہ بڑھا تو وائس چانسلر صاحب نے پراکٹر کو بلا کر پولس کو طلب کر لینے کی ہدایت کی اور میٹنگ ملتوی کر دی گئی، میٹنگ کے ملتوی ہوتے ہی ممبر حضرات منتشر ہو گئے اور جس کا جدھر سیٹنگ سما یا چل دیا۔ لیکن وائس چانسلر، پروفیسر وائس چانسلر، نواب صاحب چیمبرائری اور چند پروفیسر اور دوسرے ممبر ہال میں ہی رہے اور میں بھی انہیں حضرات میں شامل تھا۔ پراکٹر کے ٹیلیفون کرنے پر دس پندرہ منٹ کے اندر اندر پولس پہنچ گئی، طلباء نے کورٹ کی طرف سے مایوس ہو کر ہال کے اندر گھس کر تھپڑاؤ شروع کر دیا تھا۔ جب اس میں شدت ہوئی تو میں اپنی حفاظت کے لئے ہال کے پچھلے حصے میں بازو کے کمرہ کے قریب ایک اونچی سی میز رکھی تھی اس کے نیچے گھس گیا لیکن جب دیکھا کہ تھپڑاؤ بڑھتا ہی جاتا ہے اور طلباء آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو میں میز کے نیچے ہی نیچے رنگیتا ہوا بازو کے کمرہ میں گھس گیا۔ یہاں دیکھا کہ پروفیسر نو الحسن، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مجیب الرحمن اور چند اور حضرات بھی اسی کمرہ میں پناہ گزین تھے اور صبر ہم لوگ یہ جتنا شک کر رہے تھے اور اُدھر ہوا یہ کہ طلباء نے پولیس کو دیکھا تو اس پر بھی تھپڑاؤ شروع کر دیا، پولس نے فوراً گولی چلا دی جس سے بعض طالب علم زخمی ہوئے لیکن مشہور یہ ہو گیا کہ دو طالب علم جان بحق ہو گئے۔ اس خبر کا اثر اٹنا تھا کہ طلباء آج سے باہر ہو گئے اور اب انہوں



نے ہال کا یہ مشرقی بازو والا کمرہ جس میں ہم پناہ گزیں تھے اس کو اپنا نشانہ بنایا۔ کمرہ اندر سے بند تھا اس لئے اس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اس زور شور سے پتھراؤ کیا کہ ان کے شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر ہم لوگوں کے ادھر ادھر تا بڑ توڑ گرنے لگے اور بچنا مشکل ہو گیا۔ اب میں نے یہ کیا کہ جن دو کھڑکیوں سے پتھر اندر آرہے تھے میں ان دونوں کھڑکیوں کے بیچ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ میرے بعض ساتھی شیشہ یا پتھر لگنے سے زخمی ہو گئے اور میں محفوظ رہا، لیکن پتھراؤ میں لمحہ بہ لمحہ جو شدت مزید سے مزید تر پیدا ہوتی جا رہی تھی اور لڑکے غصہ میں بھرے ہوئے جو چیخ پکار کر رہے تھے اس کی وجہ سے یقین تھا کہ آج اگر جان بچ بھی گئی تو صبح سلامت گھر پہنچنا ناممکن ہے، خیال تھا کہ کھڑکیوں کے شیشے تو ٹوٹ ہی گئے ہیں، اب لڑکے ان میں سے پھانڈ کر اندر گھس آئیں گے، اور اپنا غصہ ہم پر اتاریں گے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یکا یک لڑکوں کا شور و غل ختم ہو گیا اور وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دھڑی طرف پھلے گئے، میں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور کمرہ سے نکل کر پھر ہال میں داخل ہوا۔ اس وقت ہال میں بالکل سناٹا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور حیرت بھی کہ مسٹر پی۔ این سپرو جو ٹیک کی ایک مشہور اور بلند پایہ شخصیت تھے اور جو کورٹ کے ممبر تھے اپنی سن رسیدگی اور ضعیفی کے باوجود کورٹ کی میٹنگ میں جہاں بیٹھے تھے اب بھی تنہا اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ہال میں پتھراؤ ہوتا رہا۔ سب ترتر بتر ہو گئے، لیکن سپرو صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، میں نے اس وقت ان کو صبح سلامت دیکھا تو دل ہی دل میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا ورنہ خدا خواستہ اگر ان کا بال بیکا ہو جاتا تو معلوم نہیں کیا قیامت برپا ہو جاتی، بہر حال اس وقت پروفیسر آل احمد سرور میرے ساتھ تھے، ہم دونوں نے ہال سے باہر نکل کر دیکھا تو اس وقت لڑکوں کی پھیر تھی، اسے غنیمت جانا اور ہم دونوں ٹپک کر ایس ایس ہال کے ڈائنگ ہال میں گھس گئے، باہر پہلے شور و غل کی آواز آئی اس کے بعد یہ آواز دم بدم بڑھ گئی اندر سے بھی کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ باہر کیا ہو رہا ہے، دس پندرہ منٹ اسی امید و بیم کے

کے عالم میں گزرے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا تو راستہ صاف نظر آیا۔ ہم دونوں کی رائے ہوئی کہ اب نکل چلنا چاہیے۔ چنانچہ سرور صاحب اپنے گھر کی طرف چلے اور راستہ میں زخمی ہو گئے۔ میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی سڑک پر آیا تھا کہ ایک چپراسی سائیکل پر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو فوراً سائیکل سے اتر کر مجھے آس پر بٹھا لیا اور بڑی تیزی سے سائیکل چلا کر مجھے میرے گھر پہنچا دیا۔ یہاں گھر کے لوگ سخت پریشان تھے، مجھے بخیریت و عافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے دلمے بخیر گذشت۔

وائس چانسلر صاحب کے ساتھ | یہ تو اس واقعہ کی آپ بیتی ہے جو خود پرگندری، شام کے وقت نہایت افسوسناک معاملہ | جو دوست احباب میری خیریت طلبی کے لئے آئے ان سے یہ معلوم کر کے سخت دکھ اور صدمہ ہوا کہ نواب علی یا در جنگ شدید زخمی ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے بھی شدید چوٹیں آئیں۔ میں نے یونین ہال میں پتھراؤ کے وقت اپنا بچاؤ کرتے ہوئے نواب صاحب کو اس حالت میں چھوڑا تھا کہ وہ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور شاید نواب چغتاری بھی، کے ساتھ ہال کے پیچھے کی جانب کھڑے ہوئے تھے، اس وقت نہایت اعلیٰ قسم کے سوٹ میں ملبوس تھے اور سگرٹ پر سگرٹ پیتے جا رہے تھے غالباً ان کو خیال یہ تھا کہ پولیس یہاں پہنچے گی اور ان کو سلامتی کے ساتھ اپنی حفاظت میں نکال کر لے جائے گی، اور واقعہ یہ ہے کہ پولیس کو ایسا کرنا بھی چاہتے تھا۔ لیکن پولیس خود اپنی خیر منانے لگی اور فیمن گیٹ کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی، پولیس کی فائرنگ سے دو لڑکوں کے رچانے کی جب شہرت عام ہوئی تو لڑکوں میں اشتعال بڑھا اور وہ نواب صاحب کو زور و کوب کرتے ہوئے ایس۔ ایس ہال کی طرف لے گئے اور وہاں ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ مقصد مہمور کر کے ان سے اکاؤنٹ کنسل کے منظور کردہ رزیولوشن کو منسوخ کرنے کی ایک تحریر کا حاصل کرنا تھا۔ جب انہوں نے یہ تحریر حاصل کر لی تو چونکہ کمرہ کے باہر طلباء کا بڑا ہجوم تھا اور اندیشہ



تھا کہ کون کیا کرے، اس بنا پر کمرہ کے اندر جو طلباء تھے انہوں نے کمرہ کی پشت کے جانب سے جہاں یونیورسٹی ہسپتال کی ایمبولنس پہلے سے کھڑی تھی۔ ایک کھڑکی کی سلاخیں ہٹا کر نواب صاحب کو کمرہ سے باہر کر دیا اور نواب صاحب ایمبولنس میں لیٹ کر اپنی کوٹھی پہنچ گئے۔ نواب صاحب کو ضربات شدید آئی تھیں، تمام کپڑے خوں سے تر ہو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے نواب صاحب کو اس عالم میں دیکھا تو ہوش و حواس اڑ گئے، پھر بھی انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اتنے میں سول سرجن اور بعض اور ڈاکٹر پہنچ گئے انہوں نے مرہم پٹی لگی، دوسرے دن صبح کے وقت نواب صاحب دہلی آکر ڈاکٹر سین کے مشہور نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے، کم و بیش دو مہینہ یہاں قیام رہا۔ اس عرصہ میں میں بھی وقتاً فوقتاً مزاج پرسی کی غرض سے نرسنگ ہوم میں آتا رہا۔ رجسٹرار اور پیراکٹر وغیرہ بھی دفتری کاغذات اور فائلوں کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے نواب صاحب ان سے گفتگو کرتے، فائل دیکھتے اور ان پر نوٹ لکھتے تھے۔ یعنی دفتری کام یہیں سے انجام دیتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا بہت برا واقعہ کا تجزیاتی مطالعہ ہوا اور اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اگر پورے واقعہ کا مطالعہ تجزیاتی طور پر کیا جائے تو اس کے مختلف پہلو اور گوشے ایسے نظر آتے ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور عبرت آموز بھی ہیں۔ ذیل میں ان کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے !

(۱) یہ تسلیم ہے کہ نواب صاحب کا جو منصوبہ تھا اس کا مقصد مسلم مفاد کو نقصان پہنچانا نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کونسا اہم امر تھا کہ نواب صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس کو سرانجام کرنا ضروری خیال فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ اکڑ کٹو کونسل کی میٹنگ میں جب اس معاملہ پر غیر رسمی گفتگو ہو رہی تھی تو نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے ان سے چند ممبران پارلیمنٹ نے کہا تھا: ”نواب صاحب! اس جمہوریت کے دور میں یہ کیسے مناسب ہے کہ علی گڑھ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے پچتر فی صد نشستیں خود علی گڑھ کے طلباء کے لئے

مخصوص کر دی جائیں اور باہر کے طلباء کے لئے خواہ وہ کیسے ہی قابل اور مستحق ہوں صرف پچیس نشستیں رکھی جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود نواب صاحب کے ذہن میں ان کے اس منصوبہ کی کوئی واضح اہمیت نہیں تھی، اور انہوں نے صرف معترضین کی زبان بند کرنے کے لئے یہ اقدام کیا تھا، لیکن نواب صاحب کو اول تو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ جس چیز کو ان کے پیش رو (بدالدین طیب جی) ابھی دو برس پہلے کرچکے ہیں اُس کو آتے ہی اس قدر جلد منسوخ کر دینا کس طرح قرین مصلحت یا دستوری آداب و ضوابط کے مطابق ہو سکتا ہے اور پھر ان کو یہ نفسیاتی حقیقت بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے تھی کہ جب آپ کسی کو کوئی حق دیں تو اس وقت خوب اچھی طرح سوچ بچار کر لیجئے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپ نے کسی کو ایک حق دے دیا تو اب اس سے بحث نہیں کہ یہ حق اُس شخص کا واجب تھا یا نہیں۔ بہر حال اب اس کا واپس لینا آسان نہیں ہے، اور اگر آپ نے اس پر اصرار کیا تو لڑائی جھگڑے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس موقع پر مجھے خود اپنا ایک واقعہ یاد آیا آپ بھی سن لیجئے، جب فروری ۱۹۸۹ء میں میں نے کلکتہ مدرسہ کا چارج لیا اور مدرسہ کی گورننگ باڈی کی میٹنگ بلائی اور اس کے سامنے دوسری باتوں کے ساتھ سال بھر کی تعطیلات کی فہرست بھی پیش کی جس میں میں نے آخری چار شنبہ کی تعطیل جمعہ پہلے ہمیشہ ہوتی آئی تھی حذف کر دی تھی تو خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد موسیٰ حیر میں گورننگ باڈی نے اس فہرست پر نگاہ ڈال کر حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے: ”پرنسپل صاحب! سپر بتائیے، آپ یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں یا جلد ہی واپس ہو جانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے عرض کیا: ”میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں“ فرمایا ”آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کے نزدیک آخری چار شنبہ کے دن کی کیا اہمیت ہے! آپ نے آتے ہی اسے ختم کر دیا۔ اگر آپ نے اس دن تعطیل نہیں کی تو میں بتائے دیتا ہوں کہ پبلک میں آپ کے خلاف اس قدر ایجیٹیشن ہوگا کہ آپ کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔“ میں نے فوراً خان بہادر صاحب کی بات مان لی اور اس دن کو بھی تعطیلات کی فہرست میں شامل کر لیا، لیکن ایک کانگریسی مسلمان ممبر اسمبلی



نے یہ خبر ڈاکٹر کٹر آف پبلک انٹرکشن کو بھی پہونچادی انھوں نے مجھ سے منون پر کہا: آپ اتر پردیش سے آئے ہیں اور بنگالی مسلمانوں کی روایات اور جذبات سے واقف نہیں ہیں، اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ ذرا سنبھل کر چلیئے، جلد بازی نہ کیجئے، اور اب تک جیسا کچھ ہوتا آیا ہے اس میں تغیر تبدیل نہ کیجئے۔

خان بہادر صاحب نے جو بات کہی تھی اُس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب چند برسوں کے بعد سر ڈینی سن راس، جو ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل رہے تھے، ان کی خودنوشت سوانح عمری میری نظر سے گزری، اس میں موصوف نے ایک جگہ لکھا: میں نے ایک مرتبہ کلکتہ مدرسہ میں بعض غیر ضروری چھٹیاں کم کر دیں تو نواب عبداللطیف (بنگال کی ایک نامور شخصیت) کو اس درجہ ناگواری ہوئی کہ انھوں نے اُس نے میرے مکان پر حملہ کر دیا اور مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔“ نواب علی یادرجنگ سے یہ حقیقت اس لئے اوجھل ہو گئی تھی کہ وہ نواب آدمی تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے، عوام سے ان کا رابطہ مضبوط نہ رہا تھا۔

(۲) ۲۴ اپریل کو جب انڈیو کونسل کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ طلباء نے ایک جلوس نکالا، لیکن پرامن رہے اور پراکٹر کے سمجھانے سمجھانے پر منتشر ہو گئے، پھر جب ۲۵ اپریل کو کورٹ کی میٹنگ کے وقت یہ پھر جلوس کی شکل میں آئے تو اب بھی یہ پرامن تھے، اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ والس چانسلر صاحب خود اٹھ کر آتے، ان لوگوں سے خطاب کرتے، ان کی سنتے اور اپنی کہتے۔ ہم تمام ممبران کورٹ والس چانسلر صاحب کی مدد کے لئے موجود تھے، لیکن والس چانسلر صاحب نے گویا طلباء کے آنے اور بیٹھنے کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ جب طلباء کا شور وغل زیادہ بڑھا تو میٹنگ کی کارروائی روک دی، لیکن اب بھی کرسی پر سامنے کی طرف رخ کئے تشریف فرما رہے اور سگریٹ پیتے رہے، میرے نزدیک یہ دوسری نامناسب بات تھی جو نواب صاحب کی طرف سے پیش آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر زیدی صاحب یا بدرالدین طیب جی

ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔

(۳) اس میں شبہ نہیں کہ یونیورسٹی میں بعض اوقات حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جہاں پولس کا طلب کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن تعلیم کا ہوں کا تقدس اس امر کا مقتضی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو پولس کو ان معاملات میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے، نواب صاحب نے جس وقت پراکٹر کو پولس طلب کرنے کا حکم دیا ہے، میرے نزدیک ان کا یہ حکم قبل از وقت تھا، کیونکہ اب تک طلباء کی طرف سے تشدد کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا اور موقع تھا کہ باہم گفت و شنید سے معاملہ ختم ہو جاتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جب کہ امریز بحث پراکٹر کو کونسل نے کوئی گفتگو ہی نہ کی تھی اور اس بنا پر یہ معاملہ کورٹ کے سامنے آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اکاڈمک کونسل نے بیشک ایک تجویز منظور کر لی تھی، لیکن اکاڈمک کونسل اور پھر کورٹ کی منظوری کے بغیر تو اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں چونکہ ہال کے اندر تھا، اس لئے باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ لڑکوں نے تشدد پولس کو دیکھ کر اور اس سے مشغول ہو کر شروع کیا تھا۔ اور جب تشدد شروع ہی ہو گیا تو پولس بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی اور پولس نے اپنے دفاع میں گولی چلا دی۔

۱۷ ملک اظہار الحق جو آج کل یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں میرے زمانہ میں کلکتہ مدرسہ کے پڑھکر اور اس حیثیت سے میرے اسسٹنٹ تھے ان سے اور کلکتہ کے باخبر حضرات سے دریافت کیجئے کہ میرے وہ سالہ قیام کلکتہ کے زمانہ میں کتنی مرتبہ لڑکوں نے میرے خلاف اسٹرائک کی، سخت ایجنٹیشن کیا۔ جلوس نکالے اور میرے خلاف نعرے لگائے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ بنگالی لڑکوں نے مجھ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بھی بنالیا، لیکن میں نے کبھی پولس کی مدد طلب نہیں کی، اور خود ہی طلباء سے گفت و شنید کر کے مگر اپنے فیصلہ پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے تمام ہنگامے ختم کئے۔ بلکہ ایک رقبہ میرے چارے لینے کے (بقیہ ماحشیہ اگلے صفحہ پر)



(۴) اچھا! اگر پولس کو طلب کیا گیا بھی تھا تو اس کو بتانا چاہئے تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے؟ اسے کیا کرنا ہے؟ اور اسے کہاں کھڑا ہونا ہے؟ اس کو طلب کر کے یونہی چھوڑ دینے اور اس سے تعلق نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادمروائس چانسلر اور پرووائس چانسلر وغیرہ مجروح ہوتے رہے اور ادمر پولس خود اپنی حفاظت میں لگ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولس ہی یونیورسٹی کے لئے قیامت صغریٰ بن گئی۔

ہم نے اوپر واقعہ کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کا مقصد طلباء کے جرم کو ہلکا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اُن بعض چیزوں کو بھی منظر عام پر لانا ہے جن سے اس واقعہ کے پیش آنے میں مدد ملی۔ خلیل جبران نے اپنے ایک ناول میں بڑا بلیغ فقرہ لکھا ہے:

*Not a single leaf falls down  
without the silent consent of the*

*whole tree.* یعنی ایک پتہ بھی پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر نہیں

گرتا۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر یہ فقرہ صادق آتا ہے اور اس بنا پر جب تک حالات کا جائزہ اس وسعت نظر اور دقت نگاہ سے نہیں لیا جائے گا اس وقت

(بقیہ ماحشیہ گذشتہ) دو ماہ کے بعد ہی ۲۷ اپریل ۱۹۷۹ء کو جب کلکتہ مدرسہ میں ایک بہت بڑا فساد ہو گیا جس میں بنگالی اور بہاری (اردو بولنے والے) طلباء میں لڑائیوں اور چاقوؤں سے کھلی جھگ ہوئی اور اس کی خبر پا کر پولس کے بڑے بڑے افسر خود آگئے تو ان کے سخت اصرار کے باوجود نہ میں نے ان کو دخل دینے کی اجازت دی اور نہ کسی طالب علم کو گرفتار ہونے دیا، اور خود طلباء کے مجمع میں ایک پرزور تقریر کر کے اس ہنگامہ کو اس طرح ختم کیا کہ گورنمنٹ نے داد دی، اخبارات نے شدیدے لکھے، پبلک نے تعریف کی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک ملاقات میں سرت کا اظہار فرمایا۔

تک مشکلات کا کامیاب اور پائیدار حل دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ تو ایک ارشدی تھا جو یونیورسٹی کی بدقسمتی سے پیش آکر رہا لیکن واقعہ کے اثرات بالبعد یونیورسٹی کی کاپی اپٹ کر کے رکھ گیا۔ جہاں تک نواب صاحب کی ذات کا تعلق ہے۔ نجوان کی شرافت اور علو اخلاق میں شبہ نہیں ہے، چنانچہ جب طلباء نے اس پر اپنے رنج و غم اور افسوس کا اظہار کیا تو انہوں نے ان کو معاف کر بھی دیا، لیکن انہوں نے جو بیان دیا تھا اس کی اور خفیہ پولس کی رپورٹ کی بنیاد پر گورنمنٹ نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اس سلسلہ میں مسٹر چھاگلہ جو وزیر تعلیم تھے انہوں نے فوراً یہ کیا کہ یونیورسٹی کا ایکٹ ۱۹۵۱ء منسوخ کر کے ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔ اس آرڈیننس کے ماتحت کورٹ اور اکرکٹو کونسل کی وہ ہیئت ترکیبی ختم ہو گئی جو ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ماتحت انہیں حاصل تھی اور آرڈیننس کی رو سے اور نامزدگی کے ذریعہ کورٹ اور اکرکٹو کونسل کی تشکیل کی گئی، ایک شخص یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا تھی؟ یونیورسٹیوں میں آج کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے، لاکھوں روپیہ کی گورنمنٹ پراپرٹی دیکھتے دیکھتے خاک کا ڈھیر کر دی جاتی ہے۔ اور قتل اور زنا باہمہر تک کے واقعات پیش آتے ہیں لیکن کیا یونیورسٹی ایکٹ وہاں بھی منسوخ ہوتا ہے؟ پھر کیا اسلئے کے ایکٹ کے ماتحت کورٹ کے اور اکرکٹو کونسل کے جو ممبر منتخب کردہ یا نامزد کردہ تھے ان کی مدد سے یا کسی قسم کے ان کے ایما یا اشارہ پر یہ فتنہ برپا ہوا تھا، یا اس فتنہ کا سبب ایکٹ تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس واقعہ کا ایکٹ سے تعلق ہی کیا تھا؟ اس کی توجیہ و تعلیل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یونیورسٹی کا اسلامی کردار جو کچھ بھی تھا اور اس بنا پر یونیورسٹی کو دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں جو امتیاز تھا۔ وزیر تعلیم اس پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، اس لئے انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ ایکٹ کی منسوخی اور آرڈیننس کے نفاذ کا حکم صادر کر دیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انہوں نے بار بار اپنے بیانات میں یہ بھی کہا کہ ”مسلم“ کا لفظ یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے گا۔ مجھ کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کو اس طرح کا اقدام کرنے اور



بڑھ بڑھ کر اس قسم کی بے سرو پا اور لایعنی باتیں کرنے کی جرأت صرف اس لئے ہوئی کہ جانتے تھے کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں پر تقسیم کی وہ مار پڑی ہے کہ خدا دشمن کو نصیب نہ کرے، تو پھر وہ بھی ان پر وار کر کے شاہ مدار کا اعزاز حاصل کیوں نہ کریں چنانچہ اپنے موقف کو مبنی بر انصاف ثابت کرنے کی غرض سے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کی نسبت بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا لیکن جب ان لوگوں نے آنکھیں دکھائیں تو چپ سا دھو کر بیٹھ گئے، اور آخر انجام یہ ہوا کہ وزارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ چھاگلہ صاحب نے جس وقت مسلم یونیورسٹی کے متعلق یہ اقدام کیا ہے اس وقت لال بہادر شاستری جی دہلی میں موجود نہیں تھے جب وہ واپس آئے اور انھیں ان سب چیزوں کا علم ہوا تو انھوں نے چھاگلہ صاحب کے اقدام کے خلاف سخت ناراضگی اور بیزاری کا اظہار فرمایا۔ لیکن ہر گورنمنٹ کو اپنے وقار کا لحاظ ہوتا ہے تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ اس لئے جو آرڈیننس نافذ ہو گیا تھا وہ تضائے برہم ہو کر یونیورسٹی پر مسلط ہو گیا۔

یوپی گورنمنٹ نے یہ کیا کہ یونیورسٹی میں بڑی تعداد میں پولیس متعین کر دی  
گرفتاریاں اور مقدمات | جو فیض گیٹ اور مولانا آزاد لائبریری کے پیچھے ڈیڑھ دو برس فروکش رہی، اور جب دو ماہ تک سینئر سنگ ہوم میں قیام کے بعد جناب والس چاندر صاحب علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی قیام گاہ پر بھی گارڈ مقرر کر دیا۔ علاوہ ازیں طلباء کی یونین کی پوری کیدنٹ گرفتار ہو گئی، ان کے ساتھ شاید کچھ اور لڑکے بھی گرفتار ہوئے جو کافی مدت تک حوالات میں رہے۔ آخر گورنمنٹ نے مقدمات واپس لے لئے اور یہ سب بغیر سزا کے رہا ہو گئے، لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک جو بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جسٹس بشیر احمد سعید صاحب اور مجتبیٰ حسن صاحب جو واقعہ کے پیش آنے کے وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے یہ دونوں حضرات بھی گرفتار ہوئے، مگر ان کی ضمانتیں منظور ہو گئیں اور مقدمات چلنے لگے۔ یہ دونوں حضرات ذاتی طور پر میرے بڑے کرم فرما اور مہربان دوست تھے لیکن اس کے باوجود جب یہ دونوں مقدمہ کی پیشی کے سلسلہ میں علی گڑھ آئے

یالا لائے گئے ہیں تو یہ نظر اس درجہ حسرت آفریں اور رقت انگیز تھا کہ میں نے ہر چند کوشش کی۔ لیکن ان دونوں کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ نے آخر ان پر سے بھی مقدمات اٹھائے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گورنمنٹ نے اپنی خفیہ پولیس کے اُن افسروں کے خلاف کیا کارروائی کی جن کی رپورٹ کی اساس پر ملک کے ان دو معزز اشخاص پر مقدمات قائم کئے گئے اور جن کے باعث ان کو ہر قسم کی ذہنی، روحانی اور جسمانی اذیت اور کرب و اضطراب سے گزرنا پڑا۔ والی اللہ المشتکی

کوئی زخم خواہ کتنا ہی گہرا اور عوارث زمانہ کا ریا ہوا کوئی داغ کیسا ہی اجاگر ہو  
 ڈاکٹر عبدالبعید مرحوم | امتداد روزگار کا یہ کرشمہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ زخم مندمل اور داغ  
 بھی دھندلا ہونے لگتا ہے، لیکن اتنے برس بیت جانے پر بھی میں جس غم کو اب تک نہیں بھلا سکا  
 ہوں وہ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالبعید کا غم ہے جن کی زندگی اس واقعہ کی بھینٹ چڑھ گئی، اور  
 اس کی وجہ سے پورا ایک گھرانہ تباہ ہو گیا،، وصوف کی عمر چالیس پینتالیس برس کے درمیان ہو گی۔ یونیورسٹی  
 میں شعبہ علم الحیوانات (چھوٹا ۵۵ ج) کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور اپنے فن میں بین الاقوامی  
 شہرت کے مالک تھے، جس روز یہ واقعہ پیش آیا ہے اُس سے دو تین ماہ قبل انھوں نے مجھ کو امریکہ کی  
 مشہور ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک خط دکھایا تھا جس میں ان کو دو ہزار ڈالر ماہانہ تنخواہ پر پروفیسر شپ  
 کی پیش کش کی گئی تھی، میں نے اصرار کیا کہ آپ اسے ضرور قبول کر لیجے، لیکن انھوں نے اب تک کوئی  
 فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہنے لگے: سوچوں گا۔ گھر کے دو تین اور خوش حال تھے دودھ پور میں اُن کی  
 نہایت وسیع دعوین اور شاندار کوٹھی ”نور نزل“ کے نام سے تھی اُس میں رہتے تھے، اپنے فن میں  
 غیر معمولی قابلیت اور شہرت کے ساتھ اخلاق و عادات اور کردار کے اعتبار سے بھی پکے اور سچے  
 مسلمان تھے، زیدی صاحب کے زمانہ میں پراکٹر بھی رہے تھے، اپنے علمی و عملی اوصاف و کمالات  
 کے باعث طلباء میں بڑے ہر دلعزیز تھے

اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی پکڑے گئے اور آگرہ جیل میں رکھے گئے، اگرچہ بعد میں یہ بھی



رہا ہو گئے اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ لیکن مرحوم نہایت ذکی الحس (Sensitive) اور  
بہت منفعل طبیعت کے انسان تھے، سینکڑوں انسانوں کی طرح ان کو اس بات کا یقین تھا کہ  
وہ اس معاملہ میں قطعاً بے گناہ اور بے خطا ہی نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر  
نواب صاحب کی حفاظت کی اور ان کی جان بچائی تھی، .....  
.....

لیکن اس واقعہ نے ایک عجیب صورت یہ اختیار کر لی تھی کہ ہر ترقی پسند اور  
سکولرزم کا پرستار آج معصوم و بے گناہ اور ہر پختہ عقیدہ اور عمل کا مسلمان حکومت کی نظر میں  
مجرم! اور اگر مجرم نہیں تو مشتبہ ضرور! اس بنا پر ڈاکٹر عبد البصیر کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ  
صرف بچے مسلمان اور طلباء میں ہی دہر دہر کر رہے ہونے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں:

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

پھر گرفتاری کے وقت اور حالات میں ان کو جو ذہنی اور روحانی سخت تکالیف پہنچیں  
ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ غم ان کے دل میں بیٹھ گیا اور (ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق)  
یہی غم کینسر بن کر آخر انہیں کہا گیا۔ جب معلوم ہوا کہ انہیں کینسر ہے تو رہا کر دیا گیا، لیکن اب  
کیا ہو سکتا تھا۔ تیرکمان سے نکل چکا تھا اور اس کا واپس آنا انہونی بات تھی۔ علاج کے لئے  
وہ بمبئی بار بار گئے، مہینوں پڑے رہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہا۔ سب ہی کچھ ہوا۔ لیکن جو  
اچھا ہو جائے وہ کینسر ہی کیوں ہونے لگا۔ قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا۔ آخری مرتبہ جب بمبئی سے  
آئے اور میں ان سے ملا تو اگرچہ وہ کچھ خوش امید تھے، لیکن میں نے ان کا چہرہ دیکھا اور  
ان کے حالات سننے ہی تاڑ لیا تھا کہ اب وقت قریب ہے۔ چنانچہ میں قاہرہ میں تھا کہ  
وہاں کے اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور جی دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انا للہ  
وانا الیہ راجعون۔

## ادبی روایت سے بغاوت تک

از جناب عنوان چشتی صاحب لکچر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

روایت سے بغاوت تک کا سفر ایک طویل اور مسلسل سفر ہے۔ اس میں درمیانی سنگ میل بھی آتے ہیں۔ روایت فن اور تجربہ کا لفظ آغاز ہے۔ روایت کے بعد انفرادیت کی منزل آتی ہے۔ انفرادیت کے بعد جدت، اور جدت کے بعد بغاوت کا دائرہ عمل شروع ہوتا ہے اس طرح اگرچہ شعری تجربہ کی اساس روایت پر ہے مگر اس کے بغاوت اور اس کے بعد نئی ہیئت کی تعمیر تک کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

’روایت‘ ادبی تنقید میں دو متضاد معانی کی حامل ہے۔ یعنی اس سے تنقیص اور تحسین دونوں کام لئے جاتے ہیں۔ مگر دونوں صورتوں میں اس کو صفت کے طور پر برتا جاتا ہے۔ مثلاً ’روایتی شاعر‘، ’روایتی اسلوب‘ یا ’روایت پرستی‘ کی اصطلاحیں تنقیص کے مفہوم میں مستعمل ہیں۔ اس طرح کے فقرے کہ ’اقبال شاعروں کی عظیم روایتوں کے امین ہیں‘۔ یا فلاں شخص عظیم انسانی روایات کا محافظ ہے۔ تحسین کا مفہوم رکھتے ہیں۔ دراصل لفظ روایت اپنی جگہ تحسین کا مفہوم رکھتا ہے نہ تنقیص کا بلکہ اس کا مفہوم محل استعمال پر منحصر ہے۔ یہ محض ایک مغالطہ ہے کہ روایت کا لفظ محض تنقیص کا مفہوم رکھتا ہے۔

روایت اپنے محدود تصور میں محض رسم پرستی، خارجی تقلید یا بندھے ٹکے اصولوں اور اسالیب کی پیروی کو کہتے ہیں۔ لیکن وسیع مفہوم میں یہ زندگی کے بہت بڑے دائرہ پر محیط



اور اس کی جڑیں ماضی کے اندھیرے میں دوڑنا نہیں گئی ہیں۔ اس میں مذہبی اور غیر مذہبی اعتقاد انسان کے عادات و اطوار، طور طریق، رسم و رواج، ممنوعات ذہنی (Mental) تجربے اور ان کا تواتر، رد عمل کے انداز، غرض انسان کے ایسے تمام فکر و عمل شامل ہیں جنہیں وہ زندہ کرنے کے فن کے لئے بار بار کام میں لاتا ہے۔ اور جو عام انسانوں کا معمول بن جاتے ہیں، روایت کہلاتے ہیں۔ جان لیونگٹن لوینز (John Livington Lowin) نے روایت کے دو اہم عناصر کا ذکر کیا ہے۔ جس کو اس نے قبولیت (Acceptance) اور واہمہ (Hallucination) کا نام دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنیادوں طور پر ہر لفظ ایک آواز ہے۔ مگر ہم ہر آواز کو ایک معنی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ روایت کے لئے یہ قبولیت بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ معنوی طور پر کسی توہم کی قبولیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً ایک ڈرامہ جو کسی شخص کی پوری زندگی پر مشتمل ہے محض تین گھنٹے میں دکھایا جاتا ہے۔ دیکھنے والے تین گھنٹے وقفہ کو اس کی زندگی کا کل وقت اور ڈرامہ کے واقعات کو اس کی زندگی کے کل واقعات سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ قبولیت کا یہ انداز واہمہ کی قبولیت ہے<sup>(۱)</sup>۔ یہ صورت حال ادب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی واقع ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام روایت ہے۔

روایت کا سرچشمہ تہذیب و تمدن ہے۔ اور تہذیب و تمدن سماج سے وابستہ ہے۔ اس لئے روایت پر سماج کی تحریکوں، رجحانوں، عمل اور رد عمل کا گہرا اثر ہوتا ہے اور روایات بھی سماج کے ارتقا اور ابتلا سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی اپنی مخصوص روایات ہوتی ہیں۔ جن پر اس عہد کے مخصوص معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی حالات کا اثر ہوتا ہے۔ روایت قبولیت کی عام سند حاصل کر کے دو راستوں میں سے کوئی ایک اختیار کر لیتی ہے۔ ایک راستہ جمود کا ہے۔ اور دوسرا حرکت کا جو روایتیں زندگی کے دھارے سے الگ ہو جاتی ہیں۔ وہ جامد اور مژرہ ہو جاتی ہیں۔ اور

خشک پتوں کی طرح زندگی کے درخت سے ٹوٹ کر الگ ہو جاتی ہیں۔ بعض روایتیں زندگی کے سرچشمہ سے وابستہ رہتی ہیں۔ ان میں لچک ہوتی ہے۔ ان کی بعض خارجی تفصیلات میں کجی دہشتی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی اصلی اور بنیادی لہر زندہ رہتی ہے۔ اسی طرح مقصد کے اعتبار سے جو روایات زندگی کی بڑھتی پھیلتی حقیقت کا ساتھ دیتی ہیں وہ مثبت اور جو زندگی کے دھارے کی مخالفت کرتی ہیں اور تعمیر سے زیادہ تخریب کرتی ہیں منفی روایات کہلاتی ہیں۔

ادبی روایت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خارجی دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو میں ہئیتیں، صنعتیں، صنفیں، اسالیب، تراکیب، ذریعہ اظہار وغیرہ شامل ہیں۔ داخلی پہلو میں موضوعات، ماضی کا شعور اور تخلیق کے محرکات شامل ہیں۔ روایت کا خارجی پہلو محدود اور داخلی پہلو وسیع ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن

”روایت“ ماضی کا وہ حصہ ہے جو آج بھی شاداب اور توانا شکل میں ہمارے ادبی مزاج میں زندہ ہے۔<sup>۵</sup>

ماضی کا زندہ توانا اور شاداب حصہ داخلی زیادہ اور خارجی کم ہوتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T. S. ELIOT) نے روایت پر بڑی دلکش بحث کی ہے۔ اس کا مضمون ”روایت اور انفرادی صلاحیت“ اُس وقت منظرِ عام پر آیا۔ جب ادبی و شعری تجربات کا طوفان برپا تھا۔ ایلیٹ کا خیال ہے کہ روایت درستی طور پر نہیں ملتی بلکہ اس کو سخت محنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخی شعور کیلئے ادراک اور ماضی کی ماضیت کی موجودگی کا احساس ناگزیر ہے۔

ماضی کی ماضیت کی موجودگی سے ایلیٹ کی مراد ہے کہ ماضی کا سارا ادبی سرمایہ ایک ادبی کل ہے۔ اور وہ ربط و تسلسل کی ایک کھڑی سے منسلک ہے اور زندہ ہے۔ اُس



کی نگاہ میں ماضی سے وابستگی اور آگاہی کی نین صورتیں ہیں۔ الف، ماضی کو پختہ سمجھ کر قبول کرنا۔ ب، ایک ذوقنکاروں کا اتباع کرنا۔ ج، کسی ایک پسندیدہ دور کے سانچے میں خود کو ڈھال کر۔ لیکن وہ ان تینوں راستوں کو بہت زیادہ وقعت نہیں دیتا بلکہ اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ فنکار کو ادب و فن کی مرکزی روح اور بنیادی میلان سے آگاہ ہونا چاہئے۔ اور ادب کی مکمل ذہنی زندگی کو جذب کر لینا چاہئے۔ اس کے نزدیک یہی تاریخی شعور ہے۔ جسے روایت کی آگاہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ایلیٹ نے روایت کے تصور کو ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کی۔ اور وہ بنیاد ماضی کی حیثیت کی موجودگی کا متحرک شعور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کی بنیاد گزرے ہوئے کل نقلی اور آنے والے کل کی بنیاد آج پر ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل میں گہرا اور اٹھ ربط ہے اس ربط اور تسلسل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ماضی کو ایک جامد چیز کی طرح قبول کرنا درست نہیں۔ یہ راستہ غیر شعوری اور غیر تخلیقی ہے۔ بلکہ ماضی کے اٹانے کو ایک زندہ کل کی حیثیت دیکھنا چاہئے۔ روایت میں خوب اور خراب دونوں قسم کے عناصر ملتے ہیں۔ شاعر کو ان دو قسم کے عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھنا چاہئے۔ اور ان عناصر کو قبول کرنا چاہئے جو صحت مند، لچکدار اور مثبت ہوں۔ اور یہ تخلیقی قبولیت اس کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ بقول ایلیٹ

”دو فنکار اس لمحہ میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحہ موجود کہتے ہیں یہ ہی نہیں بلکہ وہ اس کا عرفان بھی رکھتا ہو کہ کون کون سی چیزیں مردہ اور کون کون سی چیزیں زندہ ہیں“<sup>۱۵</sup>

اس گہرے شعور کے بغیر زندہ اور مردہ عناصر میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے روایت کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں ماضی کا شعور، حال کا عرفان اور ان دونوں کی عضوی تسلسل کا احساس شامل ہے۔ روایت ایک ایسی متحرک اور مسلسل

اگرچہ جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک لڑی میں پروتی ہے۔ یہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف چلا جاتا ہے۔ جس طرح ایک بچے کے چہرے کے نقوش میں اُس کے باپ کے خدو خال چھلکتے ہیں۔ اور اس کے کردار اور خصوصیات میں اس کے باپ کے کردار کی جھلک ہوتی ہے۔ اسی طرح حال میں ماضی کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ روایت میں ماضی کی ادبی بصیرت، تاریخی شعور، تخلیقی محرکات سب کچھ شامل ہے۔ ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں حال کے مسائل کو حل کرنے اور مستقبل کی تعمیر کرنے کی کوشش کو روایت کہتے ہیں۔

اس طرح روایت ایک ایسا اصول یا معمول ہے جس سے فن میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کو بعض اہم خصوصیات سے متصف کر کے ترقی دیتی ہے۔ ادبی روایت کے سلسلے میں چند باتیں اور ضروری ہیں۔ ہر فنکار اپنے فنکارانہ سفر کے آغاز میں روایت کا سہارا لیتا ہے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے سلسلے میں بنے بنائے سانسے اور اپنے پیش رو فنکاروں کی تخلیقات کی پیروی کرتا ہے۔ اسکی ابتدائی تخلیقات بڑی حد تک قدیم یا ہم عصر فنکاروں کی صدائے بازگشت ہوتی ہیں۔ اسکے بعد فنکار میں ایک مخصوص اعتماد اور شعور جاگتا ہے جو اسے محض تقلیدی ہونے سے روکتا ہے۔ اسکی تخلیقی صلاحیت زیادہ توانا ہو کر نیا کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی ہے یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب فنکار کی تخلیقات میں انفرادیت کی جھلک آنے لگتی ہے۔ اس طرح ہر فنکار ایک وقت پرانا بھی ہوتا ہے۔ اور نیا بھی۔ فنکار کتنا بھی نیا ہو اور اس کی افکار کتنی بھی مسلم ہو۔ وہ بُت شکن اور باغی ہی کیوں نہ ہو۔ روایت سے سو فیصدی دامن نہیں چھڑا سکتا۔ اس کی تخلیقات میں ماضی یعنی روایت کے زندہ عناصر ضرور شامل ہوتے



ہیں۔

ادبی روایات کے سلسلے میں فنکاروں میں تین روئے پائے جاتے ہیں۔ (الف) روایات کو جوں کا توں اپنلے کا (ب)۔ روایتوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کے منفی اور مثبت عناصر کو الگ الگ کرنے اور مثبت عناصر کو قبول کرنے کا (ج)۔ تمام ادبی روایات سے انحراف کا رویہ۔ پہلا رویہ تقلیدی اور غیر تخلیقی ہے۔ ہر دور میں ایسے روایتی اور روایت پرست شاعروں کی کثیر تعداد رہی ہے۔ ایسے فنکاروں کے یہاں تازگی و توانائی کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کے فن کا انحصار محض مشق و مزاحمت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دوسرا رویہ شعوری ہے۔ مگر نیم تخلیقی ہے۔ روایت کے تجزیے اور اس کے مثبت و منفی عناصر کے رد و قبول کے عمل کے دو ان پرانی روایتوں کا رنگ و روغن بدل جاتا ہے۔ اس عمل سے روایت کے زندہ عناصر کو حال کی آگہی سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرانی روایت میں تبدیلی کے ساتھ توسیع ہو جاتی ہے۔ یہ توسیع داخلی سطح پر زیادہ اور خارجی سطح پر کم ہوتی ہے۔ اس کو توسیع روایت کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا رویہ خالص انقلابی ہے۔ اس میں ادبی روایتوں سے یکسر انحراف اور ان کی شکست و ریخت دونوں شامل ہیں۔ پہلے رویہ کو تقلیدی دوسرے کو تعمیری اور تیسرے کو انقلابی اور تجزیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

روایت اور بغاوت کے درمیان دو سنگ میل اوراں ہیں۔ پہلا انفرادیت اور دوسرا جدت۔ اس لئے بغاوت کے عمل پر گفتگو کرنے سے پیشتر انفرادیت و جدت کے حدود و امکانات کا تعین کر لینا چاہیے۔ شعری تخلیق میں دو قسم کے عناصر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس فن کی تمام قدیم و جدید تخلیقات میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو کسی تخلیق کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انہیں عرف عام میں روایتی عناصر کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ عناصر غیر اہم نظر آتے ہیں۔ مگر یہ عناصر ہر تخلیق میں پس منظر

خاکے اور ربطِ باہمی کا کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عناصر جو ان روایتی عناصر سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور اس تخلیق کا مخصوص، بنیادی اور لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ اور جو اس تخلیق کے مزاج، تاثر، حسن، نازگی اور توانائی کو نیا انداز بخشتے ہیں۔ انہیں منفرد عناصر بھی کہہ سکتے ہیں۔ کسی فنکار کی انفرادیت کا انحصار انہیں عناصر کی بالیدگی، فراوانی اور توانائی پر ہے۔ ہر تخلیق میں دونوں قسم کے عناصر کا امتزاج ہوتا ہے۔ مگر منفرد تخلیق میں انفرادی عناصر کی تعداد، حسن اور تاثر زیادہ ہوتی ہے۔

انفرادیت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر انفرادیت پر بات چیت مکمل نہیں ہو سکتی کہ سٹو فر کا ڈول کے مطابق ہر فنکار بحیثیت فرد اپنے معاشرہ کا ایک حصہ ہوتا ہے اور زمان و مکان کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرم کار رہتا ہے۔ ماحول سے اسکے تعلق کی نوعیت و قسم کی ہوتی ہے۔ انفعالی اور فعال انفعالی نوعیت میں انسان اپنے ماحول کے جبر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اندر تبدیلی کی خواہش مرجاتی ہے یا پیدا ہی نہیں ہوتی۔ فعال نوعیت میں وہ اپنے ماحول سے نبرد آزما ہو کر اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرد اور ماحول یا سماج کی کشمکش میں انسان ماحول کو بدلتا ہے۔ اور خود بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح عمل اور عمل کا سلسلہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اور مسلسل جاری رہتا ہے۔ اسی کشمکش میں فرد کی شخصیت پر وہ چٹھمتی ہے شخصیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اپنے ماحول پر کس قدر مثبت یا منفی طریقہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ہر فنکار کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے خارجی اور داخلی دو پہلو ہوتے ہیں۔ خارجی پہلو میں فنکار کا قد و قامت، چہرہ و ہرہ، رفتار و گفتار، انداز و اسلوب شامل ہے۔ داخلی پہلو میں اس کا طرز فکر و عمل، قوت کار و افکار، اصول و نظریات، داخلی رجحانات نیز دیگر بہت سی خصوصیات شامل ہیں۔ شخصیت محض ظاہری وجاہت کا نام نہیں صرف داخلی خصوصیات



کا نام بھی نہیں۔ بلکہ دونوں کے حسین ترین امتزاج کا نام ہے۔ فنکار کی شخصیت کی بالیدگی اور نویدگی سے فن میں جان پیدا ہوتی ہے۔ فنکار کی شخصیت دوہری ہوتی ہے۔ ایک اسکی فنکارانہ تخلیقی شخصیت دوسرے اسکی غیر فنکارانہ اور غیر تخلیقی شخصیت۔ فنکارانہ شخصیت میں اسکی تخلیقی صلاحیت اور طرز فکر و احساس کو اولین اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت جس درجہ کی ہوتی ہے۔ فنکارانہ شخصیت بھی اسی مرتبہ کی ہوتی ہے۔ فنکارانہ شخصیت کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول کے مادی تجربات کو کتنی واقعیت اور حس کاری سے جمالیاتی تجربہ بناتی اور اسکا فنکارانہ اظہار کر لیتی ہے؛ جو لوگ روایت کے اسیر ہوتے ہیں یا زندگی کے معمولی تجربوں سے غیر معمولی قدروں کے نایاب حسن کو اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا زبان و بیان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ کمزور فنکارانہ شخصیت کے مالک ہیں فنکار اپنی شخصیت کو تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ فن میں تحلیل کر دیتا ہے فن اور شخصیت لازم و ملزوم ہیں۔ کروچے نے اسی مفہوم میں فن کو اظہار ذات کہا تھا جو فنکار اپنی سالم شخصیت کو فن میں سمونے میں جس حد تک کامیاب ہوتا ہے اسی حد تک اس کے فن میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

انسان کی شخصیت واضح طور پر دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک کامل شخصیت دوسری ناقص شخصیت۔ کامل شخصیت اپنے فکر و کار سے دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور نفسیاتی الجھنوں سے بڑی حد تک آزاد ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص شخصیت خود سے نفسیاتی طور پر دست و گریباں رہتی ہے اور کوئی اہم کام کرنے سے قاصر ہوتی ہے کیسٹون کا ڈھول کا خیال درست ہے کہ ہر فنکار زبان و مکاں کے کسی نہ کسی دائرہ میں سرگرم کار رہتا ہے۔ اسکی شخصیت کی تشکیل میں نفسیاتی عناصر کے علاوہ بعض خارجی اسباب و محرکات کی کار فرمائی بھی ہوتی ہے۔ خارجیت کا تجربہ بہت سخت ہوتا ہے اس لئے اکثر افراد اپنے ماحول کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ جو نامساعد حالات سے لڑتے ہیں۔ انہیں ایک طویل تلاش

اور ابتلا سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس آئینہ نش میں فرد کچھ کھوتا اور بہت کچھ پاتا ہے چونکہ انسان زندگی کا سب سے زیادہ باشعور مظہر ہے اس لئے وہ ماحول پر فتح پانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اسکی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ادب تہذیب کی تمام دولتیں شامل ہیں

فرد سماج کا ایک حصہ ہے وہ سماج سے وابستہ بھی ہے اور اس سے علیحدہ بھی۔ علیحدہ اس لئے ہے کہ ہر فرد کی اپنی جداگانہ شخصیت ہوتی ہے۔ فکر و احساس اپنے طریقے اور فکر و عمل کے اپنے پیمانے ہیں۔ وابستہ اس لئے کہ ہر فرد سماج ہی میں رہتا ہے اور جزو کی حیثیت سے کل کی تشکیل کرتا ہے۔ سماج کا ڈھانچہ معاشی نظام سے وابستہ ہے۔ پیداوار اور طریقہ پیداوار کی تبدیلیوں سے سماج کی تبدیلیاں وابستہ ہیں۔ سماج کے ایک انگ کی حیثیت سے فرد بھی تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ فرد کے رجحانات، عقائد اور اعمال اپنی ہوتے ہوئے بھی سماج کے مجموعی عقائد اور اعمال کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کمر سٹوفر کا ڈولنے ٹھیک لگتا کہ ”فن سماج کی اسی طرح پیداوار ہے جس طرح کوئی موتی کسی سیپی کی پیداوار ہے“ ⑤ اسی طرح ہر فنکار کی تخلیق انفرادی کارنامہ ہوتے ہوئے بھی اجتماعی آہنگ کا حصہ بھی ہوتی ہے فنکار کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ انفرادی پہلو وہ پہلو ہے جو اسکوان مخصوص عناصر سے آراستہ کرتا ہے جو دوسروں کے حصہ میں نہیں ہوتے۔ اجتماعی پہلو وہ پہلو ہے جو اس کی شخصیت کو ایسے عناصر سے مزین کرتا ہے جو سب کا مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے طبقاتی کردار کا تعین کرتے ہیں۔ فنکار اپنے فن میں ان دونوں پہلوؤں کی ناسازگی کرتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے ماحول کا مطالعہ و مشاہدہ انفرادی نقطہ نظر سے کرتا ہے۔ اور دوسری طرف ان عقائد اور رجحانات کی روشنی میں دیکھتا ہے جو اس کے طبقاتی شعور کی دین ہوتے ہیں اس طرح جب وہ اپنے فکر و فن کی ترسیل کرتا ہے تو وہ بظاہر خالص ذاتی اور



انفرادی ہوتے ہیں مگر بیاطن اجتماعی اور سماجی افکار و اعمال کا حصہ ہوتے ہیں۔ پیشکش جتنی بھرپور اور مکمل ہوتی ہے شخصیت کی ترسیل بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہے۔

شخصیت کے اظہار کے نقطہ نظر سے ادب میں کئی نظریے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ فنکار محض اپنی داخلی شخصیت کا ادب کے وسیلہ سے اظہار کرتا ہے۔ اسکی پیشکش خالص انفرادی ذاتی بلکہ لاشعوی ہوتی ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ فنکار اپنے محض طبقاتی افکار و عقائد کا مبلغ ہوتا ہے۔ چونکہ زندگی کے کارزار میں فنکار اپنی طبقاتی وابستگی کی وجہ سے فریق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ طبقاتی افکار کی پیشکش سے بیگانہ نہیں ہو سکتا پہلا نظریہ نفسیاتی ہے۔ اس نظریہ میں شاعری کے رشتے لاشعور سے مل جاتے ہیں۔ اور شاعری حتمی طور پر بنیادی جبلتوں کی نفس گاہ، اجتماعی لاشعور کا اظہار یا احساس کمتری کو دور کرنے کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔ دوسرا نظریہ سماجی ہے۔ اس کے تحت شاعری میں روح عصر کی جھلک ہی نہیں بلکہ عصری زندگی کا مجموعی آہنگ ہوتا ہے۔ زندگی کے دوسرے مظاہر کی طرح ادب کی مادی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ اور یہ معاشی رشتوں اور سماجی تبدیلیوں کا آئینہ قرار پاتا ہے۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ مگر دونوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ فن شخصیت کی مجموعی اور موثر آواز ہوتا ہے ایک ایسی آواز جو نفسیاتی عناصر اور خارجی عوامل کے سچے تال میل سے فنکار کی شخصیت کے نہاں قانون سے گذرتی ہے۔

ایلیٹ اظہار ذات یا ترسیل شخصیت کا قائل نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاعری جذبات کے آزادانہ اظہار کا نام نہیں بلکہ جذبات سے گریز کا نام ہے۔ وہ اپنے اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک انسان کے لئے جو تجربا اہمیت رکھتے ہوں یہ ممکن ہے کہ وہ شاعری میں بالکل غیر اہم ہوں۔ یا انہیں میرے سے شاعری میں کوئی جگہ ہی نہ ملے۔ اور شاعری میں جن تجربات کی اہمیت ہو

ممکن ہے کہ عملی زندگی میں ان کا کوئی مقام نہ ہو یا بہت ہی معمولی ہو۔ ایلیٹ، کرویچے کے متضاد خیال کا اظہار کرتا ہے۔ کرویچے کا خیال ہے کہ انسان کا تجربہ شعری تجربہ بن سکتا ہے مگر ایلیٹ شعری تجربات اور مادی تجربات میں فرق کرتا ہے۔ اسلئے وہ فن کے تاثرات اور دیگر تاثرات میں حلقہ فاصل کھینچ دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مادی تجربہ اور شعری تجربہ میں فرق ہوتا ہے۔ مگر ہر شعری تجربہ مادی تجربہ سے ہی جنم لیتا ہے۔ یا اسکی اعلیٰ جمالیاتی شکل ہوتا ہے۔ شاعر شخصیت فرد صبح و شام تک سیکڑوں تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے جو تجربہ شاعر کو جذباتی طور پر مشتعل کر دے وہی جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ مختصراً یہ کہ شاعر کا جذباتی تجربہ ہی جمالیاتی تجربہ ہوتا ہے اور یہی شعری تجربہ ہے۔ ایلیٹ شعری اور غیر شعری تجربوں میں فرق کر کے فنکار کی غیر فنکارانہ اور فنکارانہ شخصیت کا فرق واضح کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جوں جوں فنکار کی معمولی یعنی غیر فنکارانہ شخصیت معدوم ہوتی جاتی ہے ویسے ہی اس کی غیر معمولی یعنی فنکارانہ شخصیت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اس طرح وہ فنکار کی غیر فنکارانہ شخصیت کی نفی کر کے کہتا ہے کہ

”نظم ذاتی جذبات کا اظہار نہیں ہوتی۔ بلکہ فن پارہ میں جو خیال یا جذبہ ہوتا

ہے وہ غیر شخصی ہوتا ہے۔“ ⑤

یہ غیر شخصی جذبات فرد کے جذبات نہیں بلکہ فنکار کے جذبات ہیں۔ جو خالص فنکارانہ اور جمالیاتی انداز کے ہیں۔ ایلیٹ نے واضح طور پر شخصی جذبات اور شعری جذبات میں بھی امتیاز کیا ہے۔ شخصی جذبات سے مراد وہی غیر فنکارانہ شخصیت کے جذبات اور شعری جذبات سے مراد فنکارانہ شخصیت کے جذبات ہیں۔ اس طرح ایلیٹ نے بظاہر شاعری کو جذبات سے گریز کا نام دیا ہے مگر دراصل اس نے رخ بدل کر شعری، جمالیاتی اور فنکارانہ جذبات کے اظہار کو شاعری تسلیم کیا ہے۔ ایلیٹ کا



یہی نقطہ نظر شخصیت کے سلسلے میں ہے۔ وہ فنکار کی خاص فنکارانہ شخصیت کے اظہار کو شاعری تصور کرتا ہے۔

ایلیٹ فن کے جذبات اور شخصی جذبات میں فرق کرتا ہے۔ وہ عام جذبات کو غیر فنی اور مخصوص جذبات کو فنی تصور کرتا ہے۔ فنی جذبات خالص جمالیاتی اور مقطر ہوتے ہیں۔ شخصیت سے گریز کا مفہوم یہ ہے کہ فنکار کو اپنی غیر فنکارانہ شخصیت کو خیر باد کہنا چاہئے اور فنکارانہ شخصیت کی تکمیل پر زور دینا چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب بقول ایلیٹ، فنکار کو اپنی ذات کو ایسی چیز کے سپرد کر دے جو اس کی ذات سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہو۔ اس طرح فنکار اپنی غیر فنکارانہ شخصیت کی مسلسل قربانی سے اپنی شخصیت کو معدوم کر سکتا ہے۔ اور اصل فنکارانہ شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اس طرح نہ وہ صرف یہ کہ قربانی ذات اور اپنی شخصیت کو کسی بالاتر مقصد کے حصول کے لئے سپردگی پر زور دیتا ہے بلکہ شعور کو پروان چڑھانے، تبدیلیوں کا بخیر رہنے اور تمام شاعری کو ایک زندہ وحدت تصور کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ شاعروں کو غم ذات کا لوحہ گر یا خارجی مظاہر کا مصور نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس بالاتر ہو کر زیادہ اہم، گہمگیر اور خالص جذبات کو فن میں جگہ دینی چاہئے۔

شخصیت سے گریز کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ فنکار کی شخصیت کو تجربات اور ان کے اظہار میں مزاحم نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ جو تجربہ جس انداز سے ذہن پر مرسم ہو، اس کو پوری شدت توانائی اور اصلیت کے ساتھ معرض وجود میں آنا چاہئے۔ اس طرح یہ دونوں نظریے یعنی فن میں شخصیت کا اظہار اور شخصیت سے گریز شاعر کی انفرادیت کی تشکیل کیلئے بہت ضروری ہیں۔ اور دونوں کا منطقی نتیجہ ایک ہی ہے۔

فن شخصیت کا اظہار ہو یا شخصیت سے گریز مگر اس میں کلام نہیں کہ شخصیت ہی واسطہ درمیانی ہے۔ اور فن میں کسی طرح اس سے مفر نہیں۔ اس لئے فن میں فنکار کی

شخصیت کے جملہ عناصر شامل ہوتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے اولین لمحے سے اس کے لمحہ آخر تک فن شخصیت کے یہ اسرار نہاں خاتون سے گزرتا ہے۔ اور اس میں شخصیت کا رنگ رس شامل ہوتا رہتا ہے۔ فنکار کا ذہن، وجدان، شعور و لاشعور، تخیل اور دوسری تمام صلاحیتیں فن کی تکمیل میں صرف ہوتی ہیں۔ اس لئے فن میں دو قسم کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ایک خالص شخصی عناصر اور دوسرے آفاقی عناصر۔ شخصی عناصر میں ذاتی خصوصیات اور انفرادی اوصاف شامل ہیں۔ آفاقی عناصر میں روایتوں کی بنیادی لہر، عالمگیر قدیم اجتماعی انداز و اسالیب وغیرہ شامل ہیں۔ فن میں شخصی یا ذاتی عناصر انفرادیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے انفرادیت کو شخصیت کا نقش قرار دینا صحیح ہے۔ یہ نقش جتنا نمایاں ممتاز اور دلکش ہوگا تخلیق اتنی ہی انفرادی ہوگی۔ میر کی خشکی و برنگی، درد کی صوفیانہ آہنگی، غالب کی ندرت و تخیل اور اقبال کے سوچتے جذبے سے انکی انفرادیت کی شناخت ہوتی ہے۔ اگرچہ انفرادیت، مواد اور ہیئت کے حسین ترین امتزاج سے وجود سے آتی ہے مگر اسکی شناخت فن کے مجموعی آہنگ اور اسلوب سے ہوتی ہے۔ بعض نئے شاعر بھی انفرادیت کی تکمیل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔

روایت اور انفرادیت کے بعد حدت پر غور کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر حدت کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ شاعری میں جدید مسائل، موضوعات، رجحانات اور عصری آہنگی کو سمونا۔ دوسرے روایت کی ڈگر سے ہٹ کر نئے اسالیب و انداز کا سہارا لینا۔ مگر حدت میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ پہلا مفہوم حدت کا داخلی پہلو اور دوسرا خارجی پہلو ہے اس لئے ہر ایسی شاعری کو جدید شاعری کہا جاتا ہے جس میں تجربے اور تازگی کی جھلک ملتی ہے۔ اور جس میں روایت سے گریز کا احساس ہوتا ہے۔

بعض لوگ حدت برے حدت کے قائل ہیں۔ ایسی حدت بدعت ہے۔ اگر حدت موضوع و مواد اور اسلوب کی ہم آہنگی سے وجود میں نہیں آتی اور شعری تجربے کے





عناصر سے بہ نیاز اور محروم نہیں ہوتی۔ حدیث روایتی عناصر کو از سر نو منظم کرنے میں غیر روایتی عناصر کو نہ صرف کام میں لاتی ہے بلکہ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کرتی ہے مگر جس طرح انفرادیت میں غیر روایتی عناصر تالوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح حدیث میں غیر روایتی عناصر کی حیثیت تالوی ہوتی ہے۔ مگر دونوں قسم کے عناصر اپنی اپنی حدود میں اہم ہوتے ہیں۔

چونکہ حدیث مانوس اشعار کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل ہے اس لئے یہ عمل کسی نئی چیز کی تخلیق سے کم نہیں ہوتا۔ اختراع میں ایک نئی چیز سامنے آتی ہے اور زندگی کے ایک نئے پہرے کو سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح مانوس اشعار کا مخفی گوشہ بھی زندگی کا ایک نیا پہلو ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث میں اختراع کی ہلکی سی جھلک بھی شامل مانوس اشعار کے مخفی امکانات کا انکشاف دو سطحوں پر ہو سکتا ہے۔ پہلی سطح خارجی سطح ہے۔ جسمیں ہیئت، تکنیک، اسلوب اور شعری زبان شامل ہے۔ اس سطح پر قدیم ساپنچوں اور اظہار کے ذریعوں کے مخفی امکانات کی دریافت ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ کس کس نئے موضوع کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ یہ عمل محض روایتی سطح پر نہیں ہوتا۔ بلکہ حسب ضرورت ہیئت و اسلوب زبان اور تکنیک میں تبدیلیاں بھی کی جاتی ہیں۔ دوسری سطح پر پُرانے موضوعات اور مواد کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں ایسے کون کون سے گوشے ہیں جنکو ابھی تک چھوا نہیں گیا ہے۔ اس طرح حدیث کا عمل فن کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کے مخفی گوشوں اور نئے امکانات کی دریافت کا عمل ہے۔ اور اس دریافت کو نئی صورت گری بخشنے کا فن ہے حدیث محض سرسری تلاش سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے سرگرم جستجو اور ذہنی خلاقیت کی ضرورت ہے۔ کسی نئی چیز کا اختراع جتنا مشکل ہے پرانی چیز کو نئی زندگی عطا کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ اس عمل کے لئے بھی فنی شعور، تخلیقی ذہن اور



فکارانہ چابکدستی کی ضرورت ہے۔ جدت کے عمل کی دو ٹوٹیں ہیں پہلی سطح پر فنکار پرانی چیزوں میں نئے گوشوں کی تلاش کرتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ہم جُوی سی ہوتی ہے۔ اور دوسری سطح پر وہ اپنی دریافت کو استعمال کرتا ہے۔ اور اُس کی حیثیت ایک صنّاع کی سی ہوتی ہے۔ اس نئے جدت میں جستجو اور صنّاعی کی خصوصیات ہوتی ہیں جستجو کا حاصل استعجاب عطا کرتا ہے۔ اور صنّاعی کا حاصل سرخوشی۔ چنانچہ جدت استعجاب اور خوشی دونوں چیزیں عطا کرتی ہے۔

اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ جدت روایت کے بطن سے نمودار ہوتی ہے مگر روایت پرستی سے انحراف کرتی ہے۔ یہ انحراف فن کی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ ایک طرف اس میں نئے موضوعات اور اسالیب شامل ہیں دوسری طرف پرانے موضوعات اور اسالیب کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کے مخفی امکانات کی دریافت اور ان کی از سر نو تنظیم شامل ہے۔ جو قاری کو استعجاب اور سرخوشی عطا کرتی ہے۔

گرمزہ سطور میں روایت سے انفرادیت اور جدت کے تعلق کی نوعیت پر غور کیا گیا ہے اب روایت اور بغاوت کے رشتہ پر گفتگو کر لینی چاہئے۔ جب مردہ روایت اپنے غیر مفید وجود کے لئے مضر ہوتی ہے۔ یا تخلیقی عمل کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یا اپنی فطری لچک کھو کر جامد ہو جاتی ہے۔ یا فن اور زندگی کے سرچشمہ سے جدا ہو کر تجربوں کے اظہار کی صلاحیت کھویتی ہے۔ یا نئے تجربوں کی تجسیم کرنے میں ناکام رہتی ہے تو ادبی روایت سے بغاوت کا عمل ناگزیر بن جاتا ہے۔ جو روایت بغاوت کی زد پر آتی ہے اس پر بغاوت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ جو روایتیں زندگی کے سرچشمہ سے وابستہ ہوتی ہیں وہ بغاوت کی زد پر لچک جاتی ہیں اور ٹوٹتے سے بچ جاتی ہیں۔ جو روایتیں فن اور زندگی سے علیحدہ ہو جاتی ہیں وہ بغاوت کی زد پر لوٹ جاتی ہیں۔ ادبی بغاوت کی نوعیت یہی ہے۔ ادبی بغاوت پرانی ہیئتوں، اسالیب، تکنیک اور زبان کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور ان کی شکست و ریخت کرتی ہے۔ کسی پختہ ہوئے ہم کی طرح بغاوت کی لاتعداد سمتیں ہوتی ہیں۔ بغاوت کا اثر موضوع و مواد سے لے کر ہیئت و اسلوب تک ہر پہلو پر ہوتا ہے۔ روایت

”مذاق عصر“ کا احترام کرتی ہے مگر بغاوت ”مذاق عصر“ کی پابند نہیں ہوتی۔ روایت ماضی کی پرستش کرتی ہے اور حال میں ماضی کو جوں کا توں باقی رکھنے پر اصرار کرتی ہے بغاوت ماضی سے بے زار اور حال سے نا آسودہ ہوتی ہے۔ اس لئے بغاوت میں روایت کی شکست کا عمل لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ ادبی بغاوت کی زد پر روایت کے زندہ عناصر باقی رہ جاتے ہیں اور مژدہ عناصر تباہ ہو جاتے ہیں۔ بغاوت کی افادیت اور عظمت کو وہ اسباب اور محرکات متعین کرتے ہیں جنہوں نے اس کو جنم دیا ہے۔ اس لئے ہر ادبی و شعری بغاوت یکساں اہمیت اور اثرات کی حامل نہیں ہوتی۔ وہ بغاوت جو فیشن اور فارمولے کے تحت انفرادی طور پر کی جاتی ہے۔ وہ ”کارہیکاراں“ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جیسا کہ آج کل بعض جدیدیت پسند شعرا کر رہے ہیں مگر عصری تقاضوں کے تحت وجود میں آنے والی بغاوت دیررس اور دیرپا ہوتی ہے۔

ادبی بغاوت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تخریبی اور دوسرا تعمیری۔ انہیں منفی اور مثبت پہلو بھی کہہ سکتے ہیں۔ تخریبی اور منفی پہلو سے مراد شکست و ریخت کا عمل جس میں بغاوت اپنے سامنے آنے والی چیز کو توڑ دیتی ہے۔ تعمیری اور مثبت سے مراد ایک نئی اور بہتر شے کی ساخت اور پرداخت ہے۔ اگرچہ بغاوت میں تخریبی عمل شدید اور ہمہ گیر ہوتا ہے مگر تعمیری عمل بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور جاری رہتا ہے۔ یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تخریبی لہر پہلے رواں ہوتی ہے اور تعمیری لہر اس کے پیچھے چلتی ہے۔ بغاوت انہیں دونوں لہروں کے عمل اور رد عمل سے مرکب ہے۔ اس طرح بغاوت کی تخریبی لہر کو شکست و ریخت کا عمل اور اس کی تعمیری لہر کو قدیم اسالیب و روایتوں کی تبدیلی اور نئی ہیئتوں کی بازیافت کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ محض تخریبی عمل بے معنی ہے۔

ادب اور زندگی میں نئے پن اور پرانے پن کا تصور اضافی ہے۔ جو چیز آج پرانی ہے وہی کل نئی تھی جو چیز آج نئی ہے کل پرانی ہو جائے گی۔ قدامت اور جدیدیت کا ایک تصور یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو آج موجود ہے نئی ہے۔ مگر یہ تصور غیر منطقی ہے۔ کسی



چیز کا محض موجود ہونا اس کے نئے پن کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو آج موجود ہے خواہ نئی ہو یا پرانی۔ اور نئے دور کے مزاج سے ہم آہنگ ہے نئی ہے۔ بغاوت سے پہلی قسم کی چیزوں کی شکست و ریخت ہوتی ہے اور یہ دوسرے انداز کی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں اس لئے نئی چیز وہی ہے جو عصری آگہی، نئی حسیت اور نئے شعور سے متصف ہو اور نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتی ہو۔ مگر ہر نئی چیز کچھ مدت کے بعد پرانی ہو جاتی ہے اور ہر پرانی چیز بغاوت کے عمل سے از سر نو نئی ہو جاتی ہے۔ اس لئے بغاوت کا کام چیزوں کی شکست و ریخت ہی نہیں بلکہ ان کی قلب ماہیت کرنا اور پرانی چیزوں کو نئی زندگی عطا کرنا ہے۔ جو جدید شعاع فیشن اور فارمولوں کے تحت محض پرانی روایتوں، سالیب اور سہیتوں سے انحراف اور انکار کرتے ہیں وہ باغی نہیں ایڈونچر سٹ ہیں اور ادبی بغاوت کے مفہوم سے نا بلند ہیں۔ بے معنی اور بے سنگم الفاظ کے ڈھیروں کو تخلیق کا درجہ نہیں مل سکتا۔

ادبی بغاوت کی اہمیت کا اندازہ اس کے مقصد کی بلندی سے ہوتا ہے۔ یہ مقصد اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور ادنیٰ بھی۔ اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ بغاوت میں تخریب کے ساتھ تعمیر کا پہلو بھی ہو۔ ادنیٰ یہ ہے کہ اس کا مقصد محض تخریب ہو۔ اس کے علاوہ ادبی بغاوت کا اندازہ اس کے نتائج اور اثرات سے بھی ہوتا ہے۔ جو ادبی بغاوت وقتی اور ہنگامی ہوتی ہے اس کا دائرہ اثر محدود اور کمزور ہوتا ہے۔ جو ادبی بغاوت دور اور ہمہ گیر ہوتی ہے اس کا دائرہ اثر دیر پا اور وسیع ہوتا ہے انفرادی بغاوت بھی محدود ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اجتماعی بغاوت بے کراں ہوتی ہے جو اپنے دور کے مخصوص حالات سے جنم لیتی ہے اس لئے روایت اور بغاوت میں فرق ہے جس کو تنقیدی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔

بغاوت کی فطرت میں انتشار کی خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ محض یک طرفہ عمل



ہیں۔ بلکہ عملِ ردِ عمل اور ردِ عمل پر ردِ عمل کا ایک مسلسل عمل ہے۔ بغاوت کی ایک اور دوسری تختہ بازی  
 لہروں کو جنم دیتی ہے۔ اور وہ تختہ بازی لہریں دوسری تختہ بازی لہروں کو جنم دیتی ہیں۔ بغاوت کا عمل فن  
 کی دو سطحوں پر رونما ہوتا ہے۔ خارجی سطح اور داخلی سطح پر یہ عمل ایک مرکز سے چاروں طرف کو پھیلتا  
 ہے اور پھر چاروں طرف سے مرکز کی طرف کو پھیلتا ہے۔ اس لئے بغاوت کے عمل میں انتشار  
 کی کیفیت گرداب کی سی ہوتی ہے۔ اس میں شدت، طاقت، جذباتیت اور گھٹن گرز ہوتی ہے  
 بغاوت انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی۔ کسی دور میں ایک یا چند فنکار بہ زعم خود بغاوت  
 کرتے اور ادبی روایات کے بتوں کو توڑتے ہیں۔ بعض دور بغاوت کے لئے سازگار ہوتا ہے۔ اس  
 طرح انفرادی بغاوت کسی فنکار کی وہ انفرادی کوشش ہے جو وہ روایتوں کی شکست و ریخت  
 کے ذریعہ مواد و ہیئت کو اپنے فکر و فن کے تابع کرنے کے لئے کرتا ہے۔ اجتماعی بغاوت کسی دور  
 کے باشعور فنکاروں کا ایسا فطری ردِ عمل ہے جو فن کو اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ  
 کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جدید فنکاروں کی باغیانہ کوششیں دو طرح کی ہیں۔ پہلی محض فیشن  
 اور فارمولے کے تحت دوسری چند باشعور شاعروں کی انفرادی کوششیں جو ان کے شعری  
 تجربوں کے لئے غیر ضروری تھیں۔ اگر ضروری تھیں تو اس کے لئے معقول وجہ جواز چاہئے اسلئے  
 نئے چہروں کو غور سے دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ بہتوں نے اپنے دھڑلے نقلی چہرے لگا رکھے ہیں۔  
 مختصراً اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ فن کی بنیاد روایت پر ہوتی ہے۔ کوئی فنکار خواہ  
 کتنا ہی جدید اور منفرد ہونے کا دعویٰ کرتا ہو روایت سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ فن میں  
 اجتماعی اور انفرادی عناصر ہوتے ہیں۔ انفرادی عناصر شخصیت کی دین ہوتے ہیں۔ انہیں  
 غیر روایتی یعنی انفرادی عناصر کی فراوانی اور نئی تہذیب و ترتیب سے انفرادیت پیدا  
 ہوتی ہے۔ جو اگرچہ مواد و ہیئت دونوں سے عمل کرتی ہے۔ مگر اس کا واضح اظہار  
 اسلوب کی صورت میں ہوتا ہے۔ روایت میں زندہ اور مردہ عناصر ہوتے ہیں۔ زندہ  
 عناصر کی نئی ترتیب، پرانی چیزوں میں نئے پہلوؤں کی تلاش اور ان کے مخفی امکانات



کی بازیافت کے عمل کو جدت کہتے ہیں۔ انفرادیت اور جدت کے عمل سے گذر کر ادبی بغاوت کا دائرہ کار ہے۔ مردہ روایتوں کے جبر کے خلاف بغاوت کا عمل ناگزیر ہوتا ہے۔ بغاوت میں پہلی ہر تحریری ہوتی ہے جو آگے آگے چلتی ہے۔ اس کے پیچھے دوسری تعمیری ہر آتی ہے۔ اس لئے ادبی بغاوت کا پہلا کام روایتوں کی توسیع و تبدیلی نیز شکست و ریخت ہے۔ اس کے بعد نئی روایتوں کی طرح ڈالنا ہے۔ جو لوگ تاریخی تسلسل اور زندگی اور فن کے رشتہ کو پس پشت ڈال کر وغم خود انفرادیت۔ جدت اور بغاوت کے علمبردار بنتے ہیں۔ انہیں اپنے فکر و فن پر از سر نو غور کرنا چاہئے۔ اور فن اور غرن فن کے امتیاز کو سمجھنا چاہئے۔

### حوالے

1. JOHN LIVINGSTON LOWES: CONVENTION AND REVOLT.

IN POETRY, (1930) LONDON, P. 2

۲۔ ڈاکٹر محمد حسن: ادبی تنقید (۱۹۵۴) ادارہ فروغِ اردو۔ لکھنؤ۔ ص ۲۷۰

۳۔ T.S. ELIOT: SELECTED PROSE, (1958),

PENGUIN BOOKS, P

۴۔ CHRISTOPHER CAUD WELL: ILLUSION &

REALITY (1947) BOMBAY, P. 10

۵۔ T.S. ELIOT: SELECTED PROSE, (1958),

PENGUIN BOOKS, P

